Behtarien Aadab

۶۵۰

۱۹۶۰ کا

بہترین ادب

مُرتبہ

سردار جعفری
پرکاش پنڈت

مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

پہلی بار اپریل ۱۹۵۰ء

قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

(نعمانی پریس دہلی)

ہندوستان کی تحریکِ امن کے نام ———

ترتیب

مقالے

نظمیں

غزلیں، رباعیّاں

افسانے، خاکے

پیش لفظ

سال کے بہترین ادب کے انتخاب کا سلسلہ اردو میں کئی سال سے جاری ہے۔ پہلے بہترین نظموں کا انتخاب شروع ہوا پھر بہترین ادب کے نام سے افسانوں اور مضامین کا انتخاب بھی اُن میں شامل کیا جانے لگا۔ اب ہر سال اس قسم کے دو انتخابات شائع ہوتے ہیں۔ ایک لاہور سے ایک دہلی سے۔ اس انتخاب کی اہمیت یہ ہے کہ سال بھر کا بہترین ادب ایک جگہ جمع ہو جاتا ہے اور سال بھر کے ادب کی رفتار اور ترقی کا جائزہ لینے میں آسانی ہوتی ہے۔ (حلقۂ ارباب ذوق کے گذشتہ انتخاب سے تنزل کی رفتار کا جائزہ بھی لیا جا سکتا تھا)۔

لیکن انتخاب کا کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے اس مشکل کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ کوئی انتخاب بے عیب نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ دعویٰ کرنا تو مشکل ہے کہ پیشِ نظر انتخاب میں اب کسی اور چیز کی گنجائش نہیں ہے یا جتنی چیزیں منتخب کی گئی ہیں وہ سب

کی سب واقعی بہترین ہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ مجموعہ بڑی حد تک سال کے بہترین ادب کی نمائندگی کرسکتا ہے۔ اور آپ کو صحیح اندازہ کرنے میں غلطی نہ ہوگی۔

انتخاب کرنے والوں کا معیار محض حُسن ادا اور طرزِ بیان نہیں ہے چونکہ ترقی پسند ادب زندگی اور عوام کی سچی ترجمانی کا دعویدار ہے اس لئے ہم نے موضوع کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ ادیبوں کی چیزیں شامل کی جاسکیں تاکہ یہ مجموعہ نمائندہ حیثیت اختیار کرلے۔

اس وقت ترقی پسند ادب کے سامنے دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ماضی کے ادب عالیہ کی طرف ہمارا کیا رویہ ہے اور دوسرے یہ کہ ادب میں صورت گری کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ یہ دونوں مسائل تنقید کے حصے میں آ گئے ہیں اور اسی کے ساتھ ایک ایسا مقالہ بھی شامل کرلیا گیا ہے جو ترقی پسند ادب کے سیاسی حدود کا تعین کرنے میں مدد دے گا۔ ممتاز حسین اور احتشام حسین کے مضامین خاص طور سے اہم ہیں۔ اس حصے میں ہنسراج رہبر کی کتاب "پریم چند" کا بھی ایک اقتباس شامل ہے۔ اسے تنقید تو نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس میں ہنسراج رہبر نے پریم چند کی تحریروں سے ان کی انسانی اور ادبی شخصیت کو بڑے خوبصورت انداز سے ابھارا ہے اور اس کی یہ اہمیت کبھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ یہ اردو زبان میں اردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار کی پہلی سوانح حیات ہے۔

مضامین اور نظموں کے بارے میں الگ الگ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ اس مجموعے کو پڑھ کر بڑی شدت کے ساتھ یہ محسوس کریں گے کہ اس سال میں اردو ادب نے ترقی کی ایک اور منزل طے کی ہے۔ اور وہ نقاد اس مجموعے کو پڑھ کر مایوس ہوں گے جو ترقی پسند ادب کے انحطاط یا موت کا اعلان کرچکے ہیں اور کچھ نہیں تو تنہا کرشن چندر کی کہانی اس پر شاہد ہے کہ اردو کا ترقی پسند ادب عظمت کی سرحدوں میں داخل ہوچکا ہے اور انقلابی ادب کی صبح صادق طلوع ہو رہی ہے۔

جس کے اُجالے میں کئی ادیبوں کی تاریک اندیشی بے نقاب ہوگئی ہے جن کی چیزیں اس مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔ (مثلاً منٹو) دوسری چیز آپ یہ محسوس کریں گے کہ اس ادب میں بڑا تنوع ہے۔ زندگی کے مختلف پہلو اور مختلف زاویے ہیں۔ جو الگ الگ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ اور موجودہ ہندوستان اور بین الاقوامی صورت حالات کی ایک واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے جو لوگ ترقی پسند ادب پر خالی خولی نعرے بازی کا الزام لگاتے ہیں انھیں بھی بڑی مایوسی ہوگی۔

لیکن اس کے ساتھ ایک کمزوری کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادیب عوام سے قریب تو آ گئے ہیں لیکن ان کے ساتھ مل کر ابھی ایک نہیں ہوئے ہیں۔ زندگی کو انھوں نے پکڑ تو لیا ہے لیکن گرفت ابھی مضبوط نہیں ہے۔ اس کمزوری کا اندازہ گیتوں کی کمی اور ڈرامے اور ناول کے فقدان سے ہوتا ہے (مہندر ناتھ اور عصمت چغتائی نے اس زمانے میں جو ناول لکھے ہیں وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئے ہیں) کہانیوں اور نظموں میں بھی کسان اور مزدور کی زندگی اور جذبات کی تصویر کشی اور ترجمانی اس طرح نہیں ہوئی ہے جس طرح ہونی چاہیئے۔ ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ پریم چند کے ہوری کے بعد ابھی تک کوئی اور ہوری اردو ادب نے پیدا نہیں کیا ہے۔ اور وہ ہوری بھی ابھی تخلیق نہیں کیا گیا۔ جو کھیتوں سے نکل کر کارخانوں میں پہنچ گیا ہے۔ اردو ادب نے پچھلے پندرہ سالوں میں بہت ترقی کی ہے لیکن اس کی ترقی کی رفتار کو ابھی اور تیز ہونا ہے۔ اس ادب میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن اسے ابھی اور وسیع ہونا ہے اس فرض سے سبکدوش ہونے کے لئے ادیبوں کو اپنے زندگی کے مطالعے میں ابھی اور وسعت پیدا کرنی پڑے گی۔ ان کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ ملک میں بسنے والے بیشتر انسان کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں۔

گورکی نے لکھا ہے کہ ایک دوکاندار کے کردار کی تخلیق کرنے کے لئے سو دکانداروں کی زندگی کا علم ضروری ہے تاکہ جو کردار تخلیق کیا جائے وہ اپنی انفرادیت کے باوجود ایک ایسا ٹائپ ہو جو تمام دوکانداروں کی ترجمانی کر سکے۔ شاعری میں ہمیں خاص طور سے یہ کوشش کرنا ہے کہ اردو کی کلاسیکی روایات کے حُسن اور متانت کو برقرار رکھتے ہوئے کس طرح ایسی نظم کہی جائے جس میں تازگی اور جوش بھی ہو اور وہ عام فہم بھی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آج کے مسائل ادیبوں سے ایک نئی حقیقت نگاری کا مطالبہ کر رہے ہیں ؂

ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

مقالے

احتشام حسین
سلامت اللہ
محمد حسن
ممتاز حسین
ھنس راج رہبر

سید احتشام حسین

غالبؔ کا تفکر اور اُس کا پس منظر

تیز رفتاری سے بدلتے ہوئے سماجی تصورات اور نئے سانچوں میں ڈھلتے ہوئے ذوق ادب کی دُنیا میں سو سال پیچھے کے تبسّم اور ترنم، آہ اور آنسو، خواب اور خیال کی اہمیت محض تاریخی ہوتی ہے یا اُن میں ایسے عناصر کی جستجو بھی کی جاسکتی ہے جنھیں انسانی شعور کے مجموعی سرمایہ میں ایک بیش بہا ورثہ کی حیثیت سے جگہ دی جاسکے؟ یہ سوال محض ادبی تنقید کے نقطۂ منظر سے قابلِ غور نہیں بلکہ اس کے جواب پر ہمارے نظریہ تاریخ کی غلطی اور صحت کا دار مدار بھی ہے ماضی سے حال اور مستقبل کا کیا تعلق ہے، تغیر پذیر سماج میں روایات کی جگہ کہاں ہے اور قدیم ادب کے وہ کون سے عناصر ہیں جن کا تحفظ تہذیبی زندگی کو برقرار اور زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے؟ یہ سوالات اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ عملی زندگی میں ہمیں برابر قدیم کے بعض اجزاء مٹتے اور بعض تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں بھی زوال کا مقابلہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں — غالبؔ کی شاعری اس کی ایک اچھی مثال پیش کرتی ہے۔ پھر فلسفۂ ادب کے لحاظ سے سوال یہی نہیں ہے کہ غالبؔ آج ہمیں کیوں متاثر کرتے ہیں بلکہ اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ہے کہ کل کے اشتراکی سماج میں غالبؔ کی کیا جگہ ہوگی۔ تخیل پرست اشتراکی تو سارے قدیم سرمایہ میں آگ لگانے کی آواز بلند کرتے ہیں۔ لیکن اشتراکیوں کے اشتراکی مارکس اور لینن نے ماضی کے تہذیبی

سرمایہ کی افادیت جتلا کر اور اپنی پُرشور اور باعمل انقلابی زندگی میں اس سے دلچسپی لے کر یہ واضح کر دیا کہ انقلاب کے کسی دَور میں وہ ادبی کارنامہ جو قومی ذہن اور انسانی نفس کی ترجمانی کرتا ہے، کبھی بیکار نہیں ہوسکتا۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ قدیم محض قدیم ہونے کی وجہ سے بقا کا مستحق قرار پائے گا۔ بلکہ سماجی اور طبقاتی تاریخ پر روشنی ڈالنے اور ہر دَور میں انسان کی آزادی اور ترقی کی خواہش کو نمایاں کرنے کی جد وجہد کا آئینہ ہونے کے سبب سے ہی ادب تہذیبی ارتقار کا جزو بننے کا حق حاصل کرسکتا ہے۔ جو ادب اپنے دَور کی مرکزی کش مکش کا عکس پیش نہیں کرتا وہ نہ تو تاریخی اہمیت رکھتا ہے اور نہ ادبی۔ اسی کسوٹی پر پورا اُترنے کے بعد ماضی حال کے لئے سبق آموز اور مستقبل کے لئے قیمتی سرمایہ بنتا ہے۔

غالبؔ کے مطالعہ کے سلسلہ میں چند نظریاتی مباحث پر غور کرنا نہ صرف مفید ہوگا بلکہ ضروری بھی ہے کیونکہ غالبؔ انیسویں صدی کے اس ہندوستان میں پیدا ہوئے جو مخصوص روایات کا حامل تھا، خاص طرح کا طبقاتی نظام رکھتا تھا۔ تاریخ، مذہب اور فلسفہ میں پوری طرح اس زندگی کی جھلک نہ تھی جو اس وقت کے معاشی اور معاشرتی انحطاط نے پیدا کیا تھا بلکہ کچھ عقیدے روایت بن کر طرزِ فکر پر اثرانداز ہوتے رہتے تھے۔ یہ عقیدے اس زوال اور انحطاط کے زمانے میں پیدا نہیں ہوئے تھے جو غالبؔ کا تھا بلکہ دوسرے تاریخی حالات اور مختلف نظامِ معاشرت نے انھیں جنم دیا تھا، صدیوں نے اُن میں طرح طرح کے خیالات و افکار کی آمیزش کی تھی، مختلف مذہبی اور فلسفیانہ تصورات ایک دوسرے میں پیوست ہوتے تھے۔ ردّ وقبول کی بہت سی منزلیں آئی تھیں اور کوئی ایسا نظریۂ حیات اس وقت موجود نہیں تھا جو کسی ایک مذہب، طبقہ، گروہ یا مکتبِ خیال سے وابستہ کیا جاسکے۔ ان حالات میں ایک روایت پرست شاعر یا ادیب کے لئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ کسی مخصوص عقیدے کا سہارا لے کر اپنا رشتہ اس سے جوڑے اور بدلتی ہوئی زندگی سے پیدا ہونے والے سوالات سے مُنھ موڑ کر گزر جائے لیکن غالبؔ کے سے شاعر کے لئے یہ خیال درست نہ ہوگا۔ ان کے شعور کا مطالعہ اس

وجہ سے پیچیدگی پیدا کرتا ہے اور آسانی سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ وہ جاگیردار یا فوجی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور مسلمان تھے اس لئے ان کے افکار و خیالات وہی ہونگے جو اس گروہ اور مذہب سے تعلق رکھنے والوں کے ہوا کرتے ہیں۔ تنقید اور تجزیہ کا یہ میکانکی طریقہ صحیح نتائج تک رہنمائی نہیں کر سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ شاعر اور فن کار کا طبقاتی رجحان اس کے فلسفۂ حیات کا بہت کچھ پتہ دیتا ہے لیکن محض یہ دیکھنا کہ شاعر کس طبقہ میں پیدا ہوا یا سماج کے کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے کافی نہیں بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے زندگی کی کش مکش کے سمجھنے میں اپنے ذہن اور شعور کی توسیع کس طرح کی اور عصری مسائل کے سمجھنے کے سلسلہ میں اس کا کیا رویہ رہا۔ محض کسی طبقہ میں پیدا ہونا ایک شخص کو اس طبقہ کا نہیں بناتا بلکہ اس طبقہ کے مفاد کی ترجمانی کرتے رہنا اس کی بقا کی جد و جہد میں حصہ لیتے رہنا، طبقاتی شعور کی سطح کو متعین کرتا ہے۔ لینن نے کہا ہے کہ طبقاتی شعور جبلی یا پیدائشی نہیں ہوتا بلکہ حاصل کیا جاتا ہے۔ شعور کے بدلتے رہنے کا یہی عمل ہے جس سے بعض اوقات ایک فن کار کے شعور کے متعلق قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا، تاہم یہ ممکن ہے کہ اس بدلتے ہوئے شعور کا تاریخی اور مادی تجزیہ کیا جائے اور تصورات کے متضاد پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

تاریخ کی مادی تعبیر اور جدلیاتی نظریہ تو سماج کو طبقات میں بٹا ہوا تسلیم کرتا ہی ہے آج بہت سے دوسرے عقاید رکھنے والے بھی تاریخ کے بننے بگڑنے میں طبقاتی جد و جہد کا ہاتھ دیکھتے ہیں۔ اسی سبب سے غالب کے عہد کی تاریخ پر اس نظر سے غور کرنا غلط نہ ہوگا کہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں بھی طبقات تھے اور شاعر یا تو ایک طبقے سے تعلق رکھ سکتا تھا یا دوسرے طبقے سے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طبقات کے باوجود یہ لازمی نہیں ہے کہ ہر شخص یا ہر شاعر طبقاتی شعور بھی رکھتا ہو۔ جب تک کوئی شخص اپنے دشمن، مخالف یا مقابل طبقے سے واقف نہ ہو اس وقت تک اس میں

طبقاتی شعور پیدا نہیں ہوسکتا اور یہ واقفیت محض غیر شعوری نہیں ہوسکتی، اس کے لئے فلسفۂ تاریخ کے جاننے اور عملاً اس جد وجہد میں حصہ لینے کی ضرورت ہے جو طبقات کے درمیان کسی سماج میں جاری ہے، جب تک طبقات واضح طور پر ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوں ایک شاعر کے طبقاتی شعور یا اس کی جانبداری کے متعلق قطعی رائے قائم کرنا یا چند سطحی اور ظاہری خیالات کی بنیاد پر نتیجہ نکالنا سہل پسندی قرار پائے گا۔ ایسے عبوری دَور میں جب طبقاتی جد وجہد واضح نہ ہو طبقات اور زیادہ ایک دوسرے سے گھل مل جاتے ہیں اور شعراء ایسے معتقدات کو بنیاد بنا کر عام انسانوں کے متعلق باتیں کرنے لگتے ہیں جن کی طبقاتی نوعیت کا پتہ نہیں چلتا۔

انیسویں صدی میں ہندوستان تاریخ کی ایک بڑی پیچیدہ راہ سے گذر رہا تھا۔ جاگیردارانہ نظام کمزور ہوکر مر رہا تھا اور مر نہیں چکا تھا۔ دیہی معیشت اور صنعت کا زوال ہوچکا تھا، اس کی جگہ کسی دوسری نظام نے پوری طرح نہیں لی تھی، بنگال اور مدراس وغیرہ میں نئے زرعی نظام کے تجربے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی سرمایہ دارانہ نظام میں ہو رہے تھے۔ لیکن عام طور پر ان کے دور رس معاشی اثرات اور مظاہر حیات پر اس کے اثر سے لوگ بے خبر تھے، سرمایہ داری نہ برکت بنی تھی نہ لعنت، بلکہ وہ ابھی سرمایہ داری بھی نہیں بنی تھی۔ عوامی تحریکات نیم معاشی نیم مذہبی نوعیت اختیار کرکے اُٹھتی اور بیٹھ جاتی تھیں لیکن دلی تک ان کی ہوا نہیں پہنچی تھی۔ جاگیرداری کے مٹتے ہوئے کھنڈر پر نہ تو کوئی واضح سرمایہ دارانہ عمارت قائم ہو رہی تھی، نہ کوئی عوامی ہراول دستہ تھا جو راہ دکھاتا۔ مختصر یہ کہ جاگیردار طبقہ زوال آمادہ تھا، سرمایہ داری نے واضح صورت اختیار نہیں کی تھی اور عوام کسی قسم کا انقلابی شعور نہیں رکھتے تھے۔ دلی اور اس کے گرد و پیش کا علاقہ براہِ راست جاگیردارانہ نظامِ حیات کے خشک لیکن زہریلے درخت کے سایہ میں زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ ایسی حالت میں انفعالی جذبات کی پیدائش تو سمجھ میں آتی ہے لیکن کسی ایسے ذہن کی نشو و نما واضح

شکل میں نہیں دیکھی جا سکتی جو اس وقت کے ترقی پذیر سرمایہ دار یا عوام کے عملی شعور کی نمائندگی کرے ایسی حالت میں غالبؔ کے سے انفرادیت پسند شاعر کے شعور کی بنیادوں کو تلاش کرنا اور بھی دشوار بن جاتا ہے جو باتیں غالبؔ کے مطالعہ کے لئے مفید ہو سکتی ہیں ان میں سب سے اہم اس دور کی تاریخی کش مکش، روایت اور اس سے انحراف کا مطالعہ ہے اس مرکزی مسئلہ کی جستجو بھی مفید ہوگی جو ذہن و شعور پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ امراء کیا تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔ اور دوسرے طبقات سے ان کا کیا تعلق تھا۔ کوئی نیا طبقہ بن رہا تھا یا نہیں اگر بن رہا تھا تو اس کی کیا کیا خصوصیات تھیں، کوئی شاعر یا فن کار اس میں اپنی خواہشوں اور امنگوں کی جھلک دیکھ سکتا تھا یا نہیں یہ بات کچھ تو اس طبقہ کی واضح اور متعین حیثیت نمایاں ہونے پر مبنی ہوگی اور کچھ شاعر کے سماجی اور طبقاتی شعور پر۔ نیم شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہونا بھی ممکن ہے لیکن اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

حالات کی اس پیچیدگی سے گھبرا کر اکثر نقاد محض نفسیات کی روشنی میں غالبؔ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نفسیات خود خارجی عوامل کا نتیجہ ہے اور زبردست سے زبردست انفرادیت بھی مثبت یا منفی شکل میں ایک سماجی بنیاد رکھتی ہے۔ نفسیاتی کیفیت خارجی حالات سے باہر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتی، اس لئے محمد اکرام (مصنف آثارِ غالبؔ) کا غالبؔ کی ساری ترقی اور کامیابی کو محض "احساس کہتری" کا نتیجہ قرار دیدینا غالبؔ کے شعور کی بھی توہین ہے اور اصول تنقید کی بھی۔ انسان کے ذہن پر اپنے خاندان، خاندانی عقائد اور مقصد زندگی کے متعلق طاری کردہ خیالات کا اثر بھی شدید ہوتا ہے لیکن ماحول اور خارجی حالات سے اس کی حد بندی ہو جاتی ہے اور اگر انسان بالکل ہی مجنون نہ ہو جائے تو وہ ان خیالات سے اسی حد تک اثر لے سکتا ہے جتنا واقعات اور امکانات اس کی اجازت دیں۔ چنانچہ غالبؔ کے یہاں بار بار افراسیاب اور پشنگ سے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش سمرقند اور ماوراء النہر سے تعلق قائم کرنے کا خیال، سپہ گری کے پیشہ پر ناز یقیناً ان کے کردار پر اثر انداز ہوتے نظر

آتے ہیں اور ان کی انفرادیت میں وہ زور اور بانکپن پیدا کرتے ہیں جن سے ان کے ہم عصروں کے تصورات محروم تھے گو انھیں حالات کے بدل جانے کا احساس قوی تھا، حالات کے بدل جانے پر محض حیرت زدہ ہو کر رہ جانا اور خاموشی اختیار کر کے بیٹھ جانا غالب کی طبیعت کے خلاف تھا چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ میرے آباؤ اجداد کیا تھے اور میں کیا ہوں، نہ سلطان سنجر بن سکا نہ بوعلی :-

"گفتم درویش باشم و آزادانہ رہ سپرم، ذوق سخن کہ ازلی آوردہ بود، ماہزنی کردو مرا بداں فریفت کہ آئینہ زدودن وصورتِ معنی نمودن نیز کار نمایاں است۔ سر لشکری ودانشوری خود نیست، صوفی گری بگذار دیہ سخن گستری روئے آر۔ ناگزیر ہم چناں کردم وسفینہ در بحر شعر کہ سراب است، رواں کردم، قلم علم شد، و تیرہائے شکستہ آیا قلم"

غالب کے دادا سمرقند چھوڑ کر دہلی آئے تھے لیکن غالب کو اس بات کا احساس تھا کہ ہندوستان میں آؤبھگت ہونے کے باوجود وہ بات کہاں جو ایرانِ باستاں کے ترقی یافتہ دور میں رہ چکی تھی! چنانچہ بہادر شاہ ظفر کی فرمائش پر مغلوں کی تاریخ لکھتے ہوئے مہر نیم روز کے دیباچے میں انھوں نے اپنے ذکر کا موقع بھی نکال لیا ہے اور صاف صاف کہا ہے کہ میرے بزرگوں کا یہاں آنا ایسا تھا کہ جیسے پانی اوپر سے نیچے آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کے ذہن میں سلجوقیوں کا عروج یافتہ شاہی نظام اور ہندوستانی مغلوں کا آخری دور ہو اور یہ فرق انھیں بہت بڑا معلوم ہوتا ہو۔ ان باتوں کا مطلب یہ ہے کہ غالب ماحول کے تغیر اور بدلے ہوئے حالات سے بے خبر نہ تھے۔ اس کا تذکرہ کہ ہم کیا تھے، اس سماج میں اپنی عظمت منوانے کے لئے تھا جو نسب ناموں سے متاثر ہوتا تھا، جو اوصافِ اضافی سے متاثر ہو کر افراد کی قدر و قیمت مقرر کرتا تھا، اپنے خاندان، نسب اور نسل کا ذکر کر کے وہ "احساسِ کہتری" کا ثبوت نہیں دیتے تھے بلکہ جاگیر دارانہ سماج میں اپنی جگہ بنانا چاہتے تھے، ورنہ انھیں خبر

تھی کہ اب زمانہ بدل چکا ہے :۔

ہوں گل فروش شوخیٔ داغِ کہن ہنوز ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر

اس طرح نفسیاتی مطالعہ غالؔب کے شعور کی بنیادوں تک پہنچنے میں پوری طرح مدد نہیں دیتا اس سے اس وقت مدد مل سکتی ہے جب غالؔب کے ماحول کا مطالعہ صحیح ہو۔ ان خارجی عوامل کا صحیح یا تقریباً صحیح تجربہ کر لیا گیا ہو جو تجسس پسند ذہن کے انفرادی، اجتماعی اور طبقاتی شعور کی تشکیل کرتے ہیں۔ کسی شاعر کے یہاں مکمل طبقاتی شعور کا پتہ نہ چلنے کی صورت میں اس کے آفاقی تصورات اور رجحانات میں اس کے فلسفۂ حیات اور ذہنی میلانات کی جستجو کی جا سکتی ہے کیونکہ اس کا شعور ان مادی حالات اور علوم کے باہر نہیں ہو سکتا جن سے وہ متاثر ہوتا ہے یا جن کی وہ واقفیت رکھتا ہے، غالؔب نے صرف اپنی شاعری کی شکل میں نہیں بلکہ اردو فارسی خطوں اور تاریخی کتابوں کی شکل میں بھی بہت کچھ چھوڑا ہے، ان کی انفرادیت پسندی اور خود شناسی نے انھیں بار بار اپنا تذکرہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔ اور ان کے قلم سے وہ باتیں لکھائی ہیں جو اُن کی روح کو بے نقاب کرتی ہیں۔ سائنٹفک تجزیہ کرنے والا اُسے اچھی طرح جانتا ہے کہ ایک شخص جو کچھ اپنے متعلق کہتا ہے تنہا وہی اس کے شعور اور ذہن کو پرکھنے کی کسوٹی نہیں بن سکتا لیکن اس کے عمل اور دوسرے مسائل کے متعلق اس کی رائے سے مدد دے کر اس کے شعور کی گہرائیوں میں اُترا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے سرسری طور پر غالب کی زندگی کے بعض اہم حالات اور اس وقت کے دوسرے واقعات پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔

غالؔب آگرہ میں ایک مہم آزما خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہ ایک ترکوں کا ایک کھاتا پیتا خاندان تھا جو ابھی نصف صدی پہلے سمرقند سے ہندوستان آیا تھا۔۔۔۔۔ اور یہاں اُسے اعزاز حاصل ہو گیا تھا۔ غالؔب کا ننہال بھی بے حد متمول تھا یہاں بھی امیرانہ اور رئیسانہ زندگی کی جھلک ملتی ہے، باپ اور چچا کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا اور مرزا

غالب نے اپنی ابتدائی جوانی آزادانہ لبسر کی جس کا ذکر غالب کے خطوں میں پایا جاتا ہے اور جس کی طرف اشارے مہر نیمروز کے دیباچے اور بعض فخریہ قصائد میں ملتے ہیں۔ بے فکری اور آرام کی اس زندگی نے غالب کو اپنے طبقے کے باہر نکلنے یا بڑے پیمانے پر بدلتی ہوئی زندگی کا تجربہ کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔ پھر ان کی تعلیم بھی انھیں لوگوں کے درمیان اور انھیں نظریات کے ماتحت ہوئی جو اس وقت کے شرفا کا دستور تھا۔ اس تعلیم کے متعلق کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا لیکن خود غالب کی تصانیف سے ان کی معلومات اور مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ متداول علوم سے اچھی طرح باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ علوم وہی تھے جو صدیوں سے ایک مقدّس روایت کی طرح اسلامی مکاتب میں پڑھائے جاتے تھے، اگر ان کے سلسلہ میں کبھی بحث ومباحثہ ہوتا بھی تو اس کی حیثیت زیادہ تر لفظی ہوتی تھی، تجربہ گاہیں مدت سے بند تھیں اور فلسفہ، منطق، طب، ہیئت، عروض، تصوف ہر ایک میں بندھے ٹکے اصُول چل رہے تھے، شاہ ولی اللہ کے انقلاب انگیز خیالات اور ان کے شاگردوں اور ماننے والوں کے بعض کارنامے بھی علم الکلام کی موشگافیوں میں اسیر ہوکر رہ گئے تھے، وہابی تحریک معمولی طور پر بعض حلقوں میں عوامی تحریک کی شکل اختیار کرلینے کے بعد ایک مذہبی گروہ میں مقید ہوگئی۔ اس کی عوامی حیثیت مخصوص سیاسی اور معاشی اسباب کی بنا پر بنگال اور بہار میں نمایاں ہوئی، دہلی تک پہنچتے پہنچتے وہ ایک مذہبی عقیدے سے آگے نہ بڑھ سکی اور غالب کے زمانے میں وہابی، غیر وہابی، مقلد غیر مقلد کی جو بحثیں ہوئیں اور جن میں غالب نے بھی دوستوں کی وجہ سے عملی نہیں علمی حصّہ لیا، مذہبی مناظرہ بازی سے زیادہ کچھ نہ تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی طبقاتی شکل نمایاں نہ ہوسکی۔ اس طرح غالب کی ابتدائی تعلیم بالکل رسمی ہوکر رہ جاتی اگر ملّا عبدالصمد نے غالب کو کچھ راہیں نہ دکھائی ہوتیں، ہرمزد جو اصلاً ایران کا زردشتی تھا مسلمان ہوگیا اور غالب کی خوش قسمتی سے آگرہ پہنچ کر ان کا اُستاد بن گیا، غالب نے اس سے فارسی زبان اور پارسی مذہب کے متعلق فیض اُٹھانے کا تذکرہ بڑی محبت اور گرم جوشی سے

کیا ہے۔ غالب کا ذاتی مطالعہ بھی وسیع معلوم ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس وقت مطالعہ میں مذہب اخلاق، تصوف، طب، ہیئت، منطق اور قصص وغیرہ کی وہی کتابیں ہو سکتی تھیں جو عرب ایران اور ہندوستان میں پانچ چھ سو سال سے رائج تھیں یہ جو اکثر آج کے محققانہ معیار سے غالب کو "کم پڑھا لکھا آدمی" ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ اس وقت بالکل معمولی نظر آنے لگتی ہے جب ہم غالب کو مولانا فضل خیر آبادی، مفتی صدر الدین آزردہ، حکیم احسن اللہ خاں، نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، حکیم مومن خاں مومن اور صہبائی وغیرہ کی صحبتوں میں دیکھتے ہیں۔ یہی اس عہد کے بڑے عالم اور دانشور تھے، غالب اُن سے بہتر نہ سہی ان کے ہم محفل اور باعزت دوست ضرور تھے[۱]

آگرہ کی آزاد زندگی میں پہلی رکاوٹ ان کی شادی سے پڑی جو ایک تعلیم یافتہ، شریف اور متمول گھرانے میں تیرہ سال کی عمر میں (یعنی ۱۸۱۰ء میں) ہوگئی۔ غالب کو شعر و شاعری سے دلچسپی تو آگرہ ہی میں شروع ہو چکی تھی لیکن اب وہ دہلی چلے آئے جو اپنی مٹتی ہوئی بہار دکھا رہی تھی۔ وہاں عالموں کا مجمع تھا، سخن فہموں اور شاعروں کی بھیڑ تھی اور تباہی و بربادی کے باوجود ایک عظمت تھی جو قدیم جاگیردارانہ تصورِ حیات اور امیرانہ کلچر کو اپنے دامن میں پناہ دیئے ہوئے پڑی تھی۔ ہر نظام اپنے زوال کے زمانے میں زبردست تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ حقیقت اور خیال میں، ماضی اور حال میں وضعداری اور اصلیت میں جنگ جاری رہتی ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ مطالبہ کرتے ہیں اور مٹتی ہوئی

---

[۱] ادھر حال ہی میں قاضی عبدالودود صاحب نے علی گڈھ میگزین کے غالب نمبر میں دو مضامین لکھ کر غالب کی کم علمی اور دروغگوئی کا ذکر کیا ہے موصوف کا خیال ہے کہ عبد الصمد ایک فرضی کردار تھا جسے غالب کے ذہن نے دشمنوں پر رعب جمانے کیلئے تراش لیا۔ یہ بھی ثابت کیا ہے کہ غالب معمولی استعداد کے آدمی تھے میں موصوف کے دلائل کو صحیح نہیں سمجھتا۔ مگر اس وقت اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا ہے۔

عظمت کا پاس خیالوں میں کوئی اور دُنیا بساتا ہے۔ بدلتی ہوئی دُنیا ایک جہان تازہ کی نمود چاہتی ہے، اور تاریخ کی منطق سے ناواقف ذہن ماضی سے چمٹے جاتے ہیں۔ دہلی صدیوں سے جاگیردارانہ تمدّن کا گہوارہ رہ چکا تھا: اس نے بہت سے انقلابات دیکھے تھے لیکن ہر انقلاب کسی نہ کسی شکل میں اُسے جاگیرداری اور شاہی حدوں کے اندر ہی رکھتا تھا طبقوں کی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی میں البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی قوت نے اس نظام کی بنیادیں بدلنا شروع کر دی تھیں، ہندوستان کی دیہی معیشت اور صنعت کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ کچا مال باہر جاتا تھا، دولت باہر جا رہی تھی، افلاس بڑھ رہا تھا لیکن اس کے واضح اثرات بنگال اور بہار تک محدود تھے۔ مغل حکومت کے اندرونی نظام میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی جو تصور زندگی کو بدل دیتی۔ جو تبدیلیاں بھی ہو رہی تھیں وہ زوال اور انحطاط ہی کی داخلی کیفیتیں پیدا کرتی تھیں اور تاریخی شعور نہ ہونے کی وجہ سے ان تبدیلیوں کی واضح تصویر نگاہوں کے سامنے نہ آتی تھی یہاں تک کہ غدر ہو گیا اور اس میں بھی ہندوستان کے کمزور جاگیردارانہ نظام کو شکست ہوئی۔

اس درمیان میں غالبؔ نے دُنیا کے بڑے بڑے تجربے حاصل کر لئے تھے۔ چچا کی جاگیر کے صلہ میں انھیں جو پنشن ملتی تھی اس کے سلسلہ میں اُنھیں کلکتہ جانا پڑا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً تیس سال کی تھی۔ یہ سفر کئی حیثیتوں سے غالبؔ کی ذہنی تشکیل میں ایک اہم جگہ رکھتا ہے۔ اوّل تو پنشن کا یعنی روزی اور بے فکری سے زندگی گذارنے ہی کا معاملہ تھا۔ جس نے تقریباً ساری عمر ایک عجیب طرح کی امید و بیم کی دُنیا میں رکھا غالب کے فارسی اردو خطوط اس کش مکش سے بھرے پڑے ہیں جو اس پنشن کے قضیہ کے سلسلہ میں رونما ہوئی انگریزوں سے ان کی تھوڑی بہت ملاقات یوں بھی تھی لیکن اس مقدمہ کے تعلق سے انگریزی عدالتوں کے ساتھ انگریزی طرز حکومت کا اندازہ بھی غالبؔ کو ہوا۔ لکھنؤ، بنارس، اور

دوسرے مقامات اور حالات سے غالب کی واقفیت بڑھی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انھیں بنگال میں نشاۃ ثانیہ کی پھوٹتی ہوئی کرن، نئی زندگی کے ہلکے ہلکے ابھرتے ہوئے نقوش دیکھنے کا موقع ملا۔ اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ غالب سر سے پاؤں تک جاگیردارانہ تصور تہذیب میں غرق تھے لیکن یہ تجربے ایک ایسے ذہن پر اپنا نقش چھوڑ رہے تھے جو چیزوں کی حقیقت جاننے، مشاہدے سے کام لینے اور نئے تصورات کا خیر مقدم کرنے میں بے باک تھا۔

کلکتہ نئے سرمایہ دارانہ تصورات کا منبع تھا اور کلکتہ کے باہر بنگال کے دوسرے علاقوں میں وہ عوامی طبقاتی کش مکش بھی بہت غیر واضح شکل میں شروع ہو چکی تھی جو کبھی وہابی تحریک سے اثر لیتی تھی، کبھی فرائضی تحریک سے، کبھی ڈاکوؤں اور سنیاسیوں کی شکل میں نمودار ہوتی تھی کبھی ٹھگی کے بھیس میں۔ اور جس زمانے میں غالب کلکتہ میں مقیم تھے۔ اس وقت ان تحریکوں کا زور تھا۔ ذمہ دار انگریز عہدہ دار یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہندوستان میں ہوائیں ان کے خلاف چل رہی ہیں لیکن کلکتہ میں یہ سب کچھ نہ تھا، غالب نے وہاں جو چہل پہل دیکھی، جو عمارتیں دیکھیں، جو حسین اور جمیل عورتیں دیکھیں، جو ایک نیا بنتا ہوا تمدن دیکھا اُس نے ان کا دل موہ لیا، بنارس میں مناظر فطرت اور حسن انسانی نے ان کے جوان حسن پرست دل پر گہرا اثر ڈالا تھا کلکتہ نے تو "تیرِ نیمکش" بن کر وہ خلش پیدا کر دی کہ بعد میں بھی جب کلکتہ کا ذکر آتا تھا تو انھیں وہاں کے "سبزہ زار ہائے مطرا" اور "نازنین بتانِ خود آرا" یاد آتے اور سینے پر تیر لگتا۔ کلکتہ میں کچھ ایسی کشش تھی کہ احباب کی دوری کا غم بھی مٹتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی انسان کا ذہنی افق اسی طرح وسیع ہوتا ہے اور شعور اسی طرح وہ ذخیرہ جمع کرتا ہے جو اسے اپنی طبقاتی تنگ نظری سے باہر نکالنے میں معین ہوتا ہے۔ حمید احمد خاں نے ایک مضمون میں بڑی خوبی سے کلکتہ اور غالب کے ذہنی تعلق پر روشنی

ڈالی ہے:-

"تاج محل اور لال قلعے کی عمارتوں کے لاشریک حُسن کی یکتائی اور بے ہمگی سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہ انگریزی تعمیرات ایک الگ کیفیت رکھتی تھیں بادشاہی دور کے آخری شاعر کی ذکاوت ذہن ایک نئے جمہوری فن تعمیر کی زیبائش اور یورپی شہر سازی کے اجتماعی آہنگ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہی.....
اس نیم فرنگی نیم ایشیائی شہر میں مشرقی اور مغربی معاشرت کا عجیب امتزاج نظر آتا تھا۔ انگریز اگر عطر، الائچی اور پان کے استعمال سے بے خبر نہ تھے تو ہندوستانی بھی وسکی اور اولڈ ٹام سے مانوس ہوتے جاتے تھے۔"

غالب نے اس کلکتہ کو دیکھا جس میں انگریزی سرمایہ داری اپنے قدم جما رہی تھی اور اس بنگال کو نہ دیکھ سکے جس میں اس کے خلاف طوفان اُٹھ رہے تھے لیکن انھوں نے جو کچھ دیکھا وہ رائیگاں نہیں گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے غالب کے قیام کلکتہ کو ان کی زندگی کا بڑا اہم موڑ قرار دیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ گو غالب بنیادی طور پر بدل نہ سکے لیکن کلکتہ سے وہ ایسے خیالات اور تصورات ضرور لائے جو اُن کے دہلی کے حریفوں اور ہم عصروں کے "سرحد ادراک" سے بھی باہر تھے، کوئی قطعی ثبوت تو نہیں دیا جا سکتا لیکن غالب کے اردو خطوط میں فورٹ ولیم کالج کی اردو نثر کی سادگی دیکھ کر یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ غالب نے کلکتہ کے دو سالہ قیام میں اُس جدید نثر کا مطالعہ کیا اور اس سے فائدہ اُٹھایا جس کے حُسن اور اثر سے اردو کے نثر نگار اس وقت ناواقف تھے۔

کلکتہ میں غالب نے جو چیزیں دیکھی تھیں ان کا اثر بہت بعد تک رہا۔ بیس سال بعد جب سرسید نے (جو اس وقت سر نہیں بلکہ صدر الصدور تھے) ابوالفضل کے مشہور آئین اکبری کی تصحیح کی اور غالب سے اس پر تقریظ لکھنے کی فرمائش کی تو غالب نے ایک انقلابی نظم لکھ کر سرسید کے پاس بھیجدی، آئین اکبری مغل جاہ و جلال، حکومت و تمکنت کا منشور تھا

اور مغلوں نے اس کے مطابق خوب حکومت کی لیکن انیسویں صدی کے وسط میں دُنیا بدل چکی تھی، غالبؔ ایک نئے نظامِ حکومت اور طرزِ سلطنت سے کسی حد تک واقف ہو چکے تھے، سائنس کی حیرت زائیوں اور برکتوں کا اندازہ کر چکے تھے۔ اس کی مدد سے انسان کی زندگی میں جو حسن اور قوت پیدا کرنے کی صلاحیت اس زمانے میں پیدا ہو رہی تھی وہ مغل عہدِ حکومت میں کہاں تھی۔ اس لئے غالبؔ کا نیا شعور، جو جاگیردارانہ ہونے کے باوجود بدل رہا تھا، دونوں عہدوں کا تقابل کرنے لگا۔ غالبؔ کی عظمت اسی میں ہے کہ انھوں نے ترقی کی علامتوں کو اور سائنس کے امکانات کو اپنے دائرۂ تخیل میں جگہ دی۔ ان سے یہ مطالبہ کرنا فضول ہوگا کہ انھوں نے بادشاہت کی کھلم کھلا مخالفت کیوں نہیں کی۔ جاگیرداری نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ محنت کش طبقہ کی رہنمائی کے لئے کچھ کیوں نہیں لکھا! دیکھنا یہ چاہیئے کہ انھوں نے بدلتے ہوئے زمانے کو کس نظر سے دیکھا، اس وقت کتنے شاعر تھے جو اسٹیم انجن، ٹیلیفون، ریلوے اور بجلی کا نام بھی جانتے تھے ان چیزوں کی اہمیت اور افادیت کا احساس تو بڑی چیز ہے لیکن غالبؔ نے آئینِ اکبری کے مقابلے میں اس نظام کو سراہا جو سائنس کی ان برکتوں سے زندگی کو مالا مال کر سکتا تھا اس میں شک نہیں کہ غالبؔ اس استحصال اور اقتصادی تاراجی سے بے خبر تھے جو ان برکتوں کے پردے میں چھپی بیٹھی تھی اس لئے ان کا شعور ایک ناقص سی تصویر بنانے میں کامیاب ہوتا ہے بہرحال جب غالبؔ نے سب سے زیادہ ترقی یافتہ جاگیردارانہ دستورِ حکومت کا مقابلہ اس سے کیا تو اس حقیقت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے کہ:۔

گر ز آئیں می رود با ما سخن	چشم بکشا در ریں دیرِ کہن
صاحبانِ انگلستاں را نگر	شیوہ و اندازِ ایناں را نگر
تا چہ آئیں ہا پدید آوردہ اند	آنچہ ہرگز کس نہ دید آوردہ اند
زیں ہنرمنداں ہنر بیشی گرفت	سعی بر پیشینیاں پیشی گرفت
حق ایں قوم است آئیں داشتن	کس نیارد ملک بہ زیں داشتن

داد و دانش را بہم پیوستہ اند | ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کز سنگ بیروں آورند | ایں ہنرمنداں ز خس خوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں بآب | دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد | گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
از دخاں زورق بہ رفتار آمدہ | باد و موج ایں ہر دو بیکار آمدہ
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند | حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ایں نمی بینی کہ ایں دانا گروہ | در دو دم آرند حرف صد گروہ
می زنند آتش بہ باد اندر ہمی | می درخشد باد چوں اخگر ہمی
رو بہ لندن کاندراں رخشندہ باغ | شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار | گشتہ آئین دگر تقویم پار

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ جب نئی زندگی سے خوشہ چینی کرنے کا موقع مل رہا ہو تو پھر کوئی اس خرمن سے (آئین اکبری سے) خوشہ چینی کیوں کرے۔ ہاں ابوالفضل کی طرز تحریر خوب ہے لیکن :۔

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است | گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است
مبداء فیاض را مشمر بخیل | نور ہیز د در طب یا زاں نخیل
مُردہ پروردن مبارک کار نیست | خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

غالبؔ اس سلسلہ میں مردہ پرستی پر بھی چوٹ کرتے ہیں اور مستقبل کی طرف سے پُر اُمید ہیں کیونکہ زندگی کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے، اچھی سے اچھی چیزیں وجود میں آتی رہتی ہیں۔ بعض حضرات شاید اسے انگریزوں کی خوشامد قرار دیں لیکن یہ انداز بیان ہی خوشامدانہ نہیں ہے اس نظم میں شاعری بھی نہیں اظہار حقیقت ہے اور پھر یہ غدر کے پہلے اس وقت لکھی گئی جب غالبؔ بہادر شاہ ظفرؔ کے دربار سے متوسل ہو چکے تھے مغرب سے آئے نئے نظام کے اُن

پہلوؤں کو سراہنا جو ترقی پسندانہ تھے اس زمانے میں حیرت خیز آزاد طبعی اور جرأت آفرینی کا ثبوت فراہم کرتا ہے بعد میں بھی غالب نے ملکہ وکٹوریہ کی تعریف میں قصیدہ لکھتے ہوئے اس پہلو کی طرف خاص طور سے اشارہ کیا :۔

خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت ۔۔۔ در روزگار ہا نہ تواند شمار یافت

غالب کا دَور تاریخ ہند میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا تھا جس کے پیچ وخم کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ اس میں ایسی گتھیاں پڑتی ہیں جنھیں صرف مستقبل کھول سکتا ہے لیکن تغیر کا عکس دیکھنا اور نئے تجربات کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہنا ظاہر کرتا ہے کہ غالب کے لئے زندگی کوئی بنی بنائی، مختتم اور مکمل حقیقت نہیں ہے۔ ہر دَور اپنے لئے راستہ تلاش کر لیتا ہے۔ فطرت بخیل نہیں فیاض ہے۔ زمانہ بہتر سے بہتر بنتا رہے گا۔

کلکتہ کا سفر پنشن حاصل کرنے کی حیثیت سے مایوسی اور ناکامی کا سفر تھا لیکن نئے تجربے اور نئے شعور کی دولت اکٹھا کرنے کے لحاظ سے بہت اہم نکلا۔ اسی سفر نے انھیں اس نظام کی بربادی کا یقین دلایا جو بہت دنوں سے انحطاط اور تباہی کی طرف نہایت سرعت کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ اس کا تجزیہ اپنی جگہ پر کیا جائے گا لیکن اصل چیز جو غالب کے شعور کو پرکھنے کی کسوٹی بن سکتی ہے ۱۸۵۷ء کا غدر ہے کیونکہ غدر نے ہندوستان کو قدیم اور جدید میں تقسیم کر دیا ایک طاقت کی جگہ دوسری طاقت کو لا بٹھایا جو نئے تصورات زندگی اور نئے معاشی نظام کی علمبردار تھی۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ غدر جاگیر دار قوتوں کی آخری حرکتِ مذبوحی تھی جو نئی طاقت، برطانوی استعمار اور اقتدار سے ٹکر لینے کے لئے نمایاں ہوئی۔ اس میں عوام نے براہِ راست کسی طبقاتی شکل میں حصّہ نہیں لیا، غدر کے متعلق ترقی پسندانہ اور ہوشمندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ اسے تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے اور ان قوتوں کا تجزیہ کیا جائے جو حصولِ قوت کے لئے نبرد آزما تھیں۔ جاگیر داری نظام کے مقابلہ میں صنعتی اور

سرمایہ دارانہ نظام کتنا ہی ناقص اور ظالمانہ کیوں نہ ہو، زندگی کی ترقی، ذرائع پیداوار اور تسخیر فطرت کی طرف نیا قدم اٹھانے کا پتہ دیتا ہے۔ تاریخ کی بڑھتی ہوئی طاقتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں۔ جاگیرداری نظام اپنا کام پورا کرنے کے بعد ختم ہو رہا تھا حالانکہ اس کا جمالیاتی اور اخلاقی پہلو ابھی اپنا کام کئے جا رہا تھا اور سرمایہ دارانہ نظام اپنے بطن میں بہت سے امکانات لئے ہوئے اُبھر رہا تھا۔ طبقاتی حیثیت سے اوپری طبقوں کی نوعیت تو کسی قدر واضح ہوتی جا رہی تھی لیکن عوام بالکل غیر منظم، ناواقف اور صدیوں کی جہالت کا شکار ہونے کی وجہ سے کوئی واضح شکل بھی نہیں رکھتے تھے اس لئے ایک شعور کے ترقی پسند ہونے کی کسوٹی یہ تھی کہ وہ جاگیرداری کی موت پر اور نئے نظام کی برتری اور اس کے امکانات پر یقین (اور یقین نہ سہی خیال اور گمان) رکھتا ہے یا نہیں۔ اقتصادی پستی کے اس دَور میں جب کسان بڑی حد تک زمین کا مالک نظر آتا ہے لیکن ذرایع پیداوار کے غیر ترقی یافتہ ہونے کی وجہ سے بچھا پڑا ہے۔ جب امرا غیر منظم ہیں اور دستکار بیکار ہوتے جا رہے ہیں ایسے شعور کی امید کرنا جو کسی منظم فلسفۂ زندگی کی تلقین کر سکے، ارتقائے شعور کی مادّی بنیادوں سے ناواقفیت کے برابر ہوگا۔ ہندوستان جس طرح معاشی زندگی میں ذرائع پیداوار کے بچے کھچے اور سڑے گلے آلات سے کام لیکر خاموشی اور جمود کے دن گزار رہا تھا اسی طرح اپنی تہذیبی اور عملی زندگی میں اس سواد کو اُلٹ پلٹ کر اپنی ذہنی تسکین کے کام میں لا رہا تھا جو بالکل دوسرے قسم کے تاریخی حالات میں پیدا ہوا تھا۔

غدر ہوا اور مغل سلطنت جو برائے نام سہی ایک عظیم الشان روایت کا نشان اور ایک مخصوص تہذیب کی علامت تھی ختم ہوگئی، بہادر شاہ ظفر قید کر لئے گئے، ان کے حامی اور حمایتی، ان کے متوسلین اور متعلقین پر آفتیں آئیں اور اس انتشار میں برطانوی حکومت کا تسلط ہوا، جس کے معنی تھے ایک نیا جاگیردارانہ نظام، ایک نیا صنعتی نظام، ایک نئی دیہی معیشت، نئے طبقاتی تعلقات اور نیا اندازِ فکر، نئی اُمیدیں اور نئی مایوسیاں۔ مگر یہ سب

دیکھنے اور سمجھنے والوں کے لئے تھا، غدر کو کس نے کس نظر سے دیکھا۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ لیکن غالب نے اسے جو اہمیت دی ہے وہ نظر انداز کئے جانے کی چیز نہیں۔ اس سے غالب کے ذہن کا پتہ چلتا ہے۔

اپنے خطوط میں انھوں نے غدر کا تذکرہ کثرت سے کیا ہے، یہی نہیں ایک مختصر سی کتاب، جو روزنامچے کی حیثیت رکھتی ہے، دورانِ غدر میں ہی دستنبو کے نام سے لکھی۔ یہ کتاب ایک ذاتی یادداشت ہونے اور تاثرات سے لبریز ہونے کے باوجود بہت کچھ نہیں بتاتی۔ خطوں اور دستنبو کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ:-

۱۔ غالب غدر کو کسی مخصوص طبقے کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں دیکھ رہے تھے کیونکہ غدر کی طبقاتی نوعیت ان کے سامنے نہ تھی۔

۲۔ انھوں نے اسے "رستخیز بے جا" کہہ کر یہ ضرور ظاہر کیا ہے کہ وہ بعض وجوہ سے اس ہنگامے سے خوش نہ تھے۔

۳۔ غدر کے زمانے میں ذاتی تکلیفیں اور آلام بھی ان کے لئے روح فرسا تھے۔

۴۔ ابتدائی خطوں میں یہ خیال بار بار ملتا ہے کہ غدر میں جو حالات ہیں لکھ نہیں سکتا۔

۵۔ امرار، رؤسا اور شہزادوں پر جو مصیبتیں آئیں ان کے ذکر میں دوستی اور ذاتی غم کا اظہار زیادہ ہے۔

۶۔ انگریزوں میں سے بھی جو مارے گئے ان سے ہمدردی ہے، اس ہمدردی میں بھی ذاتی دوستی اور شناسائی کا خیال زیادہ ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی خوبیوں کا بھی احساس ہے۔ دستنبو میں انھیں "جہاندارانِ داد آموز دانش اندوز، نکو خوئے نکو نام" کہا ہے۔

۷۔ غالب کو غدر کے غیر منظم ہونے کا احساس ہے۔

۸۔ انھیں اس کا بھی احساس ہے کہ انگریزوں نے غدر کے فرو ہونے کے بعد

خاص طور سے مسلمانوں کو سزائیں دی ہیں اور دہلی سے باہر نکال دیا ہے۔

۹۔ باغیوں نے قتل و غارت، لوٹ مار میں جو بے امتیازی برتی غالب اس کے شاکی ہیں۔ لیکن وہ انگریزوں کی ان زیادتیوں سے بھی خوش نہیں جو غدر کے بعد عمل میں آئیں۔

۱۰۔ غالب کو مغل حکومت کے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانے کا کوئی خاص غم نہیں معلوم ہوتا حالانکہ آخری چند سال ان کے دربار دہلی سے براہِ راست وابستگی کے سال تھے۔

ان باتوں کی روشنی میں اگر غالب کے رجحان کا اندازہ لگایا جائے تو واضح ہوگا کہ غدر کے متعلق غالب کوئی گہری سیاسی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ پہلے ہی سے اس نظام کی تباہی کا اتنا احساس رکھتے تھے کہ جب حکومت بدلی تو انھیں حیرت نہ ہوئی بلکہ ان کے لئے یہ کوئی ایسی بات ہوئی جس کا انھیں پہلے ہی سے یقین تھا۔ انگریز غدر کے بہت پہلے ہی سے سیاسی معاملات اور انتظامِ مملکت میں اتنے دخیل تھے، کہ جب وہ باقاعدہ حاکم ہو گئے تو ان لوگوں کو جنھیں غدر سے کوئی نقصان نہیں پہنچا کچھ زیادہ فرق نہیں معلوم ہوا۔ غالب کا نقطۂ نظر اس سلسلہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ غدر کی وجہ سے پیدا ہونے والی سیاسی تبدیلی کو ایک حقیقت سمجھ کر اور انگریزی حکومت کو ایک نئی سلطنت سمجھ کر قبول کر لیا جائے اس لئے ان کے اندر اس نئی حکومت کے خلاف کوئی جذبہ نہیں معلوم ہوتا۔ ان باتوں سے غالب کی وطن دوستی یا قوم پرستی کے متعلق کوئی ایسا نقطۂ نظر قائم کرنا جو واضح طور پر انھیں پرانے جاگیردارانہ نظام کا دشمن یا نئی انگریزی حکومت کا خوشامدی بنا دے صحیح نہ ہوگا۔ غالب کا ادراک غدر کے معاملہ میں ایک حقیقت نگر کا ادراک تھا جو تصور پرست ہونے کے باوجود حالات کو سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بعض منطقی نگاہ رکھنے والوں کو یہ بات متضاد کی حامل نظر آئے گی لیکن تھوڑے سے غور سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ غالب کا خلوص اور نظریۂ فن تھا جو انھیں عقائد میں عینیت پسند اور صوفی بنانے کے باوجود حقیقت پسندی کی طرف مائل کرتا تھا۔ ان کے یہاں شعر اس طرح

ڈھلتے تھے۔

غالبؔ اگر دمِ سخن رہ بہ ضمیرِ من بری بینیم از گداز دل، در جگر آتشے چو سیل

دستنبو اور مہر نیمروز کے دیکھنے کے بعد یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ غالبؔ کے پیشِ نظر کوئی فلسفۂ تاریخ بھی تھا یا نہیں؟ اگر اس کا اندازہ ہو سکے تو غالبؔ کے شعور کا بھی اندازہ لگایا جا سکے گا۔ کیونکہ ایک شخص کا تاریخی شعور ہی زندگی اور اس کے مظاہر کے متعلق اس کا رویہ متعین کرتا ہے۔ مہر نیمروز آغازِ آفرینش سے لے کر ہمایوں کے وقت تک کی مختصر تاریخ ہے، یہ اس مجوزہ پرتوستان کا پہلا حصہ ہے جس میں تیموری بادشاہوں کی تاریخ بہادر شاہ ظفرؔ تک لکھنے کا کام غالبؔ کے سپرد ہوا تھا، غالب اس کا پہلا ہی حصہ لکھ سکے۔ دنیا بدل گئی اور دوسرا حصہ ماہ نیم ماہ وجود ہی میں نہ آیا۔ مہر نیمروز ایک تحقیقی کتاب کی حیثیت سے بہت اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ تقریباً سو صفحوں میں ہزاروں سال کی تاریخ لکھنا کوئی معنی نہیں رکھتا تاہم اس سے غالب کی واقفیت، وسعتِ مطالعہ اور نکتہ رسی کا پتہ ضرور چلتا ہے وہ زندگی کے تسلسل کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ قیامت کے بعد نئے آدم کے ظہور پر عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔ اور حضرت علیؓ کا ایک قول پیش کر کے لکھتے ہیں کہ دُنیا یوں ہی چلتی رہے گی، آدم کے بعد آدم آتے رہیں گے، یہاں سے غالبؔ نے فلسفۂ وحدت الوجود کا سہارا لے کر حقیقت کا وہی تصور پیش کیا ہے جس میں مادہ اور روح کا امتزاج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مہر نیمروز میں لکھتے ہیں۔

"اے آنکہ از قدم و حدوث عالم سخن رائی یکرہ بہ حلقۂ آزادگاں درآئی و ایں راز بایگانہ بینایاں درمیان سنہ تادانی کہ عالم خود در خارج وجود ندارد و دوئی و کہنگی درمیان تو چوں تو اند گنجید، ہماں ذاتِ اقدس متقدس کہ صفات عینِ اوست و عالم از وے چوں پرتو از مہر جدا نیست در ہر عالم از اعیان ثانیہ تا صورِ محشورہ از خویش بر خویش جلوہ گستر است...."

اور ایسے خیالات غالب کے خطوں میں، فارسی اردو اشعار میں برابر آتے رہے ہیں ان کو تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔

"ہستیِ ذرہ جز پندار نیست، ہر چہ ہست تاب آفتاب است و بس۔ دریا را ہر کجا روان بینی ہر آئینہ موج و حباب و کف و گرداب عیاں بینی۔ آیا آں طراز صورت اصلی دریا است یا ہر یک ازاں پیکر در ہستی و پیدائی با دریا انباز دانی ہمہ اوست ور نہ دانی ہمہ اوست"

اس میں شک ہی نہیں رہ جاتا کہ غالب کے دل میں وحدت الوجود کا عقیدہ گھر کئے ہوئے تھا اور کائنات کی بہار اور اس کے تغیرات کو وہ اسی کی روشنی میں دیکھتے تھے غالب نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اس کتاب میں وہ لکھ رہا ہوں جو مجھے مختلف ذرائع سے ملا ہے۔ کہیں کہیں اپنی "دید و دریافت" سے بھی کام لیا ہے۔ یہاں غالب کا وسیع مطالعہ کام آیا ہے۔ انھوں نے تاریخی تحقیق کا فرض انجام نہیں دیا ہے لیکن آغاز آفرینش کے ان دو عقیدوں کو بڑی دلکشی سے پیش کیا ہے جس سے ہندوستان کے علماء واقف تھے پہلے ہندو مذہب کے نقطۂ نظر سے اور پھر اسلام کے مطابق دنیا اور انسان کی پیدائش ابتداء اور ارتقاء کا ذکر کیا ہے۔ آگے چل کر پارسیوں کے خیالات بھی پیش کئے ہیں۔ غالب نے کہیں کہیں اپنے ماخذ کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ غالب نے ابن خلدون کے اس خیال کو سامنے نہیں رکھا کہ تاریخ کا موضوع انسان کی معاشرتی زندگی ہے۔ حالانکہ دستنبو اور خطوط میں معاشرتی پس منظر کہیں کہیں اُبھر آیا ہے۔

غالب عملاً کسی مخصوص گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ان کی عملی زندگی پنشن اور روزی کے لئے جد و جہد کرنے اور ادبی کاموں میں لگے رہنے تک محدود تھی۔ روزی کے لئے جد و جہد ان کی طبقاتی زندگی کی مظہر تھی۔ ان کی محنت دماغی تھی جس کے خریدار اور قدردان امراء اور کھاتے پیتے لوگ ہو سکتے تھے۔ ان کی نگاہ میں عرب اور ایران کے

قدر دان بادشاہ اور امراء تھے۔ خود ہندوستان میں مغل سلاطین، امراء گولکنڈہ اور بیجاپور کے دربار تھے جہاں عرفی، نظیری، قدسی، صائب، کلیم اور ظہوری وغیرہ اپنی اسی خصوصیت کی قیمت پا چکے تھے اور عزت کی زندگی بسر کر چکے تھے اس لئے وہ بھی اچھے سے اچھے قصائد لکھ کر، اچھی سے اچھی غزلیں کہہ کر، علمی کام کر کے باوقار زندگی بسر کرنے کا حق اور اطمینان چاہتے تھے ان کے سپاہی پیشہ بزرگوں نے تلوار سے عزت حاصل کی تھی وہ قلم سے وہی کام لینا چاہتے تھے۔ اس طرح ان کی عملی زندگی محدود تھی۔ انفرادی اور ذاتی تجربات کا لازوال خزانہ ان کے پاس تھا لیکن اسے اجتماعی زندگی کے ڈھانچے میں بٹھانا آسان نہ تھا لامحالہ انھوں نے اسی مواد پر عمارت کھڑی کی جو انھیں ذہنی طور پر ورثہ میں ملا تھا بس انھوں نے یہ کیا کہ بدلتے ہوئے حالات اور ذاتی تجربات سے مدد لیکر اس عمارت میں چند ایسے گوشے بھی تعمیر کر دیئے جو ان کے پیشروؤں سے نہ تو ممکن تھے نہ جن کے نقشے ذہن میں تعمیر ہوئے تھے۔ ان ذاتی تجربات کے علاوہ غالب کا وسیع مطالعہ تھا جو ان کے ذہن کے لئے غذا فراہم کرتا رہتا تھا اور قدیم علوم کے ذریعہ سے نئے تجربوں کو سمجھنے کی کوشش میں انھیں ایک نیا رنگ دینے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ اسی چیز کو ان کے نقادوں نے جدت، تازگی اور طرفگیٔ مضامین سے تعبیر کیا ہے۔

اسلام اور دوسرے مذاہب کا مطالعہ، تاریخ، اخلاقیات، ہیئت، طب، منطق تصوف، یہی وہ علوم ہیں جو رائج تھے اور انھیں سے غالب نے زندگی کو سمجھنے میں مدد لی تھی اسلامی علوم اور تصوف جو غالب تک پہنچے تھے ایران ہو کر پہنچے تھے۔ اور جب ہم ایران میں لکھی ہوئی مذہب، تاریخ اور اخلاقیات کی کتابوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تاریخی تقاضوں سے ان میں کئی عناصر جذب ہو گئے تھے۔ بعض عناصر تو مقامی تھے بعض تجارتی راہوں سے وہاں آئے تھے چنانچہ ایران میں جو علمی آثار عباسیوں کے زمانے میں نمایاں ہوئے، ان میں عربی، یونانی، زرتشتی اور ہندی اثرات تلاش کیے جا سکتے

ہیں۔ عباسیوں ہی کے زمانے میں ایران کا قومی احیا رہی ہوا جیسے تا تاریوں کی یورش سے دب جانا پڑا۔ ایران نے تاجر اور سپاہی پیدا کئے لیکن تاجر منظم نہ ہو سکے اور سپاہیوں نے انفرادی طور پر سلطنتیں قائم کرکے ایران کے شاہی نظام کو مضبوط بنا دیا۔ یہیں سے غالب کو وہ فلسفۂ مذہب اور اخلاق ملا جس کو آج تک اسلامی نظام فلسفہ میں اونچی جگہ حاصل ہے اور غالب کے زمانے میں تو دوسرے خیالات کی طرف ہندوستانیوں کا ذہن جا ہی نہیں رہا تھا۔ یہیں سے انھوں نے تصوف کے وہ خیالات لئے جو ایران میں افلاطونیت سے مخلوط کرکے اسلامی عقائد کی سخت گیری کے خلاف پیدا ہوئے تھے اور جسے رسمی مذہب پرستی سے اختلاف رکھنے والے شاعروں نے ہر دلعزیز بنایا۔ یہاں پھر یہ کہدینا ضروری ہے کہ غالب صوفی مشرب ہونے اور وحدت الوجود میں عقیدہ رکھنے کے باوجود تصوف کے سارے اصولوں کو عملی صوفیوں کی طرح نہیں مانتے تھے ——

وحدت الوجود کی طرف ان کا میلان کچھ تو مسائل کائنات کے سمجھنے کے سلسلہ میں پیدا ہوا تھا اور کچھ مذہب کی ان ظاہرداریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ تھا جو ان کی آزادی لپند طبیعت پر بار تھیں۔ غالب جس سماج کے فرد تھے اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داخلی طور پر تصوف ہی میں نمایاں ہو سکتا تھا کیونکہ غالب کو کوئی واضح خارجی سہارا آزادی کے لئے حاصل نہ تھا۔ کوئی علمی یا ادبی تحریک جس سے وابستہ ہو کر وہ اپنے طبقے کے ماحول میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود آگے بڑھ جاتے، موجود نہیں تھی۔ وہ زمانہ کچھ دن بعد آیا جب سرسید، حالی اور آزاد نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور زندگی کے نئے مطالبات کی روشنی میں ایک ادبی تحریک کی بنیاد ڈالدی۔ غالب کی ذہنی ترقی کا دور غدر تک ختم ہو چکا تھا گو وہ اس کے بعد بھی بارہ سال تک زندہ رہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ غدر کے بعد غالب کی شاعری تقریباً ختم ہو چکی تھی اور اس کے اثرات ان کے خطوں میں جس طرح نمایاں ہیں ان کے اشعار میں نمایاں نہ ہو سکے انھوں نے غدر کے پہلے ہی فضا

کی ساری اُداسی اور افسردگی کو داخلی بنا کر اپنے سینے میں بھر لیا تھا اس لئے جذبے کا وہ تسلسل قائم رہا اور خارجی تغیرات نے نئی داخلی سمتیں اختیار نہیں کیں۔

ذرائع پیداوار اور انسانی شعور کے عمل اور ردِّ عمل سے زندگی آگے بڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ممالک مختلف سماجی اور معاشی منزل پر ہوتے ہیں اور ان کے فلسفۂ زندگی اور تمدنی شعور کی منزل بھی کم و بیش اس سے مناسبت رکھتی ہے۔ انیسویں صدی کے وسط میں جب ہندوستان اقتصادی پستی کی اس منزل میں تھا، یورپ میں مشینی انقلاب ہو چکا تھا۔ اور سماجی شعور ڈارون، مارکس اور اینگلز کو پیدا کر چکا تھا۔ ہندوستان کا ذہن سے ذہین مفکر اس تخلیقی گرمی سے خالی تھا جو قوموں کی تقدیر بدل دیتی ہے اور اپنے اندر اجتماعی روح کی پرورش کرتی ہے۔ غالبؔ نے عملی زندگی کی جگہ فکری زندگی میں آسودگی حاصل کرنے کی کوشش کی اور اسی کے اندر انسان اور کائنات فنا اور بقا، خوشی اور غمِ عشق اور آلام روزگار، مقصدِ حیات اور جستجوئے مسرت، آرزوئے زیست اور تمنائے مرگ، کثافت اور لطافت، روایت اور بغاوت، جبر و اختیار، عبادت اور ریاکاری، غرضکہ ہر ایسے مسئلے پر اظہارِ خیال کیا جو ایک متجسس ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ جو سوالات انسان کا ذہن پوچھتا ہے ان کے جواب انھیں حدوں کے اندر دئے جا سکتے ہیں جو کسی دَور یا کسی سماج کے گرد حلقہ کئے ہوتے ہیں اور انھیں جوابات یا اظہار خیالات سے انسان کے میلاناتِ ذہنی کا پتہ چلتا ہے۔ یہیں وہ تاریخی جبر بھی سامنے آتا ہے جو انسان کو مادی امکانات کے باہر جانے کی اجازت نہیں دیتا اس میں شک نہیں کہ قوت متخیلہ بہت آزاد قوت ہے۔ لیکن اس کی آزادی بھی فرد کے شعور سے باہر جا کر دم توڑ دیتی ہے کیونکہ فرد کا شعور اس خاص طرح کی پابندیوں کو توڑ نہیں سکتا جو سماج کے مادی ارتقا سے پیدا ہوتی ہیں۔ غالبؔ کے مطالعہ کے دوران میں ایک دلکش حقیقت کی طرف ذہن ضرور منتقل ہوتا ہے کہ گو وہ ہندوستانی سماج کے

دورِ انحطاط سے تعلق رکھتے تھے یعنی ایسے انحطاط سے جو ہر طبقے کو بے جان بنائے ہوئے تھا لیکن ان کی فکر میں توانائی اور تازگی، ان کے خیالوں میں بلندی اور ہیبا کی غیر معمولی طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس توانائی کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اس طبقہ میں اور اس کے نصب العین میں تو ہرگز نہیں ہو سکتا جس سے غالبؔ کا تعلق تھا، پھر اس کی جستجو کہاں کی جائے! کیا یہ سب کچھ تخیلِ محض کا نتیجہ ہے؟ کیا ان کی شاعری کا سارا حُسن ان کے انفرادی بانکپن کا عکس ہے یا غالبؔ انسان سے کچھ اُمیدیں رکھتے تھے اور گو ان کی نگاہوں کے سامنے ان کو جنم دینے والی تہذیب نزع کی ہچکیاں لے رہی تھی جس کے واپس آنے کی کوئی اُمید نہ تھی لیکن وہ پھر بھی نئے آدم کے منتظر تھے جو زندگی کو پھر سے سنوار کر محبت کرنے کے قابل بنا دے۔

غالبؔ کی شاعری کا وہ حصہ جو اُن کی عظمت کا حامل ہے زیادہ تر ان کی فارسی اردو غزلوں میں ملتا ہے۔ اچھا ہو یا بُرا لیکن غزل کی شاعری داخلی اور شخصی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ داخلی کیفیات بھی خارجی ماحول اور اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں اتنی عمومیت پیدا کر دی جاتی ہے کہ داخلیت جن خارجی حقائق کا نتیجہ ہوتی ہے ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غزل کے اشعار میں پیش کئے جانے والے خیالات بھی حقیقتوں کا عکس ہوتے ہیں۔ لیکن اس مخصوص حقیقت کو ڈھونڈ نکالنا بعض اوقات تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے جو اس جذبہ اور خیال کی محرک رہی ہوگی اس لئے غالبؔ کے بہترین خیالات کی بنیادوں کا یقینی علم اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک۔ کہ کوئی واضح اشارہ اس کے متعلق نہ پایا جائے۔ داخلیت اور اشاریت سے حقائق کی شکل بدل جاتی ہے اور یہ چیزیں شاعر کے نظریۂ فن کا جزو بن کر اصل خیال کو اندازِ بیان کے پردوں میں چھپا دیتی ہیں۔ غالبؔ نے تو اسے کھول کر کہہ بھی دیا:۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۔۔۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مطلب ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام ۔۔۔ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

اس طرح غزل کے اشعار سے شعور کے خارجی محرکات پر رائے قائم کرنا صحت سے دُور بھی ہو سکتا ہے تاہم شعر کی فضا اور عام حالات میں ہم آہنگی اور خیالات میں تکرار پائی جائے تو اسے بالکل نظر انداز کر دینا بھی ٹھیک نہ ہوگا کیونکہ غالبؔ کے تشکیل شعور میں جس قسم کے حقائق نے، جس قسم کے سماج نے، جس قسم کی ذاتی الجھنوں نے حصہ لیا ہم اُن سے کسی قدر واقف ہیں اور یہ ہم آہنگی اتفاقی نہیں ہو سکتی۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ ان میں کسی مخصوص کیفیت کا بیان ہے۔ لیکن ان کے لکھنے کا ٹھیک زمانہ معلوم نہیں اس لئے بھی اشعار سے نتائج نکالنے میں غلطی ہو سکتی ہے لیکن ان اشعار سے جو فضا تیار ہوتی ہے اور جس قسم کے حالات کی ترجمانی ہوتی ہے ان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہمیں ان کے لکھنے کی ٹھیک تاریخ معلوم ہو۔ مثلاً غالبؔ کا یہ مشہور شعر ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی　　اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

غدر سے بہت پہلے لکھا گیا لیکن بعض حضرات نے غدر میں بہادر شاہ ظفرؔ پر جو کچھ گذری اس شعر کو اسی کا بیان سمجھا ہے۔ یہ بات درست نہیں لیکن کون ہے جو اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ حالات کو تیزی سے تباہی کی جانب جاتے ہوئے دیکھ کر غالبؔ نے یہ اندازہ لگا لیا کہ اب اس تہذیب کا بجھا ہوا چراغ پھر روشن نہ ہو سکے گا اور یہ شعر اسی قسم کے جذبے کا ترجمان ہے۔ قصائد سے نتیجہ نکالنا ٹھیک نہ ہوگا کیونکہ مبالغہ اور رسمی انداز قصیدے کی روایات میں داخل تھے۔ لیکن غالبؔ کے قصیدوں کی تشبیبیں اکثر ان ذاتی کوائف کا بیان بن جاتی ہیں جنھیں وہ کبھی تاریخی انداز میں اور فخریہ کی شان سے پیش کرتے ہیں۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قصیدوں کی تشبیبیں اصل نظمیں ہیں اور مدح کے اشعار ان کا وہ رسمی ضمیمہ جن سے کام لینا مقصود تھا، غالبؔ نے خطوں میں اپنے قصیدوں کے متعلق تقریباً یہی رائے دی ہے اور اپنے فارسی کلیاتِ نظم کے دیباچہ میں تو اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے، کہتے ہیں کہ میرے دیوان میں ہے کیا، کچھ غزلیں ہیں جن میں "شاہد بازی یعنی ہوا پرستی" ہے اور کچھ

قصیدے ہیں جن میں " تونگرستائی یعنی بادخوانی " ہے۔ یہ لکھ کر وہ خود افسوس کرتے ہیں کہ میں نے خود کو اتنا گرا دیا ہے کہ ہر اورنگ نشیں کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جانا چاہتا ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالب نے اپنی تنقید جو آپ کی ہے وہ ان الفاظ میں ہمیشہ یادگار رہے گی۔

"شادم از آزادی کہ بسا سخن بہ بنجار عشق بازاں گزاردستم و داغم از آزمندی کہ ورقے چند بہ کردار دنیا طلباں در مدح اہل جاہ سیاہ کردستم۔"

اس لئے قصائد کے مدحیہ اشعار پڑھ کر غالب کو خوشامد پسند سمجھنا درست نہ ہوگا؛ ان میں تو حسب رواج بہادر شاہ ظفر کے سے نکمے بادشاہ کی تعریف انھیں الفاظ میں کی گئی ہے جن میں غالب کے پیش روؤں نے اکبر و جہانگیر کا ذکر کیا تھا۔

غالب نے نظم و نثر میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی معلومات محض کتابی نہیں تھیں بلکہ اپنی ذہانت اور ذاتی تجربہ کی وجہ سے وہ قدیم تصورات سے آگے جانا چاہتے تھے، نئی باتوں کو سمجھنا اور نئی انجمنوں سے دلچسپی لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ جب ان کی آخری عمر میں دہلی سوسائٹی قائم ہوئی تو اپنی ضعیفی اور معذوری کے باوجود انھوں نے اس سے دلچسپی لی اور کوشش کی کہ لاہور کی انجمنوں کے متعلق معلومات فراہم کریں ۔ وہ اخبارات پڑھتے اور دنیا کے حالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے اسی وجہ سے وہ اس بات سے واقف تھے کہ اگر بے عملی کی زندگی ختم ہو جائے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ دُنیا امکانات سے بھری ہوئی ہے:-

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسانے ورنہ یاں ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

ہمت اگر بال کشائی کند صعوہ تواند کہ ہمائی کند

نیترِ توفیق اگر بر دمد لالہ عجب نیست کہ اخگر دمد

لیکن وہ جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے وہ انھیں وقت کی حدوں سے باہر نکلنے سے

روگئی تھیں اسی وجہ سے ان کا احساسِ غم شدید ہے اور انفرادی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود وہ مستقبل کی طرف کوئی اشارہ کرنے سے معذور ہیں۔ جو فلسفہ انھوں نے طوسی، بوعلی سینا، غزالی اور صوفی شعرا اور علما سے سیکھا تھا وہ اس بے دلی اور غم کوشی تک ہی رہنمائی کرسکتا تھا، اس سے بدلتے ہوئے اس ہندوستان کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا تھا جو ایک نئے معاشی اور تہذیبی موڑ پر آگیا تھا، اس میں متعین اقدار کی دنیا کو سمجھنے سمجھانے کی باتیں تھیں لیکن عظیم الشان اقتصادی اور اجتماعی انقلاب کا ذکر نہ تھا، اس لئے غالبؔ شاہی اور جاگیردارانہ نظام کو اپنی نگاہوں کے سامنے مٹتے ہوئے دیکھ کر طرح طرح سے متاثر ضرور ہوتے تھے لیکن نہ تو اس کے اسباب کا اندازہ ہی لگا سکتے تھے اور نہ نتائج کا، ان کا ذہن فضا کی ساری مایوسی اور بیدلی کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس بیدلی سے باہر نکلنے کے لئے کوئی راستہ ہے یا نہیں! انسان کی عظمت اور انسان سے محبت، زندگی کے تسلسل اور زندگی سے محبت کے جذبات نے اس زوال پذیر دہلی میں انھیں بڑی الجھنوں میں مبتلا کر دیا اور ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسی غم کا تجزیہ کرنے، اسے بہلانے اور اس کی شاعرانہ توجیہیں پیش کرنے میں صرف ہوگیا ورنہ وہ جانتے تھے کہ منزل یہی نہیں ہے:۔

کعبہ دیدم نقش پائے رہرواں نامیدمش — درسلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن داشتم

اور اُس آسودگیٔ خیال کی منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل راستہ تلاش کرتے رہتے تھے۔

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں — چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رو کے ساتھ

جس فلسفۂ حیات اور نظام اخلاق سے وہ واقف تھے اس میں یہ جُرأت بھی بغاوت کے مترادف تھی کہ کوئی شخص بندھے ٹکے راستوں سے ناآسودہ ہوکر اپنے لئے نیا مسلک تلاش کرے اور عقل سے کام لے کر اچھائی بُرائی کا فیصلہ کرے، معلوم نہیں غالبؔ معتزلہ کے عقلی نقطۂ نظر سے متفق تھے یا نہیں لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ اگر انھوں نے تھوڑا بہت اس سے اثر لیا بھی تھا تو وحدت الوجود کے عقیدے نے اسے دبا دیا تھا کیونکہ وہ جبر کے قائل بھی معلوم

ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ جبرِ زوال سے باہر نہ نکل سکنے اور کوئی راستہ نہ دیکھ سکنے کا نتیجہ ہو۔

مغل دورِ تہذیب صرف ہندوستان ہی کی تاریخ میں نہیں بلکہ تاریخِ عالم میں اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں تعمیر، موسیقی، شعر و ادب، مصوری اور منظم مرکزی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوئی تھیں، عروج کے زمانے میں "ہر گوشۂ بساط" "دامانِ باغبان و کفِ گل فروش" رہ چکا تھا۔ تعیش کی لاتعداد صورتیں فرصت نے پیدا کی تھیں اور جس طبقہ سے غالب کا تعلق تھا وہ نشاطِ زندگی سے بہرہ ور تھا۔ لیکن جب حالات بدل گئے تو یہ احساس ہوا کہ:۔

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب — اس رہ گذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

وہ دور مٹ رہا تھا اور اسے پھر سے زندہ کرنا ناممکن تھا۔

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے

متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اس شعر میں کھوئی ہوئی دنیا کی تلاش کا جذبہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس یقین کا احساس ہے کہ اب وہ عیشِ رفتہ واپس آنے والا نہیں ہے یہ یقین بار بار مختلف اشعار میں ظاہر ہوا ہے:۔

گھر ہمارا جو نہ روتے تو بھی ویراں ہوتا — بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولےٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

تعمیر اور تخریب، کا یہ نیم جدلیاتی تصور زبردست مشاہدے کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے لیکن یہ چیز غور کرنے کی ہے کہ غالب کا ذہن تعمیر کے بعد تخریب کو دیکھ لیتا تھا، ترقی کے بعد زوال کا اندازہ کر لیتا تھا لیکن تخریب کے بعد تعمیر اور زوال کے بعد نئی ترقی کا تصور نہیں کر سکتا تھا، اس کے اسباب بھی اس دور کی مٹتی ہوئی قدروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ورنہ غالب تو آدم کے بعد نئے آدم اور قیامت کے بعد نئی دنیا کی پیدائش کے قائل تھے:۔

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ بادیاں

منظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

یہ خیالات جہاں ایک طرف ان تاریخی حقائق کی جانب اشارہ کرتے ہیں جو غالبؔ کے دور کو یقینی بربادی کی طرف لئے جا رہے تھے وہاں دوسری طرف تعمیری نقطۂ نظر کے فقدان کا بھی پتہ دیتے ہیں۔ اور اس "حسرتِ تعمیر" کا معنی خیز غم آخر وقت تک غالبؔ کے ساتھ رہا جو دل ہی میں رہا۔ ایسا عبوری دَور جس کا مستقبل دھندلکے میں ہو بے یقینی پیدا کرتا ہے اور خود اپنی ہستی کے متعلق شک پیدا ہونے لگتا ہے۔ غالب اس شک کا مسلسل شکار ہوتے رہے لیکن وحدت الوجودی ہونے کی وجہ سے ان کا یہ شک تصوف کا مابعد الطبیعیاتی لبادہ اوڑھ لیتا ہے اور زندگی کے لایعنی ہونے کا یقین پیدا کر دیتا ہے لیکن اس مسئلہ پر زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ خواہش مرگ اور تمنائے زندگی کی متضاد کیفیات پہلو بہ پہلو ملتی ہیں۔ حیات اور موت ایک دوسرے میں گتھی ہوئی ہیں۔ اگر کسی کا طبقاتی شعور بیدار ہو تو اس کے یہاں یہ دونوں چیزیں ملائی نہیں جا سکتیں۔ جب کوئی طبقہ مٹنے کے قریب ہوتا ہے تو اس سے وابستہ رہنے والے اس اُلجھن میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب اپنے طبقے کی بے عملی اور مردہ دلی سے اُکتا چکے تھے لیکن اس سے رشتہ توڑ لینا ان کے لئے ممکن نہ تھا تاہم یہ تو وہ ظاہر ہی کر دیتے ہیں کہ ان کے دل میں جو کچھ ہے وہ کھل کر نہیں کہہ سکتے۔ تنہائی اور اجنبیت کا احساس بھی اسی جذبہ کی غمازی کرتا ہے۔

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

کس زبان مرا نمی فہمد بہ عزیزاں چہ التماس کنم

بیا ور ید گر اینجا بود زباں دانے　　　غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا گلہ　　　دل فرد جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اگر غالب نے آنکھیں بند کر کے وہی راہ اختیار کر لی ہوتی جو روایتی شاعری پیش کرتی ہے تو انھیں اس کش مکش کا سامنا نہ کرنا پڑتا لیکن ان کے اندر جو انفرادی کرید تھی جو کبھی کبھی انھیں تشکیک، نراج اور لاشیئت کے قریب پہنچا دیتی تھی وہ انھیں روایتوں کے توڑنے پر اکساتی رہتی تھی (اس کا ذکر میں اپنے ایک مضمون "غالب کی بت شکنی" میں کسی قدر تفصیل سے کر چکا ہوں) یہاں تک کہ رسم پرستوں اور روایت دوستوں کی دنیا میں وہ اپنے کو تنہا محسوس کرنے لگتے تھے۔ اور وہ لوگ جو اُن کے گرد و پیش تھے ان کے دل کی واردات کو سمجھنے کے ناقابل نظر آنے لگتے تھے۔ اور ان کے لئے زبان کھولنے اور ان سے ہمدردی کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

چہ ازیں فرقۂ ادا نشناس　　　خویشتن را ہلاک یاس کنم

اس میں شک نہیں غالب نے ان اخلاقی قدروں کی بہت کچھ پابندی کی جو ایسے تمدن میں پسندیدہ کہی جا سکتی تھیں لیکن ان کا مطالعہ بھی غور سے کیا جائے تو وہ پہلو زیادہ نمایاں نظر آئیں گے جن سے انسان کی عظمت میں اضافہ ہوتا ہے اور فرد کی شخصیت بے پناہ کشش کی حامل بنتی ہے۔ غالب کے سوانح نگاروں نے واقعاتِ زندگی اور اشعار کی روشنی میں اس پہلو پر کافی لکھا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اخلاق پر بھی انھیں خیالات اور واقعات کو پیش نظر رکھ کر نگاہ ڈالی جا سکتی ہے۔ جو دوسرے تہذیبی محرکات کی بنیاد تھے کیونکہ اخلاقی مظاہر کی نوعیت بھی طبقاتی ہوتی ہے۔ غالب اخلاقی معاملات

میں اپنے طبقہ کی پوری نمائندگی کرتے ہیں ۔ لیکن ان کی تخلیقی ذکاوت اور فطری شگفتگی اخلاقی قدروں میں عمومی رنگ پیدا کر دیتی ہیں ، پھر ان سب پر بالا ہیں ان کی دل سوزی رواداری ، بے تکلفی اور انسان دوستی ۔ محمد اکرام نے غالب کے ایک اردو خط سے چند سطریں پیش کی ہیں جن کا دہرانا نامناسب نہ ہوگا ۔

"قلندری و آزادگی وایثار و کرم کے جو دعادی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں ، بقدرِ ہزار ایک ظہور میں نہ آئے ، نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں ، کبھی شیراز جا نکلا ، کبھی مصر میں جا ٹھہرا ، کبھی نجف جا پہنچا ، نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی ، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو ننگا بھوکا نظر نہ آئے ۔ خدا کا مقہور ، خلق کا مردود ، بوڑھا ، ناتواں بیمار فقیر ، نکبت میں گرفتار ۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو ، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے ۔ اور خود در بدر بھیک مانگے ، وہ میں ہوں ۔"

غالب عالم خیال کے بسنے والے تھے اور خلوت کو انجمن بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ لیکن انھوں نے کاروبارِ زندگی کی طرف سے اپنی آنکھیں بند نہیں رکھی تھیں غم روزگار کی اس حقیقت سے واقف تھے جو غم عشق کو دبا کے رکھ دیتا ہے وہ تجربہ گاہ عالم کو نظر انداز نہیں کرتے تھے :۔

اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلئ استاد نہیں

لیکن دشواری یہ تھی کہ آگے کی راہ غالب کے لئے روشن نہ تھی اور خیالوں

ہی میں ساری راہیں طے کرنا پڑتی تھیں اس "سعی بے حاصل" کا احساس بھی انھیں شدت کے ساتھ تھا۔

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں
جادہ غیر از نگہ دیدۂ تصویر نہیں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالب کا مطالعہ جتنا کیا جائے یہ حقیقت راسخ ہوتی جاتی ہے کہ وہ اپنے دور سے غیر آسودہ تھے۔ اُس کی تباہی اور بربادی کو یقینی جانتے تھے۔ لیکن تاریخی اور معاشی شعور کے فقدان کی وجہ سے نہ تو وہ اس انحطاط کے اسباب سے واقف تھے اور نہ آگے کی راہ سے، اس لئے ماضی کا ذکر کبھی کبھی انھیں تسکین دیتا تھا۔ وہ غزل جس کا مطلع ہے ؂

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

نہ پوری ہونے والی آرزوؤں کی آخری ہچکی اور بیتے دنوں کی آخری یاد معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہاریں اب کبھی دیکھنے میں نہ آئیں گی! یہ تمنائیں اب کبھی پوری نہ ہوں گی۔ گو غالب ان لوگوں میں سے تھے جو غم کے متعلق کہہ سکتے تھے کہ :۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب غم کے بعد خوشی بھی اپنا جلوہ دکھائے اور جب مسلسل غم ہی غم ہو تو بجلی سے چراغ نہیں جلتے، گھر میں آگ لگ جاتی ہے اور انسان "نومیدیٔ جاوید" کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غیر معمولی جد وجہد

اور ذہنی کش مکش کے باوجود غالب کو یہ کہنا پڑا کہ :-

صد قیامت در فراق دہر نفس خوں گشتہ است

من زخامی در فشار بیم فردا ایم ہنوز

شد روز رستخیز دیہ یاد شب وصال

محوم ہماں بہ لذت بیم سحر ہنوز

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک

آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

اور مسلسل ناکامیوں کے بعد یہ اعترافِ شکست ۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

غالب کا یہ اعتراف شکست اس نظام کی شکست کا اعلان بھی ہے ۔

بہرحال غالب کی شاعری اپنے سارے غم واندوہ کے باوجود ہمارا قیمتی تہذیبی سرمایہ ہے جس میں غالب کی شخصیت کی رعنائی نے اور زندگی سے رس نچوڑنے، آلام روزگار سے ٹکر لینے کی مسلسل کوشش نے توانائی پیدا کر دی ہے، گویہ شاعری ایک تہذیب کے عالم نزع میں پیدا ہوئی لیکن اس ولولے اور حوصلے سے حسین اور جاندار بن گئی ہے :-

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم　　　قضا بہ گردشِ رطل گراں بہ گردانیم

بگوشۂ بہ نشینیم و در فراز کنیم　　　بہ کوچہ بر سر رہ پاسباں بگردانیم

اگر ز شحنۂ بود گیر و دار نہ اندیشیم　　　دگر ز شاہ رسد ارمغاں بہ گردانیم

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نہ کنیم　　　دگر خلیل شود میہماں بہ گردانیم

گل افگنیم وگلابے بہ رہ گزر پاشیم — مے آوریم و قدح درمیان بگردانیم
زجوش سینہ سحر را نفس فرو بندیم — بلائے گرمی روز از جہاں بگردانیم
بہ جنگ باج ستانان شاخساری را — تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم
بہ صلح بال فشاناں صبح گاہی را — ز شاخسار سوئے آشیاں بگردانیم

سب کے ساتھ مل جل کر نظامِ کائنات کو بدل دینے کی یہ خواہش، زندگی کی یہ تڑپ اور یہ حسن، یہ خوبصورت ارادے اور یہ منصفانہ عزائم کسی شاعری کو زندۂ جاوید بنانے کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ فنونِ لطیفہ کا ذکر کرتے ہوئے لینن نے کلارا انڈکن سے کہا تھا کہ خوبصورت چیزوں کو چاہے وہ پرانی ہی کیوں نہ ہوں ہمیں محفوظ رکھنا چاہیئے۔ اب رہیں غالبؔ کے حقائق کو سمجھنے کی کوششیں اور ان کی خامیاں، وہ ان کے طبقے اور ان کے دور کی خامیاں بھی ہیں جن میں پھنس کر وہ محض تخئیل کی قوت سے باہر نکلنے کی کوشش کر سکے۔ ان کے یہاں تضاد ہے لیکن ایسا فلسفہ جو تضاد سے خالی ہو محض غیر طبقاتی اشتراکی سماج میں جنم لے سکتا ہے۔ تاریخ مجموعی طور پر جس طرف جا رہی تھی۔ غالبؔ کے یہاں اس کی سمت اشارے ہی نہیں ملتے اس کا خیر مقدم بھی ہے۔ اس بدلتی ہوئی دنیا کا تھوڑا بہت عکس ان کے یہاں ضرور ملتا ہے جو ابھی کوئی شکل اختیار کر کے وجود میں نہیں آئی تھی —— پھر شاعر، اور ہندوستانی تہذیب کے ایک زوال پذیر عہد کے شاعر ہونے کی حیثیت سے غالبؔ کی انفرادیت میں جو گرمی اور بت شکنی کا انداز ہے اسے بھی دیکھنا ہوگا۔ ایک موقع پر دنیا کے سب سے بڑے انقلاب پسند لیننؔ نے بھی شاعروں کو یہ کہہ کر "چھوٹ" دی تھی کہ:۔

"اس میں شک نہیں کہ ادبی تخلیقات سب سے کم کسی معیار کی میکانکی ناپ تول کی متحمل ہو سکتی ہیں اس میں بھی شک نہیں کہ ادبی کاموں کے لئے یہ بات قطعی لازمی ہے کہ انفرادی تخلیقی عمل اور شخصی رجحانات، سرمایۂ

تخئیل اور سواد و ہیئت کے وسیع ترین استعمال کا موقع فراہم کیا جائے "

اس لئے کسی سماج میں جو زندگی کے سمجھنے کی کوششوں کو قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے غالب کی عظمت کم نہ ہوگی اور ان کی شاعری کو کسی پیمانے سے بھی ناپا جائے ذہنِ انسانی کے تخلیق کردہ اس ادبی منارے کی بلندی پستی میں تبدیل نہ ہوگی۔

اردو ادب (علیگڈھ)

جولائی

ڈاکٹر سلامت اللہ

ترقّی پسند ادیب اور سیاست

ادب کا سیاست سے کیا تعلق ہے؟ ترقّی پسند ادب کی خصوصیات کیا ہیں؟ ترقی پسند ادیب کو سیاست میں حصّہ لینا چاہیئے یا نہیں؟ وغیرہ ایسے سوالات ہیں جو کوئی پچھلے بیس سال سے ہمارے ہاں برابر اُٹھتے رہے ہیں۔ لیکن ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد ان سوالوں کی اہمیّت بہت بڑھ گئی ہے جب کہ "ماؤنٹ بیٹن ایوارڈ" کے مطابق ہندوستان کے دو ٹکڑے کر کے اُنھیں ڈومنین کا درجہ دے دیا گیا اور کانگرس اور مسلم لیگ کے رہنماؤں نے کہ جن کو حکومت سونپ دی گئی تھی یہ اعلان کر دیا کہ اب ہند اور پاکستان آزاد مملکتیں ہیں اس دوران میں یہ سوال نہ صرف زیادہ شدّت سے اُٹھائے گئے ہیں بلکہ ان میں کچھ اُلجھنیں بھی پیدا کی گئی ہیں۔ ان الجھنوں کی نوعیت اور اسباب کا سمجھنا ہمارے لیئے بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم کسی معقول اور کار آمد حل کی طرف قدم نہیں بڑھا سکتے۔

قومی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ہمیں ادب کے میدان میں بھی دو متصادم گروہ منظر آرہے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ ادب کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے۔ سیاست نہ صرف آنی جانی چیز ہے بلکہ گھٹیا بھی ہے۔ وہ سیاسی

رہناؤں کی متلوّن مزاجی کی وجہ سے ہردم اپنا رُخ بدلتی رہتی ہے۔ اور ادب اقدارِ مطلق کا حامل ہے اس لئے اگر ادب کو سیاست کا تابع بنایا جائے گا تو وہ اپنا اصل جوہر کھو بیٹھے گا اور سیاست کی کثافت میں پھنس کر اس کا حسین چہرہ مسخ ہوجائے گا۔ یہ لوگ "ادب برائے ادب" کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک "اقدارِ مطلق" زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہیں۔ جیسے ان کا مادّی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہر زمانہ میں اور ہر جگہ مسلمات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ آفاقی ادب کے علم بردار دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے شاہکار عالمگیر انسانی خصوصیات مثلاً عشق و محبت، انسانیت و شرافت، حسد و منافرت، حیوانیت و خباثت وغیرہ کے مظہر ہیں۔ اور وہ انسانی سیرت کی خوبیوں اور خامیوں کے مقابلہ کے ذریعہ ایک مکمل انسان کا آدرش پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ادیبوں کا یہ حلقہ موجودہ سماجی حالات کو بدلنے میں مدد نہیں دیتا۔ موجودہ صورت حال کو بدلنے کی ضرورت سے تو شاید یہ بھی انکار نہ کریں گے کہ جس میں انسانوں کی بہت بڑی اکثریت عرق ریزی کے باوجود طرح طرح کی مصیبتوں اور الجھنوں کا شکار رہے اور مٹھی بھر لوگ بغیر محنت مشقت کئے عیاشی کر رہے ہیں۔ اس کھلی ہوئی ناانصافی کا اعتراف ہر حساس شخص کرے گا۔ لیکن اس ناانصافی کو مٹانے میں ادب کی مدد لینا سیاست کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس لئے ادب کو سیاست سے الگ رکھنے والے ادیب عملاً موجودہ صورت حال کو قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں:

دوسرا گروہ ان ادیبوں کا ہے جو اس بات سے تو انکار نہیں کرتے کہ ادب کا سیاست سے تعلق ہے۔ لیکن وہ کسی مخصوص سیاسی جماعت سے وابستہ ہونا ادب کے حق میں مُضر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادب کو سماج کے بدلنے اور بنانے کے کام میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں کسی ایک سیاسی جماعت کے نظریات کی پابندی ضروری نہیں ہے۔ ان کا مشورہ ہے کہ مُصنف کو ضبط و احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

یہ لوگ دراصل ان قوتوں سے ٹکر لینے سے اپنی ذات کو بچانا چاہتے ہیں جو موجودہ صورتِ حال کی دراصل ذمہ دار ہیں، لیکن جن کے پاس قضا و قدر کی بے پناہ قدرت موجود ہے۔ ان کی نگارشات میں اکثر سماج کے موجودہ امراض کا ذکر ہوتا ہے اور اس حد تک وہ پڑھنے والوں کو متاثر بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان میں ان امراض کا صحیح علاج نہیں ملتا۔ یا اگر اس کا ذکر ہوتا بھی ہے تو ایسے گول مول الفاظ میں یا اتنے اُلجھے ہوئے انداز میں کہ اس سے عوام کی عملی رہنمائی نہیں ہوتی۔

تیسرا گروہ ان لکھنے والوں کا ہے جو صرف اس بات کا اعلان کرنا کافی نہیں سمجھتے کہ ادب کا سیاست سے تعلق ہے۔ بلکہ وہ اس سیاست کی وضاحت بھی کرتے ہیں جسے وہ اپنے ادب کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں وہ سیاست کے میدان میں کھلے بندوں اپنی جانبداری کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ اس جماعت کے ساتھ ہیں جو مزدور اور محنت کش طبقہ کے اقتدار کے لئے جد وجہد کر رہی ہے۔

یہ ادیب اپنی نگارشات کو براہِ راست عوامی جد وجہد کا ایک موثر ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے ہاں خیال اور عمل میں یک رنگی اور یگانگت پائی جاتی ہے۔ وہ نہ صرف عوامی جد وجہد کو اپنی تصنیفات کے ذریعہ آگے بڑھاتے ہیں بلکہ اس جد وجہد میں عملی طور پر بھی حصہ لیتے ہیں۔ اس طرح وہ نئے سماج کے بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

ان کے برعکس چوتھا گروہ ان لیکھکوں کا ہے، جو موجودہ نظام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں جس کی بُنیاد لُوٹ کھسوٹ پر ہے، اس لئے کہ وہ خود اسی لُوٹ کھسوٹ پر پلتے ہیں یہ لوگ بھی اپنے ادب کی بنیاد سیاست پر قائم کرتے ہیں۔ لیکن ان کی سیاست استحصالی طبقہ کی سیاست ہے۔ یہ بڑی بے باکی کے ساتھ موجودہ سماج کے گن گاتے ہیں۔ اور تمام عوامی تحریکوں کی ہر ممکن طریقہ سے مخالفت کرتے ہیں۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ادیبوں کے ان چاروں گروہوں میں سے ہر ایک

بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی نہ کسی قسم کی سیاست کا حامی ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ بعض ادیب اپنی سیاست کا اقبال نہیں کرتے یا انھیں واضح طور پر اس کا احساس نہیں ہے کہ وہ بھی ایک خاص قسم کی سیاست کے ساتھ وابستہ ہیں، جو ایک مخصوص طبقہ کو فائدہ پہنچاتی ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک ایسے سماج میں جس کی بنیاد طبقات پر قائم ہے جس میں ایک طبقہ کا سُود دوسرے کا زیاں ہے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی سیاست سے اپنے دامن کو بچا سکے۔ کیونکہ "سیاست" اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ سماج کی اقتصادی کیفیت کا پُرزور انداز میں اظہار ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس ادب کو ہم ترقی پسند کہیں گے اور کس کو غیر ترقی پسند۔ ترقی پسند ادیب صرف وہی ہے جو ترقی پسند سیاست کا حامل ہے۔ اور ترقی پسند سیاست زمان و مکان کی قیود سے کوئی بالاتر چیز نہیں ہے۔ کسی خاص دَور میں کِسی مخصوص ملک یا خطّہ کے جو سماجی حالات ہوتے ہیں، ان کی بُنیاد پر ہی ترقی پسند سیاست کی حدُود متعین کی جا سکتی ہیں۔ یوں تو عام اُصول کے طور پر کہا جا سکتا ہے، کہ جو سیاست زیادہ بھرپور زندگی کا راستہ دکھاتی ہے اور اس پر آگے بڑھنے کے لئے اُبھارتی ہے وہ ترقی پسند سیاست ہے۔ لیکن بھرپور زندگی کے کیا معنی ہیں اس کا تعیّن کرتے وقت ہمیں ملک کے سماجی حالات یعنی پیداواری قوتوں اور ان کی پختگی کی منزل کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ کوئی ایک سیاسی نظریہ ہر ملک اور قوم کے لئے یکساں طور پر ترقی پسند نہیں ہو سکتا۔ ایشیا کے محکوم اور نیم محکوم ممالک کے لئے جو سیاست ترقی پسند سمجھی جائے گی، ضروری نہیں کہ وہ یورپ کے صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ممالک کے لئے بھی ترقی پسند ہو۔

اس بُنیادی بات کو ٹھیک طرح نہ سمجھ سکنے کی صورت میں بڑی خطرناک غلطیاں

ہوسکتی ہیں۔ چنانچہ ہماری انجمن ترقی پسند مصنفین بھی پچھلے تین سال کے عرصے میں اس قسم کی غلطیوں سے دوچار ہو چکی ہے۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو ہمارے دیس میں جو تبدیلی ہوئی اس سے ہم یہ سمجھ بیٹھے کہ برطانوی سامراج نے ہند اور پاکستان کی حکومت کی باگ ڈور یہاں کے سرمایہ دار طبقہ کے ہاتھ میں دے دی ہے اور یہاں کا سرمایہ دار طبقہ اپنے مفاد کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے لئے سامراجیوں سے سازباز کر رہا ہے۔ اور اسی لئے وہ ملک کے اندر بڑھتی ہوئی عوامی تحریکوں کا سر کچل رہا ہے اور بین الاقوامی میدان میں اینگلو امریکن سامراجیوں کے دُم چھلّہ کی حیثیت سے عمل کر رہا ہے۔ یعنی اس کے معنی یہ تھے کہ ہم نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ہمارے ہاں بورژوا جمہوری انقلاب مکمل ہو چکا ہے۔ اس لئے اب ہمیں یہاں کے پورے سرمایہ دار طبقہ اور اس کے ساتھیوں کے خلاف لڑ کر سوشلسٹ انقلاب کی طرف قدم بڑھانا ہے۔ چنانچہ مزدور تحریک میں اتنی شدت پیدا ہو گئی کہ عوام اس کا ساتھ نہ دے سکے اور ہمارے انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی اس کا یہ اثر ہوا کہ بجائے وسیع ہونے کے یہ سکڑنے لگی۔ برسرِ اقتدار طبقہ اور اس کے حاشیہ نشین دانشوروں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر یہ پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ ہماری انجمن خالص کمیونسٹوں کی انجمن ہے۔ اور جو ادیب کمیونسٹ پارٹی کی موجودہ پالیسی سے متفق نہیں ہے وہ انجمن کے اندر نہیں رہ سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے بہت سے وہ ساتھی بھی جو ادبی میدان میں محنت کش طبقہ کی سیاست کے حامل تھے ـــ حکومت کے تشدد اور سخت گیری کے ڈر سے ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔

ہند اور پاکستان کے سیاسی رُتبہ کا یہ تجزیہ سراسر غلط تھا۔ ہندوستان میں ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو جو واقعہ پیش آیا، اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ برطانوی سامراج نے ملکی اور بین الاقوامی حالات سے مجبور ہو کر براہِ راست حکومت کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ ہندوستان کی لوٹ کھسوٹ مقامی بڑے بڑے سرمایہ داروں

کی مدد سے کی جائے۔ پچھلی عالمگیر جنگ کے بعد ہندوستان میں بھی دوسرے محکوم اور نیم محکوم ممالک کی طرح عوامی تحریکیں جارحانہ شکل اختیار کر رہی تھیں، اور ان کی شدت اور وسعت دن بدن بڑھ رہی تھی۔ نیز ان کی رہنمائی کانگرس اور مسلم لیگ کی لیڈرشپ کے بجائے مزدوروں کی انقلابی جماعت کر رہی تھی۔ ان تحریکوں کے زور اور مقبولیت کا اندازہ بمبئی کے جہازی بیڑے کے ملاحوں کی ہڑتال آئی۔ این۔ اے ڈے اور یوم رشید کے مظاہروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ صورت حال برطانوی سامراج اور ہندوستان کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے لئے بہت خطرناک تھی۔ دوسری طرف جنگ نے برطانوی قوت کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں سوویت یونین کی رہنمائی میں مختلف ملکوں میں سوشلزم کی فتح ہو رہی تھی۔ ان حالات سے برطانوی سامراج کا دہشت زدہ ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ اس صورت میں اس کی دانشمندی تھی کہ اس نے ہندوستان کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو اپنے ساتھ ملا کر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

مگر یہ آزادی کیسی تھی؟ اس کا اندازہ بعد کے حالات سے لگایا جا سکتا ہے ہند اور پاکستان دونوں اب بھی برطانوی دولت مشترکہ کے اندر موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ برطانوی سامراج کی لوٹ کھسوٹ بدستور جاری ہے۔ اور ہماری معاشی بدحالی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنے ملک میں بنیادی صنعتیں قائم کرنے کا مسئلہ التوا میں ڈالا جا رہا ہے۔ کیونکہ برطانوی مفاد کو برقرار رکھنا بہرکیف ضروری ہے۔ اور اب چونکہ برطانیہ امریکی سامراج کا دست نگر ہے۔ اس لئے ہند اور پاکستان کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ میں امریکہ بھی شامل ہو رہا ہے۔ اینگلو امریکی سامراج کے سامنے ہند اور پاکستان کی حکومتوں کی نیازمندی دن بدن بڑھ رہی ہے۔ جس کا ثبوت ان سرکاری اعلانوں اور معاہدوں میں ملتا ہے، جو بیرونی سرمایہ کے ہند اور پاکستان میں لگائے جانے سے متعلق کئے جا رہے ہیں، جن میں اس بات کا یقین دلایا جا رہا ہے۔ کہ ابھی بہت عرصہ تک بڑی

صنعتوں کو قومی ملکیت نہیں بنایا جائے گا نیز بیرونی سرمایہ کی حفاظت اور اس کے منافع کی ضمانت کے لئے مناسب لیبر قانون وضع کئے جائیں گے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں مزدوروں کی اجرتوں میں کمی کرکے بدیسی سرمایہ داروں کی تھیلیوں کو بھرا جائیگا اور ہڑتال کرنے کے جمہوری حق کو سلب کر دیا جائیگا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے منصوبوں سے ہندوستان کے صرف ان چوٹی کے چند سرمایہ داروں کو فائدہ ہو سکتا ہے جو چھوٹے ساجھی دار کی حیثیت سے اس سامراجی لوٹ کھسوٹ میں حصہ لیں گے باقی ہر طبقہ کو خسارہ رہے گا۔ اور وہ معاشی بدحالی کا شکار بنے گا۔

صرف ہندوستان ہی کا نہیں تمام محکوم اور غیر محکوم ممالک کا یہی حال ہے لہذا ان ممالک میں نام نہاد آزادی کا پردہ فاش کرنا اور اس سچی آزادی کے لئے لڑنا ان تمام طبقوں کا کام ہے جو سامراجی چکی میں پس رہے ہیں۔ ظاہر ہے اس آزادی کی جنگ کا مورچہ بہت وسیع ہوگا۔ اس میں مزدور بھی ہوں گے اور کسان بھی، متوسط طبقہ کے لوگ بھی ہوں گے اور چھوٹے موٹے سرمایہ دار بھی جن کو موجودہ سامراجی دیو ہڑپ کر رہے ہیں۔ یہ متحدہ مورچہ نظریاتی لحاظ سے صرف مزدور طبقہ کی رہنمائی میں بن سکتا ہے اور قومی آزادی کی جدوجہد میں آگے بڑھ سکتا ہے۔ کیونکہ اب ہند اور پاکستان کے بڑے بڑے سرمایہ داروں نے سامراج کے ساتھ ساز باز کر لی ہے۔ اور وہ ان کے حاشیہ نشین کی حیثیت سے موجودہ نام نہاد آزادی کی آڑ لے کر سامراجی لوٹ کھسوٹ میں حصہ لے رہے ہیں۔ اس صورتِ حال میں قومی آزادی کی تحریک کی رہنمائی صرف مزدور طبقہ ہی کر سکتا ہے۔ جو کہ اس جدوجہد میں استقلال کے ساتھ آخر تک انقلابی رہے گا۔ یہ بات چین، انڈوچائنا، ملایا اور برما کی حالیہ تاریخ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ کہ قومی آزادی کا یہ متحدہ مورچہ سامراجی قوتوں اور ان کے دیسی ایجنٹوں یعنی بڑے بڑے

سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور زمینداروں کے خلاف ہوگا ـــــ جو اپنے ذاتی مفاد کی خاطر قوم کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔

سیاسی لحاظ سے دیکھئے، تو ہند اور پاکستان کی حکومتیں آج اینگلو امریکی سامراج کے کیمپ میں شامل ہیں۔ یہ حکومتیں نہ صرف اپنے اپنے ملک میں عوامی تحریکوں کو دبا رہی ہیں۔ بلکہ جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں قومی آزادی کی جد وجہد کو ختم کرنے میں سامراجیوں کی براہِ راست مدد کر رہی ہیں۔

پھر کشمیر کے معاملہ میں تو ہند اور پاکستان کی حکومتیں صاف صاف اینگلو امریکی سامراج کی ریشہ دوانیوں کا شکار بنی ہوئی ہیں۔ سویت یونین اور چین پر حملہ کرنے کے لئے سامراجیوں کے نزدیک کشمیر بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے انھوں نے پہلے تو سازش کر کے ان دونوں ملکوں کو آپس میں لڑا دیا۔ اور اب اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس معاملہ کو اس طرح "سلجھایا" جائے کہ یہ دونوں حکومتیں سامراجیوں کو وہ علاقہ سونپ دیں جو جنگی نقطۂ نظر سے ان کے نزدیک اہم ہے۔ ہند اور پاکستان کا کروڑوں روپیہ اور ہزاروں آدمی کشمیر کی لڑائی میں ضائع ہو چکے ہیں اور اب بھی اس سلسلے میں بہت سا غیر ضروری خرچ ہو رہا ہے۔ نیز اس کی وجہ سے دونوں ملکوں کے باہمی تعلقات بہت کشیدہ ہو گئے ہیں۔ اس لئے امن کا مسئلہ بھی ہمارے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور ہماری قومی آزادی کی لڑائی لازمی طور پر اس جد وجہد کا ایک حصہ ہے۔ جو تمام دنیا کے نیک نیت انسان آج تیسری جنگ کے خلاف اور دائمی امن کے لئے کر رہے ہیں۔

ایک اور لحاظ سے سامراج ہماری زندگی پر اثر انداز ہو رہا ہے اور ادیب کے ناطے سے وہ ہم سے براہ راست متعلق ہے۔ سامراج کی آئڈیولوجی بیماری کے جراثیم کی طرح ہماری تہذیبی زندگی کے رگ وپے میں سرائت کر رہی ہے۔ یہ نظریات

مختلف وسائل سے ہمارے ہاں لائے جا رہے ہیں۔ اب صرف سامراج پرست مصنفوں کی کتابیں اور رسالے ہی ان خطرناک نظریات کو نہیں پھیلاتیں بلکہ بعض لطیف طریقے عمل میں لائے جا رہے ہیں۔ ہولی وڈ کی فلموں کا چرچا بڑھ رہا ہے۔ بمبئی کے میئر پاٹل جیسی ممتاز ہستیاں اس مہم میں آلہ کار کی حیثیت سے پیش پیش ہیں۔ ہند اور امریکہ کے درمیان تہذیبی تعلقات قائم کرنے کے لئے بھانت بھانت کی انجمنیں وجود میں آ رہی ہیں جن میں بیک وقت دونوں ملکوں کے پروفیسر، ادیب اور بڑی بڑی صنعتوں کے مالک شرکت کرتے ہیں۔

سامراجی یورش کا یہ پہلو زیادہ خطرناک اور مضر ہے کیونکہ عام طور پر لوگ اسے محسوس نہیں کر سکتے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سامراجی پروپیگنڈے کے ذریعے ہمارے ذہنوں کو مسموم کر دیا جائے تاکہ ہمارے سوچنے اور کام کرنے کے طور وطریق ایسے ہو جائیں جو سامراجی اغراض کے لئے موافق ہوں۔ اور ہماری قومی تہذیب اپنی جڑوں سے کٹ کر ان ہی کے رنگ میں رنگ جائے۔ برطانوی سامراج کی ہندوستان میں تعلیمی پالیسی کا جو مقصد تھا وہ آج نئے طریقوں سے پورا کیا جا رہا ہے اور اب اس میں امریکی سامراج پیش پیش ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا حالات کی روشنی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پالیسی کیا ہونی چاہیئے اور اس کی تنظیم از سر نو کیسے کرنی چاہیئے۔

ملک کی خوشحالی اور تہذیبی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے مادی وسائل میں اضافہ ہو، صنعتی اور زرعی ترقی ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہم ان عناصر کو معطل نہ کر دیں جو ملک کی صنعتی اور زرعی ترقی میں روڑا اٹکا رہے ہیں۔ یہ عناصر جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے اینگلو امریکی سامراج اور ان کے دیسی پیرو یعنی بڑے بڑے سرمایہ دار اور بچے کھچے جاگیردار اور زمیندار ہیں جن کی وجہ سے نوآبادیاتی اور نیم جاگیرداری حالات اب تک قائم ہیں۔ ان عناصر کے خلاف قومی آزادی کی جدوجہد برابر جاری رہے گی۔

جب تک کہ ان پر پورے طور پر فتح حاصل نہ ہو جائے اور ایک نئی جمہوریت کے قیام کے لئے موزوں حالات پیدا نہ ہو جائیں۔

ہمارے ملک میں یہ نئی جمہوریت سوشلزم کے پہلے کی ضروری منزل ہے۔ یہ عوام کے اس متحدہ محاذ کی عملی شکل ہے جس میں مزدور کسان متوسط طبقہ اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار سبھی شامل ہوں گے اور جس کی نظریاتی قیادت مزدور طبقہ کے ہاتھ میں ہوگی۔

اس جمہوری محاذ میں دانشوروں اور تہذیبی کارکنوں کا بہت اہم درجہ ہے وہ اس محاذ کو تعمیر کرنے اور مضبوط بنانے میں بہت مفید کام کر سکتے ہیں۔

ترقی پسند ادیبوں کو اپنے فرائض کا تعین اسی بڑے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے کرنا چاہیئے۔ ہمیں اپنے حلقے کو ان تمام عناصر کی رو سے وسیع کرنا چاہیئے۔ جو نظریاتی لحاظ سے اپنے ملک کو سامراج واد سے دور رکھنا چاہتے ہیں یعنی جو اینگلو امریکی سامراج کے مخالف ہیں اور ہندوستان کے برطانوی دولت مشترکہ سے ناطہ توڑنے پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ اور وجوہ کے علاوہ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، مصنف کے مخصوص کام کے لئے یہ ازبس ضروری ہے اس لئے کہ تخلیقی کام کے لئے جس قسم کی فضا درکار ہے وہ سامراجی اقتدار کے ماتحت حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں تجربہ بتاتا ہے کہ ہمارے ہاں پچھلے دنوں کس طرح شہری حقوق پامال کئے گئے ہیں اور اظہارِ خیال کی آزادی کو سلب کیا گیا ہے۔ ان حقوق اور آزادیوں کے لئے جدوجہد کرنا سامراج دشمنی کی دلیل ہے۔

امن کے لئے جدوجہد بھی سامراج دشمنی کے ساتھ وابستہ ہے۔ امن بہرکیف ہر قسم کے تخلیقی کام کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے انجمن ترقی پسند مصنفین کو امن عالم کی تحریک میں دلچسپی لینا چاہیئے۔ ہمارے ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی توجہ کو خاص طور پر ہند اور پاکستان کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنانے پر مرکوز کریں اور دونوں جگہ جنگ کی فضا کو ختم کرنے میں مدد دیں۔

ان شرائط کو سامنے رکھتے ہوئے تمام ادیب، دانش ور اور پڑھنے لکھنے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ہماری انجمن میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس مضمون کے شروع میں ادیبوں کے جن چار گروہوں کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں سے تیسرا گروہ یعنی مزدور تحریک سے تعلق رکھنے والا گروہ تو پہلے ہی سے انجمن میں موجود ہے۔ دوسرے گروہ کے حضرات یعنی وہ لوگ جو ادب میں کسی مخصوص سیاست کے قائل نہیں ہیں لیکن ادب اور سیاست کے رشتے کے قائل ہیں اور ادب کو انسانیت کی فلاح وبہبود کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ بڑی آسانی سے ہماری صفوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔ پہلا گروہ، جو ادب کی آفاقیت پر زور دیتا ہے۔ شاید کسی حد تک ہمارے ساتھ آسکتا ہے مگر چوتھا گروہ جو سامراج پرست اور جاگیر داری عناصر پر مشتمل ہے، ہمارا مدِ مقابل اور مخالف ہوگا۔ ادب میں اس گروہ کے اثر کو ختم کرنے کے لئے ہمیں مسلسل اور بے تکان جد وجہد کرنی ہوگی۔

چونکہ ہمارے دیس میں ابھی تک مصنفین زیادہ تر متوسط طبقہ یا اونچے طبقہ سے آتے ہیں۔ ان میں بعض کی خاندانی روایات جاگیردارانہ ہیں اور بعض کی سرمایہ دارانہ۔ ان میں سے جو لوگ ترقی پسند مصنفین کی صفوں میں پہلے ہی سے شامل ہیں۔ آئندہ ہمارے متحدہ محاذ میں داخل ہوں گے ان کے طبقاتی تضادات ان کی نگارشات میں کبھی کبھی ظاہر ہوں گے اس میں کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ یہ تو متحدہ قومی محاذ کی خصوصیت ہے اور اسے تسلیم کرنا چاہیئے ہمیں اپنی انجمن کی کامیابی کی جانچ اس چیز سے کرنی چاہیئے کہ ہم ادیب کی حیثیت سے کہاں تک متحدہ قومی محاذ کے مقاصد کو پورا کر سکے ہیں یعنی ہم نے کس حد تک نئی جمہوریت کے تقاضوں کی تکمیل کی ہے۔

ظاہر ہے اس صورت حال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اراکین سے یہ مطالبہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ سیاست میں عملی حصہ لیں۔ لیکن دوسری طرف ہم اپنے ان ساتھیوں کو عملی سیاست میں حصہ لینے سے روک بھی نہیں سکتے۔ جو ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اراکین

انجمن کے لئے کسی خاص سیاسی جماعت یا کسی مخصوص سیاسی فکر کے ساتھ وابستہ ہونا بھی ضروری نہیں ہے
نئی جمہوریت کے قیام کے لئے جو ادب راستہ کرے گا۔ اس کے خاص خاص پہلو یہ ہیں۔

۱۔ قومی ۲۔ سائنٹیفک ۳۔ عوامی یا جمہوری

قومی ادب سے مُراد وہ ادب ہے جو قومی روایات اور ہیئت کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ قومی ادب کی ان روایات کو اپناتا ہے، جو انسانی زندگی کو آگے بڑھانے میں معاونت کرتی ہیں اور انھیں اجاگر کرتا ہے۔ اس طرح ترقی پسند ادب کی عوامی اپیل قائم رہے گی۔

سائنٹیفک ادب کے معنی یہ ہیں کہ یہ ادب جاگیردارانہ ادب کے کھوکھلے پن اور توہم پرستی اور تاریک اندیشی پر ضرب کاری لگاتا ہے اور حقیقت نگاری پر زور دیتا ہے جس کی بنیاد واقعات کے مشاہدہ اور ان کے علمی تجزیہ پر قائم ہوتی ہے۔ اس طرح ترقی پسند ادب نئی زندگی کا آئینہ دار ہوگا۔

عوامی یا جمہوری ادب جمہوری اصولوں کا حامل ہوتا ہے۔ وہ انسانی مساوات اور آزادی کا راستہ دکھاتا ہے۔ وہ عوام کے دلوں کو ایک شاداب اور باوقار زندگی کی طرف بڑھنے کا ولولہ اور حوصلہ عطا کرتا ہے۔ اسی لئے وہ بہت مقبول ہوتا ہے۔ ترقی پسند ادب کی یہ خصوصیت ادیبوں اور عوام کے درمیان قریبی رشتہ قائم کرے گی

میرا خیال ہے کہ اس وقت ہم انقلاب کی جس منزل پر ہیں، وہاں ترقی پسند مصنفین کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی تحریروں میں ان تینوں خصوصیات کو سموئیں اس سے نئی جمہوریت کی منزل تک پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی۔

نقوش
اگست و ستمبر

محمد حسن

مارکسی نظریۂ تنقید

برنارڈ شاہ نے مارکس کے بارے میں لکھا تھا۔

"مارکس اپنا سر خدا کی طرح بلند رکھتا ہے اس نے سماجی ارتقا کے قانون دریافت کر لئے ہیں اور اچھی طرح جان لیا ہے کہ کیا پیش آئے گا۔ تاریخ کا تانا بانا اس کے ہاتھ میں ہے"

تاریخ کے اس تانے بانے اور سماجی نشو و نما کے اس قانون کا نام مارکس نے مادّی جدلیت رکھا اور جیسے ہی کوئی اپنے کو مارکسی کہتا ہے وہ مادیت کی روشنی میں یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ اشیار ہمارے تصورات اور مفروضات سے علیحدہ (مگر متعلق نہیں) وجود رکھتی ہیں اور سارا عالم اتفاقی حادثات اور مستقل بالذات اور غیر متعلق اشیار کا عجائب گھر ہونے کی بجائے ہم آہنگ سلسلۂ عمل کی واحد موجِ خوش آب ہے دوسری طرف جدلیت کے ساتھ وہ یہ بات بھی مانتا ہے کہ یہ واحد عمل اور اس کے مرکبات سادے سلسلہ ہائے عمل ہر لمحہ تغیر پذیر ہیں اور اس تغیر کا سلسلہ دائرہ یا سیدھی لکیر میں ہونے کی بجائے متضاد رجحانات کی حقیقی کش مکش اور ٹکراؤ کے ٹیڑھے میڑھے راستے سے ہو کر جاتا ہے۔

ایک مارکسی کے نزدیک کائنات ایک واحد عمل ہے جس کے اندر مختلف سلسلہ ہائے

عمل جاری وساری ہیں لہٰذا وہ ہر محدود عمل میں کلی اور مجموعی عمل کا عکس دیکھتا ہے مجموعی عمل کے مطالعہ کے لئے محدود مظاہر کی اندرونی ترتیب پر غور کرتا ہے اور اس طرح جزو اور کل ماہیئت اور خاصیت کے ان تنازعات کو ہٹا دیتا ہے جو میکانکی اور VITALIST فلسفیوں کے درمیان برابر اٹھتے رہتے ہیں۔ ادب کے بارے میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ادب کو مارکسی مطالعہ نے بقیہ عناصر کائنات سے غیر متعلق جزو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور اس کے مطالعہ کے لئے دوسرے شعبوں سے بھی مدد لیتا ہے ادب ایک حادثہ نہیں ہے اور اس کی تخلیق نہ کسی حلول کرنے والی روح کے تابع ہے۔ اور نہ ذاتی توہم کے ادب ــــ اور خیال وشعور کا ہر شعبہ ــــ مادی حقیقتوں کا تابع ہے مادہ اور اس کے مظاہر بنیادی حقیقت ہیں اور خیال وشعور ثانوی اس لئے ادب کی تنقید کے لئے صرف ادب یا خیال کے دوسرے شعبوں کا مطالعہ ہی کافی نہیں بلکہ مادی حالات اور مجلس ترتیب کے قانون کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔ لہٰذا ادب کی تنقید خالص ادب کے دائرے میں رہ کر نہیں کی جاسکتی اور اس طرح ماورائی جمالیاتی یا تشریحی تنقیدیں مارکسی نقطۂ نظر سے تنقیدیں کہی جانے کی مستحق نہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مارکیسٹ ادب کی کوئی منفرد حیثیت تسلیم ہی نہیں کرتی یا اس کی اندرونی ترتیب اور حسن وقبح کے مطالعہ کو اہمیت نہیں دیتی۔ ادبی تنقید کو بھی کسی دوسرے عمل کے مطالعہ کی طرح ہمیشہ جزو زیر نظر (جو اپنی جگہ خود ایک وحدت ہے گو جامع اور مانع وحدت نہیں) کی اندرونی ترتیب سے شروع ہونا چاہیئے۔

کسی بھی ادبی رجحان کا جائزہ لیتے ہوئے پہلے اس کی خصوصیات اور اس کے اجزائے ترتیبی کا بالتفصیل تجزیہ ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ ہر کل کی طرح یہ جزوی وحدت بھی اپنے تضاد اور اندرونی تقسیموں سے مرکب ہوگی اس تضاد کو واضح کرنا اور ان متضاد رجحانات کے باہمی رشتے کو صاف طور پر دکھانا مارکسی نقاد کا سب سے پہلا فرض ہوتا ہے۔

مارکسی تنقید ان متضاد رجحانات کی مادی بنیادوں کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔ ۵۲

بتاتی ہے کہ یہ خیال یا رجحان طبقاتی تقسیم میں شریک ہونے والے کس گروہ سے متعلق ہے۔ اور یہیں سے ہم خالص ادب کے دائرے سے نکل کر وسیع تر مجلسی دائرے میں آجاتے ہیں ادب اور سماج کے باہمی رشتوں کو واضح طور پر پیش کرنا مارکسیت کی بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔

ہر نظام اپنا نظامِ فکر اپنے ساتھ لاتا ہے اس کا فلسفہ ادب اور آرٹ اس کی سماجی ترتیب سے ہم آہنگ ہوتا ہے اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہر نظامِ فکر کسی نہ کسی نظامِ تمدّن، کسی نہ کسی مجلسی بنیاد سے وابستہ ہوتا ہے۔ ادب زندگی سے اس طرح وابستہ ہے جیسے زندگی ادب سے۔ دونوں ایک دوسرے کو بدلتے ہیں اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ادب کے اندرونی اور خالص ادبی رجحانات کے ڈانڈے بیرونی اور مادّی رشتوں سے ملے ہوئے ہیں۔

آج جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا دو کیمپوں اور دو متضاد اور متصادم صورتوں میں بٹ گئی ہے اور اس اصول پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ادب کو دونوں میں سے کسی ایک کیمپ کے ساتھ جانا چاہیئے تو ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ادبی دُنیا بھی اسی طرح دو کیمپوں میں بٹ چکی ہے اور اس کا ادراک نہ سہی احساس تو خالص ادب کے دائرے میں رہ کر بھی کیا جا سکتا ہے ازرا پاؤنڈ۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ۔ مارلے۔ امریکہ اور انگلستان کے وہ ادیب جو آج اپنے انفرادی خلوں میں زیادہ سے زیادہ اسیر ہوتے جا رہے ہیں ایک صف میں آ گئے ہیں۔ ان کا موضوع وہ مرتا ہوا "بورژوا فرد" ہے جس کا یقین زندگی کی تمام تر قدروں سے اُٹھ گیا ہے جس کے ہاتھ اپنے ہی خون سے رنگین ہیں اور جو ساری دنیا کو وحشیوں کا جنگل قرار دے کر اپنی بے بسی، انتشار پر قانع ہو گیا ہے یہ گویا اس طبقے کے ایک فرد کی تصویر ہے جس کے مفاد اب مجلسی ترتیب سے ہم آہنگ ہونے کے بجائے اس کے مخالف ہیں ان کی تکنیک ہیئت پرستی اور اشاریت کی ایسی شکلوں کی طرف بڑھ رہی ہے جو ادب

کی تاثیر کو کچھ "برگزیدہ" افراد یا محض شاعر کی داخلی تسکین تک محدود کر دیں۔

دوسری طرف وہ ادیب ہیں جن کا موضوع وہ ابھرتا ہوا انسان ہے جس کی انفرادیت اجتماعی آہنگ میں سمو کر اُجاگر ہو رہی ہے اور جن کی ہیئت اور تکنیک اپنے فن کو زیادہ قابل فہم، زیادہ مقبول اور زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی طرف بڑھ رہی ہے۔

یہ ادبی دُنیا کی نئی تقسیم ہے۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ سرمایہ داری اپنے بحران میں مبتلا ہے تو اس سے یہ مطلب نکالنا کہ یہ بحران محض معاشی ہے اور اس معاشی بحران کے ماتحت ادب کو ایک رُخ اپنانا چاہیئے صحیح نہیں۔ سرمایہ داری ایک نظام ہے اس کا اپنا ایک نظام فکر ہے اس کا ادب ہے اس کا تمدن ہے اس کا فلسفہ اور تہذیب ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ بحران میں مبتلا ہے تو ظاہر ہے کہ اس بحران کی بنیادی حقیقت معاشی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ بڑی ہمہ گیر ہوتی ہے۔ بورژوا ادب ایک بحران میں مبتلا ہے آج جب ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور مڈلٹن مرے اور اسی قسم کے دوسرے بورژوا فن کار مذہب، روحانیت اور ماورائیت کی قدروں کی طرف رجعت کر رہے ہیں جب ہر ایک بورژوا مفکر اور فلسفی سماجی اور انفرادی زندگی کے مزاج کی طرف بے بسی سے اشارہ کرنے لگا ہے کیا ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح نہیں ہوتی کہ ادب ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ پریم چند کا ہیرو کسان اپنی آخری ہچکی تک اپنے کرب و مصائب کے باوجود زندہ رہنے کا عزم کر سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ "انسان مر نہیں سکتا" اور راما نند ساگر کے ناول کا عنوان ہے "اور انسان مر گیا"۔ روسو سرمایہ داری کے ایام شباب میں انسانی آزادی کے گیت گا سکتا تھا اور کہہ سکتا تھا کہ یہ آزاد انسان ہر جگہ پابہ زنجیر ہے اور ان زنجیروں کو توڑنا ہے تبدیلی مبارک اور تغیر خوش آمدید۔ اور آج فرانس کا مشہور ادیب ژین پال سارترے فرانس کے جرمن محکومیت کے ایام کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"ہم ناری محکومی کے دور سے زیادہ کبھی آزاد نہ تھے۔ یہ مکمل تنہائی، ذمہ داری کا نقدان یہی آزادی کا صحیح رُوپ ہے"۔

یہ بورژوا ادب کا بحران ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے مادّی اسباب اور مجلسی بُنیادیں ہیں۔

اگر مارکسیت ادب کو مجلسی حالات کی پیداوار محض ہی بتا دیتی تو وہ اپنے کو میکانکی مادّیت سے باہر نہیں رکھ سکتی تھی جو مادہ کو بُنیادی اور ثانوی درجہ سبھی دیتی ہے اور فکر و خیال کو مادّے کا ایک عکسِ مجہول جانتی ہے۔ ادب مارکسیت کے نزدیک زندگی اور مجلسی ارتقار میں برابر کا شریک بھی ہے وہ ایک عکس ہے آلہ کار ہے ایک باعمل مجاہد ہے اور اس لحاظ سے کسی بھی ادبی رجحان یا شہ پارے پر نظر ڈالتے ہوئے پہلا سوال یہی اُٹھتا ہے کہ وہ ارتقار کی منزل کا کس حد تک ساتھ دیتا ہے اور انسانی فکر و شعور کو اس کی تخلیقی صلاحیت کو بیدار کرتا ہے؟ تخلیق انسانی فکر و عمل اور ٹھوس مادّے کا سنگم ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان نہ صرف اشیار کا شعور حاصل کر سکتا ہے بلکہ اس شعور کے بعد اپنی دانستہ فکر و عمل سے اس پر اثر انداز بھی ہو سکتا ہے اور اسے اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے ادب ان باہمی رشتوں میں کیا پارٹ ادا کر رہا ہے یہ سوال ہر مارکسی نقاد کے سامنے سب سے پہلے آتا ہے۔

سماجی ارتقار کا قانون مارکس نے طبقہ واری کش مکش کی صورت میں ظاہر کیا ہے سماج کے جسم کی متعدد تقسیموں میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی تقسیم طبقاتی ہے اور اپنے مجلسی رشتوں کی بنا پر ادب اس تقسیم سے غافل نہیں رہ سکتا کوئی ادبی رجحان یا کوئی ادیب کہاں تک مجلسی ترتیب اور ارتقا میں اپنا فرض ادا کرتا ہے یہ سوال ہر نقاد سے اپنا جواب مانگتا ہے۔ یہیں سے تنقید میں ایک نقطۂ نظر پیدا ہوتا ہے۔

لہٰذا مارکسی تنقید اپنے کو محض ادبی یا جمالیاتی دائرے تک محدود رکھنے کی بجائے

ادب کے مجلسی رشتوں سے واسطہ رکھتی ہے اور ہمیشہ ادب کو اس کے اپنے دور کی طبقاتی ترتیب کے پس منظر میں دیکھتی ہے تنقید کا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے اور یہ نقطۂ نظر مجلسی ترتیب سے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال سرے سے نہیں اُٹھتا کہ نقاد ہمدردانہ مطالعہ کے پردے میں خود فن کار کا نقطۂ نظر اختیار کرے اور اپنے کو محض عندیہ اور اظہار کے مطالعہ تک محدود رکھے بار کسی نقاد کا اپنا نقطۂ نظر ہے اور وہ ادب کو ارتقار کے عمل میں ایک باعمل شریکِ کار جانتا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ ہر ادبی تخلیق کو پرکھتا ہے وہ نہ صرف عندیہ اور اظہار کے باہمی رشتوں کا مطالعہ کرتا ہے بلکہ عندیہ اور اظہار دونوں کو اس حیثیت سے بھی دیکھتا ہے کہ وہ کہاں تک ایک ایسا ادبی شہ پارہ پیش کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں جو ارتقار میں مددگار ثابت ہو سکے۔ وہ فن کار کے نقطۂ نظر کو بھی اسی ترازو پر تولتا ہے۔

کسی فلسفی نے کہا ہے کہ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے جو یا تو مکمل طریقہ پر consistent ہوں یا مکمل طور پر Inconsistent

یہ بات ان نقادوں کو پریشان کرنے کے لئے بہت کافی ہے جو مادّی جدلیت کے قانون کو اچھی طرح نہیں سمجھتے اور ارتقار با مضدر کے قائل نہیں۔ مجلسی نشو و نما ایک دشوار اور متنوع عمل ہے اس کا ارتقار جو کہ نوشش آب کی طرح آہستہ اور بار بط بھی ہے اور برق اور رعد کی طرح تیز اور غیر متوقع بھی۔ پھر مجلسی نشو و نما کا یہ عکس ادب کے رواں اور عملی طور پر مجلسی نشو و نما میں شریک دھارے میں پڑتا ہے تو اس کی رنگا رنگی اور تنوع اور بھی بڑھ جاتا ہے اور ایسے ذہنوں کو پریشان کر دیتا ہے جو یا تو مکمل باقاعدگی چاہتے ہیں اور یا مکمل بے قاعدگی۔ یہ دراصل اسی آدرش وادی نظریہ کی طرف رجعت ہے جو بے قاعدگی اور باقاعدگی، حُسن اور قبح، تکمیل و نقص کے تجریدی تصور میں یقین رکھتے ہیں۔ اور ان صفات کو ان اشیار سے علیحدہ کر کے سوچتے ہیں جن میں یہ پائی جائیں۔

ترقی پسندی اور رجعت پسندی، حسن و قبح جامد اور ساکت خصوصیتیں ہونے کے بجائے عمل ہیں اور یہ عمل ایک دوسرے سے متعلق اور مربوط ہیں اور یہ باہمی آویزش اور تکرار ہی دراصل وہ شے ہے جو ترقی کی ضمانت کرتی ہے اور بہتر منزلوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی شاعر، کسی دور کی ادبی تخلیق کے اندرونی تضاد کو واضح کرتے ہیں، تو ہمارا کام اس سے آگے بڑھتا ہے اور یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ان رجحانات کی مادی اور مجلسی بنیادوں کو بھی واضح کریں اور یہ وضاحت اس دور کی سماجی ترتیب اور اس سماج میں شاعر کی اپنی جگہ کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔

آدرش وادیوں کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ صفت، شے یا موصوف کے بغیر وجود نہیں رکھتی ہم کسی بھی آدرش کا کسی بھی مکمل ترین ارفع اچھائی یا برائی کا تصور بغیر کسی شے کے نہیں کر سکتے۔ لہذا جب ہم کسی بھی فن پارے کو پرکھتے ہیں تو اس کی تعریف، تنقید یا تنقیص کرتے ہوئے ہمارا مطالعہ اور ہمارا ہر ایک بیان حقیقی اور مستقل بالذات ہونے کے ساتھ ہی اضافی اور متعلق ہوتا ہے۔ جب ہم کسی چیز کو اچھا کہتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس جنس کی اور بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن کے مقابلے میں ہم نے اسے بہتر درجہ دیا ہے۔ بقول سپنوزا کے ہر ایک شے کی تعریف دراصل ایک نفی ہے جب ہم کسی شے کی تعریف یا ماہیت بیان کرتے ہیں تو اس کے معنی اس کے سوا کیا ہیں کہ ہم یہ بتا رہے ہیں کہ اس شے میں یہ تمام صفات پائی جاتی ہیں۔ جو اس مقدار میں دوسری اشیا میں نہیں ملتیں۔ یہ دراصل ایک طریقۂ امتیاز ہے اور یہ طریقہ ظاہر ہے کہ اضافی طریقہ ہے۔

جب کسی فن پارے کو ترقی پسند کہا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اسے ایک آدرش کی حیثیت نہیں دی جاتی مارکسی نقاد اس فن پارے کے اندرونی تجزیئے سے منہ نہیں موڑتا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے بہتر اور اس سے زیادہ

ترقی پسند تخلیق ممکن نہیں ہے۔ ترقی پسند کہنے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی حدود سے آگاہ ہیں۔ ہم اس کی اندرونی ترتیب اور کمزوریوں کو بھی واضح کرتے ہیں۔

لینن نے ہیگل کی جدلیات پر بحث کرتے ہوئے ابدی سچائی کے بارے میں لکھا ہے۔

"ہر ایک مخصوص شے، حقیقت یا خیال صرف ایک جزو ہے۔ پوری حقیقت یا خیال کے لئے سچائی اور اصلیت کے دوسرے متعدد اجزا درکار ہیں جو بظاہر غیر متعلق اور مستقل بالذات معلوم ہوتے ہیں۔ صرف پہلے جزو اور ان تمام اجزا کے اوسط اور ان دونوں کے باہمی ربط سے ابدی سچائی حاصل ہوسکتی ہے۔"

عزیز احمد نے سجاد ظہیر کے اس جملے پر کہ "اقبال مجموعی طور پر ترقی پسند ہیں" اعتراض کیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ عزیز احمد اور ایسے دوسرے تمام نقادوں کو جو جدلیات سے آگاہ نہیں اور شے اور خاصیت کے باہمی تعلق اور عمل کو نہیں دیکھتے یہ جملہ بڑا ہی بے معنی معلوم ہوگا۔ تنقید جملہ بازی نہیں ہے۔ مارکسی تنقید نے اس بات کو آئینہ کر دیا ہے کہ جب بھی تنقید کو جملہ تک محدود کیا جائے گا اس کی شکل ایک اوسط اور "مجموعی طور سے" ہی ظاہر کی جا سکے گی

مارکسی تنقید آرٹ کا کوئی بندھا ٹکا آدرش نہیں ہے اس کا آدرش ہمیشہ ان جزدی اور انفرادی ادبی تخلیقات ہی میں ملتا ہے اور ان سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا مارکسی تنقید ادبی شہ کار کی مختلف صفات کو شے سے علیحدہ نہیں کرتی۔ وہ شے اور صفت کی ناقابلِ تقسیم وحدت کی قائل ہے۔

مارکسی نقاد کا کام محض شے کی اندرونی حرکت، ترتیب کے بیرونی رشتوں کو پرکھنے تک ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس تغیر پذیر شے کو تغیر پذیر ماحول کے پس منظر میں دیکھے اور پرکھے۔ حقیقت پسندی نے ایک ادبی رجحان کی حیثیت سے ایک نہایت ہی ترقی پسند فرض ادا کیا ہے، لیکن

ایک تو خود اس کا نشو ونما اس کو کس سمت میں لے گیا دوسرے حالات کے بدلتے ہوئے دھارے نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ یہ دونوں باتیں کوئی مارکسی نقاد فراموش نہیں کر سکتا۔ ہر ایک شاعر کا ادبی رجحان اور ہر ادبی رجحان اور ہر ادبی تخلیق زندگی کے جزء اور اس رواں دواں دھارے کے ایک حصّے کو اسیر کرتی ہے اور اس ایک حصّہ کو اس کے پس منظر میں دیکھنا نقاد کا کام ہے۔

مارکسی نقاد کو ایک طرف خود جزوی وحدت یعنی ادبی تخلیق کی اندرونی ترتیب کو نظر انداز کر دینے کے خطرے سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ دوسری طرف سماجی ترتیب اور اس اندرونی ترتیب کے بیرونی رشتوں کو صحیح اہمیت نہ دے سکنے کے اندیشے سے۔ اس کے علاوہ ضرورت سے زیادہ سادہ دلی (over simplification) اور میکانکی نقطۂ نظر سے آگاہ ہونا چاہیئے۔ اسی وقت وہ کسی ادبی تخلیق کی صحیح تنقید پر قادر ہو سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ کسی مارکسی نقاد سے زیادہ کوئی بھی ادب کی اندرونی ترتیب، اس کے حسن، اس کے ماضی حال اور مستقبل سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس کے سامنے سب سے پہلا سوال ادبی فن پارے کی اندرونی ترتیب کا مطالعہ ہوتا ہے اور اس اندرونی مطالعہ میں موضوع اور ہیئت کا ربط باہمی، روایت اور تجربہ کے رشتے، اظہار اور تاثر، محاکات اور اثر کی گہری وابستگی سے آگاہی مارکسی نقاد سے زیادہ کسی اور کے لئے اتنی ضروری نہیں۔ وہ تصویر کے ہر رنگ پر غور کرتا ہے ہر کردار اور ہر رجحان پر وقت صرف کرتا ہے اور ہر ابھرتے ہوئے اور مٹتے ہوئے نقش کے پس منظر کو پرکھتا ہے ناول کا ایک کردار ابھرتا ہے اور دوسرا مٹ جاتا ہے ایک تصور دھل جاتا ہے اور دوسرا سارے پلاٹ پر چھا جاتا ہے۔ مارکسی نقاد کے لئے صرف اس کا بیان یا اس کی وضاحت ہی کافی نہیں اس کے آگے اسباب و علل ابہام و تفہیم کا ایک سلسلہ ہے۔ ایسا کیوں ہوا، یہ کہاں تک حقیقی ہے

اور کہاں تک محض ضمنی ہے۔

اور اس بات کا تصفیہ کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم ایک نقطۂ نظر کو نہ اپنائیں یہ نقطۂ نظر لازمی طور پر ادیب کا اپنا نقطۂ نظر نہیں ہو سکتا۔ جب تک ہم ادیب کیساتھ چلتے رہیں گے اور خالص ادب کے دائرے سے باہر قدم نہ نکالیں گے مختلف رجحانات کے تضاد کو دیکھنا دشوار ہوگا۔ پریم چند اور ٹالسٹائی جیسے پاکیزہ صفت اور نیک دل فن کار جو سامراج اور جاگیرداری کے پہیئے سے بندھے ہوئے کسان کے مظلوم وجود پر چیخ اٹھتے ہیں۔ خود ہی انسان کے فکر و عمل کو ماورائی طاقت کے سماوی رتھ سے باندھ دیتے ہیں اور اپنی کٹیوں میں بڑے سکون سے واپس چلے جاتے ہیں۔ انسان دوستوں اور سوشل ریفارمروں کے نزدیک یہ کوئی تضاد پیش نہیں کرتے اور اگر ہم خود مصنف کے ہم خیال ہوکر اس پر نظر ڈالیں گے تو اس تضاد تک پہنچنا ممکن نہ ہوگا۔ مصنف کا ایک خاص نقطۂ نظر ہوتا ہے اور نقاد کے لئے بھی ایک خاص نقطۂ نظر اپنانا ضروری ہے اگر تنقید کو تشریح یا تحمید کی آلائشوں سے بچانا ہے تو ایک نقطۂ نظر اپنانا پڑے گا اور یہ نقطۂ نظر وہی ہو سکتا ہے جو زندگی کے ارتقا نے اور تاریخی قوت نے فراہم کیا ہے۔

اندرونی ترتیب کے رشتے بیرونی ترتیب سے ملتے ہیں۔ خیالات بظاہر بڑی معصوم اشیا ہیں اور ان کے تضاد اور باہمی تنافر کی جبلی بنیاد معلوم کرنا آسان کام نہیں۔ . . . . ہندو مسلم فساد پر لکھنے والوں کے دل اس خیال سے بھی کانپ اُٹھتے ہیں کہ جن عورتوں کے بدن کبھی سورج کی کرن نے نہیں دیکھے تھے وہ باہر سڑکوں پر اور میدانوں میں بے نقاب پھر رہی تھیں اور اس خیال سے بھی کہ بڑھتی ہوئی انقلابی تحریکوں اور انقلابی تصورات پر رجعت پسندی نے پھر ایک کاری وار کیا عورتوں کی اس مظلومی سے انکار نہیں جو انھیں جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کے جوئے تلے سہنا پڑتی ہے مگر سورج کی کرن سے چھپنے والی عورت کا تصور بڑا معصوم

ہوتے ہوئے بھی خالصتاً جاگیردارانہ اور خطرناک ہے جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ مخصوص تصور اور خیال مخصوص مجلسی ترتیب اور مخصوص طبقہ سے متعلق ہے اور فن پارے کا اندرونی تضاد در اصل بیرونی تضاد کا ایک حصہ ہے اس وقت تک مارکسی نقاد کا فرض پورا نہیں ہوتا۔

لیکن مارکسی تنقید کا سب سے اہم مسئلہ ادب کے فاعلی پہلو سے متعلق ہے لینن نے کہا تھا "ہر ایک ادب طبقاتی ادب ہے" اور یہ بات اسی بیان کا ایک تسلسل ہے کہ ہر دَور کا ادب اپنے دور کی تصویر ہے۔ ادب ایک باعمل شریکِ کار ہے اور وہ ارتقار کی آویزشس میں حصہ لیتا ہے۔ ادب کے اس تاریخی درجے کی بڑی اہمیت ہے ہر ایک ادبی شہ پارہ، ہر ایک شاعر، ہر ادبی رجحان اپنے دَور کی تصویر ہے۔ اور اس دَور کے اثرات سے وہ باہر نہیں نکل سکتا۔ لیکن وہ محض ایک عکس مجہول ہونے کے بجائے ایک باعمل شریکِ کار ہے اور اسی لحاظ سے نہ مارکسی مصنف کا کام فوٹوگرانی تک محدود رہ سکتا ہے اور نہ مارکسی نقاد کا کام ادب کے مجلسی رشتوں کے بے نقاب کرنے تک۔ دیکھنا یہ ہے کہ ادبی تحریک اور تخلیق زندگی کو کس طبقے کے حق میں بدل رہی ہے ادب خیال اور شعور کو جگاتا ہے اور اس کی تعمیر کرتا ہے۔ یہی خیال اور شعور عمل کی بنیادیں ہیں ہر خیال جو عمل میں منتقل ہو جاتا ہے ماورائی کے بجائے حقیقی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح مادّے کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی وہ مادّے کی ترتیب اور اس کی تشکیل میں فیصلہ کن طریقے پر حصہ لیتا ہے۔ آیا کوئی ادبی تخلیق انسانوں میں آگے بڑھنے کی اُمنگ، حالات کے بہتر تجزیئے کی صلاحیت اور نئی خلاقانہ طاقت کو بیدار کرتی ہے (جسے لینن نے تمام انسانوں میں چھپے ہوئے شاعر کو "جگانے" سے تعبیر کیا تھا) یا ان میں وہ مایوسی، وہ خواہشِ مرگ اور شکست خوردگی پیدا کرتی ہے جو مرتے ہوئے طبقے کی خصوصیت ہے ـــــ اسی پر کسی فن پارے کی تکمیل اور اس کے حسن و قبح کا دار و مدار ہے۔

مارکسی تنقید دراصل فن اور زندگی کے باہمی رشتوں کی نگراں ہے وہ ایک طرف ادب اور زندگی کے ربط باہمی کو نظر میں رکھتی ہے ادب زندگی پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں زندگی سے اثر لیتا ہے زندگی کو تبدیل کرنے کے عمل میں بہتر طور پر شریک ہونے کے لئے خود کو تبدیل کرتا ہے دوسری طرف مارکسی تنقید ادب کے دائرے کے اندر رہ کر اسے ایک نئے تضاد سے آشنا کرتی ہے۔ تخلیقی شہ پارے اور اس کی تنقید یعنی اس کی اندرونی ترتیب، بیرونی رشتوں اور مجلسی عمل کے مطالعہ کے تضاد سے۔ اور یہی وہ تضاد ہے جو ادب کو بہتر، تازہ تر اور شاداب تر بنانے کا ذمہ دار ہے۔ اسی لحاظ سے مارکسی تنقید ہر ادبی منزل کے اندرونی تضاد کو نمایاں کر کے اور ہر اگلی تخلیق پر اثر انداز ہو کر اپنی تخلیقی آن بان کو قائم رکھتی ہے اور اسی مقصد کو پورا کرتی ہے جو تنقید کا بنیادی مقصد ہے۔

جب تک ہماری تنقید بے لاگ ہے ہمارے ادب کے شیریں اور صحت مند ہونے کی پوری ضمانت موجود ہے اور ہمارا ادب زندگی کے اپنے رابطے استوار رکھے گا اور عوام کے اندر سوئے ہوئے شاعر اور فن کار کو بیدار کر سکے گا۔

محاذ

یکم مارچ

ممتاز حسین

صُورت و معنی کا باہمی رشتہ

ادبی کارخانے میں صورت اور معنی کے باہمی رشتے کو سائنسی طور پر دریافت کرنا ایک بہت ہی مشکل کام ہے کیونکہ اس مسئلہ پر صرف اس وقت سے صحیح روشنی پڑنے لگی ہے جب سے کہ جدلیاتی مادیت کا اسکول وجود میں آیا ورنہ اس سے پہلے تو اس پر عینی اسکول ہی کے مفکرین نے روشنی ڈالی ہے۔

عینی اسکول سے وہ اسکول مُراد ہے جو خیال کو مادے پر مقدم سمجھتا ہے اور جو خیال اور مادّے کے باہمی رشتوں کو اس طرح سمجھتا ہے کہ خیال مادّے کو حرکت میں لاتا ہے۔ اسی منطق کے ماتحت ارسطو نے صورت ہی کو فن کا محرک بتایا ہے اور وہ صورت کو ذہن کی تخیلی قوت کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے جو اپنے آخری درجے میں ایک ماورائی قوّت کے ساتھ منسلک ہے اس کا کہنا ہے کہ مادّہ غیر متشکل سی شے ہے جو چیز اسے شکل عطا کرتی ہے وہ خیال کی تشکلانہ قوت ہے یعنی صورت کا احساس۔ اس چیز کا تذکرہ میں نے اس لئے ضروری سمجھا کہ ہمارے یہاں بھی یہی خیال رائج تھا اس سے یہ مُراد نہیں کہ ہمارے یہاں معنی کو اہمیت ہی نہیں دی گئی بلکہ جب کبھی فن اور ادب کو جانچنے کا وقت آیا ہے تو صورت گری کو اصل فن ٹھہرایا گیا ہے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ ہم خواہ اس بات کو کتنی ہی بار دہراتے رہیں

کہ معنی کو بھی اہمیت ہے۔ ہمارے بہت سے قدیم شعرا صورت پرستی کے الزام سے بچ نہیں سکتے ہیں۔ چنانچہ جب بھی ہمارے سماج میں ایسا وقت آیا ہے کہ خیالات کی تقلید کو حُسن قرار دیا گیا ہے تو شعر و ادب صرف صورت پرستی کا نام رہ گیا ہے۔ آج جب کہ نئی طاقتیں اپنے ساتھ نئے خیالات لا رہی ہیں تو شعر و ادب کے سوئے ہوئے محافظ کھنکار کھنکار کر کہتے ہیں کہ حضور اس میں نیرنگِ تماشا اور جلوۂ صورت تو ہے ہی نہیں۔

اگر آپ ان کی بحث میں قدیم مفروضات کی بنیاد پر حصہ لیتے رہیں گے تو یہ جھگڑا کبھی ختم نہ ہو سکے گا۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جدید سائنسی اور سماجی معلومات نے سماجی زندگی اور مادے کے بارے میں نئی تحقیقات بہم پہنچائی ہیں — دُنیا کی تمام چیزیں مادی ہیں — انسانی ذہن مادے کی پیداوار ہے اور انسانی خیال مادی حقائق کا ایک ایسا عکس ہے جو مادے پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ سماجی زندگی میں مادے اور خیال کے اس جدلیاتی عمل کو ہم انسانی عمل ہی کے ذریعے محسوس کرتے ہیں جس طرح خیال اور مادے، سماجی شعور اور زندگی کا باہمی عمل جدلیاتی ہے یعنی ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح صورت و معنی کا عمل بھی جدلیاتی ہے۔ لیکن ہر صورت میں جس طرح مادہ مقدم ہے خیال پر اور زندگی مقدم ہے سماجی شعور پر، اسی طرح معنی مقدم ہے صورت پر۔

اس مادی زندگی کا دوسرا راز یہ ہے کہ یہاں ہر چیز ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ دُنیا کا ہر وجود اپنے اندر اپنا نفی مخفی رکھتا ہے اس اندرونی تضاد کے باہمی ٹکراؤ، رد و قبول، اتصال ضدین پھر نفی کی نفی سے ایک نئی صورت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اس قانون سے صورت و معنی آزاد نہیں ہیں۔ نیا معنی نئی صورت بھی لاتا ہے۔

ادب کے بارے میں صرف یہی کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ ہر دور کے ادب کا معنی

بدلتا رہا ہے بلکہ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ صورت بھی بدلتی رہی ہے۔ معنی کے بارے میں تو یہ بات بڑی آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ نئے طریق پیداوار اور اس کے آزاد کئے ہوئے نئے سماجی رشتوں کے باعث ادب کا معنی بدلتا رہا ہے لیکن صورت کی تبدیلی کیونکر وجود میں آتی ہے اس کا سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ صورت اور معنی کا باہمی رشتہ ذریعے اور مقصد کا بھی ہے۔ ہر سماجی دور کا ادیب زندگی کی تصویر اسی آئینہ میں دیکھتا ہے جسے وہ حقیقت سمجھتا ہے۔ اگر مادی حقائق سے گریز کر کے صرف ماورائی حقیقت ہی پر نگاہ رکھی جاتی ہے تو نہ صرف ادب کا مقصد ہی بلکہ اس کی صورت بھی بدل جاتی ہے اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ مادہ خود سے متحرک نہیں ہے بلکہ اس کو حرکت میں لانے والی ایک ماورائی طاقت ہے تو خیال کی صحیح مصوری کا بگڑنا لازمی ہے۔ خیالات حسیہ تو رہ سکتے ہیں ——— لیکن وہ عمل حسیہ (Sensuous Activity) نہیں بن سکتے ہیں۔ تصوف کی شاعری اس کی واضح مثال ہے۔ وہاں خیالات تو حسیہ ہیں لیکن ان میں عمل کی قوت مفقود ہے اور یہ کام اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ زبان کو اظہارِ حقیقت میں ایک پردہ بنا کر حائل نہ کر دیا جائے۔ اور خیالات کے اظہار میں ایک ایسا گوشہ نہ تلاش کیا جائے جس سے دو معنی نکل سکیں۔ یا مادی معنی کو صرف اس خیال سے مجازی سمجھا جائے کہ اسے ایک ماورائی حقیقت کے انکشاف، کا ذریعہ بنانا ہے۔

قصیدے کو تو چھوڑیئے ایران میں اس کی ابتدا تو دربار ہی سے ہوئی لیکن غزل کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جبکہ ایران عربوں کی غلامی سے آزاد ہوتا ہے۔ آزادی کا نیا جذبہ اور بدلا ہوا ماحول وطنی خصوصیات کو ابھرنے کا موقع دیتا ہے۔ دقیقی لب لعلیں اور زردشتی مذہب کا طالب ہوتا ہے اور اگر چند روایتوں کو صحیح مانا جائے تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہی شاہنامے کی داغ بیل بھی ڈالتا ہے۔ ادھر رودکی سبزہ زاروں کی آزاد زندگی کا حسن سمیٹ لیتا ہے۔ یکایک قصیدے سے ٹوٹ کر غزل وجود میں آتی ہے یہ تبدیلی

جو غزل کو وجود میں لاتی ہے قصائد کی صورت کو بھی بدل دیتی ہے۔ قصائد ایرانی بہار اور تغزل کے اظہار سے اس قدر بھرپور ہو جاتے ہیں کہ بعض وقت تو غزل اور قصیدے میں کچھ فرق ہی نہیں رہ جاتا ہے۔

آزاد ایران کی زندگی کے رشتے ایرانی ادب میں رومانوی تحریک کو جنم دیتے ہیں۔ قومی جذبات اور رنگین طرز کی زندگی کے بے لاگ اظہار کے لئے جس قسم کے جوش و خروش، سادگی اور حُسن کا تقاضا تھا اس کے لئے عربی زبان کی لغت سے بوجھل اور لفظی صنعتوں میں ڈوبا ہوا قصیدہ بالکل بے معنی ہو چکا تھا۔ اسی لئے غزل اور مثنوی کو زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ لیکن جب انھیں اصناف کو اور بالخصوص غزل کو صوفیوں نے اپنایا تو غزل کی زبان میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ انھوں نے اپنے ذہن پر ایک سکر کی کیفیت طاری کی اور ایسے رموز، تشبیہہ اور استعارے استعمال کئے کہ جن کا تعلق بے خبری، مستی اور رقص و سرود سے تھا۔ یعنی کی یہ تبدیلی غزل کی صورت پر بھی اثر انداز ہوئی۔ باوجود اس بات کے کہ ابتدائی دور کی غزلوں کی Lyricism صوفیوں کی غزلوں میں موجود ہے۔ پھر بھی ان کا اثر قدرے مختلف ہے وہ خود سپردگی کا ایک ایسا جذبہ پیدا کرتی ہیں جن میں جوش اور حرکت کے بجائے تفکر اور تعطل عمل ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ تصوف کی تحریک عربوں کے تشدد پسند عمل اور غیر حسی ادراک حقیقت کے خلاف تھی اور اگر حسیہ اظہار حقیقت Lyricism باقی رہی تو اس کا سبب یہ تھا کہ ایرانی شعراء باوجود اسلامی عقائد رکھنے کے جذباتی طور پر ایرانی پیگزم ہی سے متاثر تھے اس کی بڑی اچھی مثال حافظ کا کلام ہے۔

حافظ کی غزل میں تو معنوی تسلسل اور جذبے کی وحدت کا تاثر قائم بھی ہے لیکن متاخرین یعنی صائب اور کلیم کے یہاں تو قطعی انتشار کا پتہ چلتا ہے۔ یہ انتشار کسی نہ کسی حد تک تمام ہی صوفی غزل گو شعراء کے یہاں ملتا ہے اور جو صوفی نہیں تھے ان کے یہاں

تقلیدی انتشار ہے۔ اس انتشار کے جہاں اور اسباب تھے ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ سماجی شعور کو عملی میدان میں دریافت کرنے کے بجائے اپنی ذاتی فکر اور خیال کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ یوں تو انفرادی شعور سماجی شعور کا جزو ہے لیکن اس جزو کی صداقت کو سماجی عمل کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے۔ چونکہ صوفی تفکر کو عمل پر مقدم سمجھتے تھے اس لئے وہ اپنے شعور کو سماجی عمل کے تابع کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ وہ صرف ترویج خیال کے ذریعے قلب ماہیئت کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک ہمارے ملک میں سماجی شعور کسی منظم تحریک کی صورت میں بیدار نہ ہوسکا۔ غزل کا انتشار، ایک فرد کے خیالات کا انتشار، ہمارے ذہنوں پر مسلط رہا۔ اس حقیقت کا بھرپور انکشاف تو ۱۸۵۷ء کے بعد ہی ہوا جبکہ جاگیردارانہ نظام کے خاندان کی اکائیاں فنا ہوچکی تھیں۔ ملک اور قوم کو زندہ رہنے کے لئے افراد کی اکائیوں پر بھروسہ کرنا پڑا، اور وہ اکائیاں اسی وقت قوت حاصل کرسکتی تھیں جبکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی بخشی ہوئی قومیت کے تصور میں اپنے کو ضم نہ کردیتیں۔

اگر ایک طرف قومیت کے نام پر تنظیمیں ہونے لگیں تو دوسری طرف مادی علوم کا پرچار بھی شروع ہوا۔ جس حد تک متوسط طبقے میں ان چیزوں کا شعور بیدار ہوتا گیا غزل کی ٹیک نامی کا احساس بھی بڑھتا رہا۔ سماجی شعور کی اس بیداری نے ایک نئے معنی کے ساتھ نئی صورت کو بھی جنم دیا۔ اب نظموں کا آغاز ہوا۔ حالی کے سامنے بڑی کش مکش تھی۔ نیچرل شاعری کے لئے اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ الفاظ ثانوی معنی میں استعمال نہ کئے جائیں۔ تشبیہہ واستعارہ براہ راست خارجی حقائق کا عکس ہوں اور خیالات نہ صرف حسیہ ہوں بلکہ عملی محرکات کا بھی ثبوت دیں۔ چونکہ حالی کسی قدر تجدیدیت سے بھی متاثر تھے اس لئے وہ بھرپور طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی قومیت اور رومانیت کا اظہار نہ کرسکے۔ اگر ایک طرف وہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام سے سیکھنا چاہتے تھے تو دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام کی اخلاقی قدروں کو قائم بھی رکھنا چاہتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ غزل کی Lyricism کو نظموں

میں منتقل نہ کرسکے ۔ ان کے دل میں بے لاگ اظہار جذبات کا ولولہ نہ تھا بلکہ ایک محتسب تازیانہ لئے کھڑا تھا ۔ ادھر غزل کی دُنیا محتسب سے پرہیز کرتی ۔ رہ گیا اخلاقی شاعری کا سرمایہ تو وہ صوفیوں کے یہاں جتنا بھی ہے اس سے انھوں نے پورا فائدہ اٹھایا ہے ۔ یہ حقیقتیں تھیں جن کی وجہ سے حالی کو غزل سے بہت زیادہ بدکنا پڑا ۔ جس حدتک غزل کی خرافات کا تعلق ہے ان کا ردِ عمل مستحسن ہے لیکن جس حدتک غزل کی Lyricism اور حسیہ اظہارِ حقیقت کا تعلق ہے یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو اپنی نظموں میں منتقل نہ کرسکے ۔ اخلاقی شاعری کا ایک یہ بھی وطیرہ رہا ہے کہ وہ کلاسکی اسلوب سے متاثر رہی ہے ۔ اگر مولانا حالی میں قومیت کا جوش اور ولولہ نہ ہوتا تو شاید وہ بھی پوپ (انگریزی شاعر) کی طرح صرف کلاسکی اندازِ سخن کو اپناتے چنانچہ "مناجاتِ بیوہ" اسی انداز کی ایک چیز ہے لیکن چونکہ وہ اپنے مذہب میں ملٹن کی طرح اصلاح پسند واقع ہوئے تھے اس لئے ایک ایسی صنف کو اپنایا جو مذہبی کام انجام دے چکی تھی ۔ یعنی "مسدس"۔ شاید یہ کہنا زیادہ غلط نہ ہوگا کہ "مسدس" کی صنف خطابت کے لئے غزل یا نظم کے فارم سے زیادہ موزوں ہے ۔ مولانا کا واعظانہ رجحان اور ان کی نظموں کا کھردراپن اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ غزل کی Lyricism اور اس کا حسیہ اظہار مولانا کے مصلحانہ طرزِ تخاطب سے برسرِ پیکار رہا ۔

غزل کی نغمگی کی آمیزش فکر کے ساتھ برابر ہوتی رہی ہے ۔ یہ عرفی، فیضی، غالب، اور اقبال کے یہاں ہے ۔ لیکن اس کی آمیزش ایسے تصورات کے ساتھ نہیں ہوسکتی جو کسی اخلاقی نظام کے بنے بنائے ہوئے تصورات ہوں اور وہ تصورات خود فنکار کے اپنے تجربات اور مشاہدات نہ ہوں ۔ اس کی واضح مثال ہمیں علامہ اقبال ہی کی شاعری میں ملتی ہے ۔ ایک طرف ان کی وہ غزلیں اور نظمیں ہیں جن میں خود ان کے اپنے خیالات، تاثرات کا فنی ردّ و قبول کے بعد ان کی شخصیت کا حصہ بن کر اُبھرے ہیں ۔ دوسری طرف ایسی مثنویاں، غزلیں اور نظمیں ہیں جہاں وہ مبلغ کی حیثیت سے بول رہے ہیں ۔ ناظم اور شاعر کا یہ فرق ایک ہی شاعر کے

یہاں موجود ہے اور یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم صورت اور معنی کے باہمی اثر پذیری کے قانون کو دریافت بھی کر سکتے ہیں۔

شعر کہنا ایک (Craft) فن بھی ہے۔ یوں تو خیالات کے اظہار کے اور بھی اسلوب ہیں۔ آپ باتیں کرتے ہیں، بحث مباحثہ اور مناظرہ کرتے ہیں، تقریر کرتے ہیں، مقالہ لکھتے ہیں، ڈرامہ اور ناول لکھتے ہیں لیکن سب کا طرزِ تخاطب الگ الگ ہے۔ ممکن ہے آپ ایک ہی خیال کو مختلف فنوں کے ذریعے پیش کرنا چاہیں۔ لیکن ہر فن کے چند حدود ہیں جو اس کے اپنے نہیں ہیں جو دائمی اور اٹل نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ ایسے حدود یا آداب ہیں جو آپ نے مخصوص مقاصد کے ماتحت متعین کئے ہیں۔ یہ حدود زیادہ سے زیادہ اثر پیدا کرنے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ انسانی ذہن کو راغب کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ آپ کہیں استدلال سے کام لیتے ہیں، منطقی حدود میں گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کہیں اپنی شخصیت کو پس پشت ڈال کر چلتے پھرتے انسانوں کی زبان سے حقیقت کو پیش کرنا چاہتے ہیں اور کہیں محسوسات اور جذبات کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان تمام صورتوں میں گو بظاہر مقصد ایک ہی ہے، اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا۔ لیکن راستے مختلف ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ مقصد ذریعے کی صداقت کو ثابت کرتا ہے لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا واقعی وہ مقصد حاصل بھی ہوا؟

ادب سماجی تعلیم کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن ایک ایسی تعلیم کا ذریعہ جو انسان کی نفسیات کو ڈھال سکے۔ جو اس کے ضمیر اور خمیر کا حصہ بن سکے۔ جو انسانی شعور کو اس حد تک بیدار کر سکے کہ اگر وہ خواب کے عالم میں بھی اس کے اثر کو بھلانا چاہے تو نہ بھلا سکے۔ اس معنی میں اسٹالین نے فن کار کو انسانی روح کے انجینئر کے نام سے یاد کیا ہے۔ ادب زندگی پر دو رویہ پھٹتا ہے ایک طرف تو وہ خارجی حقائق کو دیدنے کے لئے اکساتا ہے اور دوسری طرف انسانی نفسیات کو نئی قدروں کے ساتھ ہم آہنگ کرتا ہے۔ ادب اگر مشاہدات محسوسات اور

تصورات کے اس خزانے کو ہاتھ نہیں لگاتا ہے جن کی یاد آوری پر خود ہمیں اختیار نہیں ہے تو پھر ادب کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ انسان کا حافظہ بڑا زود فراموش ہے۔ وہ کرب و درد، سنگین جرائم، فاقہ، قحط، جنگ سب کی یادیں فراموش کر دیتا ہے۔ وہ اپنی محبت کے طوفانی ہنگاموں کو بھی بھول جاتا ہے، وہ ماں کی محبت اور بچے کا ہمکنا سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔ ایک فن کار کو ہم پر اسی لئے برتری حاصل ہے کہ وہ ہماری ان تصویروں کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ واقعات کو انگلیوں پر گنتا نہیں بلکہ ان کی چلتی پھرتی تصویروں کو قلمبند کر دیتا ہے۔ وہ خارجی حقائق کی تصویر کے ساتھ اس کسک، درد اور اُمنگ کو بھی پیش کرتا ہے جو ان سے متعلق تھے اور پھر ان جذبات سے متاثر ہو کر ان عملی حرکات کے سروں کو آگے کر دیتا ہے جن سے ایک قدم آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ اگر ادب میں یہ تین رُخی تصویر نہیں اُبھرتی ہے تو ہم اسے ناقص ادب سمجھنے پر مجبور ہیں۔ کیونکہ دنیا کے عظیم فن کار اپنی مشعلیں لئے کھڑے ہیں۔ یہ مرتبہ ہم اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتے ہیں جب تک ہم انسانی روح کی انجنیری سے واقف نہ ہوں۔ گورکی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بہت قدیم زمانے سے انسانی روح کو گرفتار کرنے کے لئے ادیبوں نے ایک جال پھینک رکھا ہے" اگر اس جال میں انسانی روح گرفتار نہیں ہوتی ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارا جال ٹوٹا ہوا ہے یا ہم اپنے فن سے واقف نہیں ہیں۔

لیکن یہ فن صرف صورت کی بازیگری سے پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ دنیا کی کوئی عملی چیز جامد اور ساکن نہیں ہے۔ صرف اوپری صورتوں کی شبیہیں اُتارنے کا نام ادب نہیں ہے حقائق کے سینے میں اُتر کر اندرونی تضاد کو معلوم کرنا، جدلیاتی طریق کار کو پہچاننا، نئی صورت کی بنتی ہوئی شکل کو دیکھنا ضروری ہے۔ ادب کے حدود ان ہی معنوں میں مصوری اور بُت تراشی کے حدود سے وسیع ہیں۔ شعر و ادب کا مسالا انسانی حافظہ اور الفاظ ہیں اور جب یہ اظہار کا پیکر اختیار کرتے ہیں۔ تو صرف تصویروں کو ذہن پر مرتسم نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ

ایک مخصوص جذبے، اور عمل کی قوت کو بھی بیدار کرتے ہیں۔ ایک وہ ادیب یا شاعر جو ادب کو جذبے اور عمل کی قوت سے محروم کرنا چاہتا ہے وہ بالعموم صورت پرستی کا شکار ہو جاتا ہے کیونکہ اس کی نظر ظاہری روپ پر ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ظاہری روپ کی نقاشی میں کامیاب بھی ہو سکے۔ لیکن اس کا ادبی تجربہ ہمیشہ ادھورا ہوگا۔ کیونکہ وہ حقیقت کو معلوم کرنے سے عاجز رہتا ہے وہ متحرک حقیقت کے مقابل اپنی جس غیر جانبداری کا اظہار کرتا ہے وہی غیر جانبداری اسے مرتی ہوئی حقیقت سے زیادہ قریب کر دیتی ہے۔ خواہ وہ اس مرتی ہوئی حقیقت سے اپنی جذباتی علیحدگی کا اظہار ہی کیوں نہ کرے، کیونکہ اس مرتی ہوئی حقیقت کا تجزیہ مع اپنے جذباتی میلانات کے اس کی شخصیت کا جزو بن چکا ہے۔ انیسویں صدی کے یورپی حقیقت نگاروں نے اکثر و بیشتر اس قسم کی مرتی ہوئی حقیقت کی تصویر کو بڑی بے تعلقی کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن اس کا اثر، افسردگی، زندگی کی بے مقصدیت اور زمانے کے بہاؤ میں انسان کی مجہول انفرادیت کے تصورات کو مرتب کرتا ہے۔ یہاں ان حقیقت نگاروں سے جو چیز سیکھنے کی ہے وہ ان کا اختصار، جامعیت اور لفظوں کا سائنٹیفک استعمال ہے۔ وہ ہر لفظ کو صحیح جگہ پر استعمال کرتے ہیں۔

رومانوی دور میں جو اظہار خیال میں شدید جذباتیت، غلو اور مبالغہ تھا ان کے ردعمل میں وہ غیر جذباتی لہجہ، اختصار اور واقعیت نگاری کو جنم دیتے ہیں۔ جہاں تک سائنٹیفک طرز تحریر کا تعلق ہے اسے ہم اپناتے ہیں۔ لیکن جہاں انھوں نے جذباتی بے تعلقی کے پردے میں نامیہ زندگی کی بڑھنے والی طاقت کے نہ صرف جذباتی میلان ہی کو فراموش کیا ہے بلکہ اس کو دیکھنے سے بھی گریز کیا ہے، ہم انھیں حقیقت دشمن بھی سمجھتے ہیں کیونکہ ایک مرتی ہوئی حقیقت کے ساتھ تو جذباتی بے تعلقی کسی حد تک برتی بھی جاسکتی ہے لیکن بڑھتی ہوئی حقیقت جو انسانیت کی فلاح و بہبود لانے والی ہے اس کے ساتھ جذباتی بے تعلقی کا اظہار پوری انسانیت سے دشمنی کرنے کے برابر ہے۔ پھر یہ کہ ادب کو جذباتی

اور حرکتی میلان سے خارج کر دینا سماج دشمنی کی کوشش ہے ۔ ہمارا علم ، ہمارا فن سب سماجی کوششوں کا نتیجہ ہے اسے صرف سماجی ترقی ہی کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اگر ہمارا فن نئے اور پرانے کی جنگ میں اپنی طرفداری اور جذباتی میلان کا اظہار نہیں کرتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر پرانے کا طرفدار ہے ۔ میں نے اس چیز کا اظہار اس لئے کیا ہے کہ یہ تمام باتیں جن کا تعلق بنیادی اعتبار سے معنی کے ساتھ ہے ۔ صورت پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں ۔

یورپ میں رومانیت کی تحریک پرانے عقائد اور خیالات کے خلاف ایک بغاوت بھی تھی ۔ لیکن چونکہ اس بغاوت کی بنیاد سماجی ارتقار کے قانون پر نہ تھی ۔ اس کا اظہار خالص جذباتی تھا ۔ اس میں سائنس اور فکر کی آمیزش نہ تھی ۔ اگر ایک طرف اس نے تصوراتی جنت کا خواب دکھایا تو دوسری طرف ماضی کی اندھا دھند پرستش بھی کی لیکن بنی نوع انسان کی بہبودی کے حق میں اس کا جذباتی اظہار اور کلاسکی صورت پرستی کی مخالفت اس کے ایسے کارنامے ہیں جنھیں تاریخ فراموش نہیں کر سکتی ۔ لیکن اس تحریک کا جذباتی مبالغہ ، توازن ضرورت کے تعینات کو نہ پہچانا ۔ یہ تمام چیزیں حقائق کی مصوری کو موثر بنانے میں ناکام رہی ہیں ۔

اس طرح واقعیت نگاری (Naturalism) جو یورپ میں حقیقت نگاری کے روپ میں اُبھری ۔ اشیار کی جزئیات نگاری میں اس بری طرح ڈوب گئی کہ حقیقت اس کی نگاہ سے بالکل ہی پوشیدہ ہو گئی ۔ دنیا کا کوئی بھی ادب تعمیم کے بغیر وجود میں آ ہی نہیں سکتا ہے اور جس طرح ہر تعمیم میں تفصیل موجود ہوتی ہے ۔ اسی طرح ہر تفصیل میں تعمیم کا جزو موجود ہوتا ہے ۔ صرف تفصیل نگاری اتنی ہی مُضر ہے جتنی کہ صرف تعمیم نگاری ۔ جس حد تک کہ صرف تعمیم نگاری ادب کو فلسفہ بنا دیتی ہے ۔ اسی طرح صرف تفصیل نگاری ادب کو سطحی رپورٹ میں تبدیل کر دیتی ہے ۔ تعمیم کے فقدان سے فکر کی قوت گھٹنے لگتی ہے ۔ یہ تمام

خامیاں سماجی زندگی کی بنیادی حقیقت کو نہ جاننے سے پیدا ہوتی ہیں جس طرح سنگریزوں کے جگر کو چیر کر ہی ہم اس کی اصل ماہیت کو سمجھ سکتے ہیں اسی طرح انسانی روح کو ہم سماجی زندگی کی متضاد طاقتوں کی نبرد آزمائی میں گرفتار کر سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ سماج کا ہر فرد اس جنگ میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کتنے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں تو کتنے نئی زندگی کی مخالفت کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر تو ایسے ہوتے ہیں جو میدانِ کارزار میں اور اپنے ذہن میں اس جنگ کو لڑتے رہتے ہیں۔ کسی بھی دور کی سماجی حقیقت کو گرفت میں لانے کے لئے آپ ان کرداروں سے پرہیز نہیں کر سکتے ہیں جو خواہ کسی وقت میں اقلیت ہی میں کیوں نہ ہوں لیکن یہ جنگ لڑتے جاتے ہیں۔

اب کرداروں کے ٹائپ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایک حقیقت نگار صرف اسی ٹائپ کے کرداروں کی مصوری سے حقیقت کو گرفت میں نہیں لا سکتا ہے۔ جو مرتی ہوئی حقیقت یا اپنے ماحول کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس میں حقیقت کی تصویر موجود ہے لیکن وہ ادھوری ہے۔ پوری حقیقت کو پیش کرنے کے لئے اس ٹائپ کے کرداروں کو منتخب کرنا ضروری ہے جو گولیوں سے گھائل ہو کر بھی انسانیت کا پرچم اڑاتے جا رہے ہیں۔

یہیں پر صورت اور معنی کی باہمی آمیزش اور ان کے جدلیاتی طریق کار کے سمجھنے کا موقع بھی آتا ہے۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ہم حقیقت کی جدلیاتی صورت کو سمجھ گئے ہیں۔ ہمارے سامنے وہ کردار اور مظاہر بھی ہیں جو اس حقیقت کے حامل ہیں۔ ہم ان چیزوں کو کس طرح پیش کریں کہ اگر وہ ایک طرف حقیقی، زندہ اور متحرک معلوم ہوں تو دوسری طرف ہمیں جذباتی انفعال اور عمل کے لئے بھی بیدار کرتی رہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جسے ہم الگ الگ نظم و نثر کے اصناف کو سامنے رکھ کر ہی جانچ سکتے ہیں۔

ناول کا میدان افسانے سے مختلف ہے۔ اس طرح شاعری کا میدان نثر کے میدان سے مختلف ہے۔ میں پہلے شاعری کو لیتا ہوں۔ اگر ہم منظوم ڈرامے اور منظوم ناول کو چھوڑ دیں

جن کا تعلق حقیقت میں افسانے FICTION سے ہے اور صرف اس قسم کی شاعری کو لیں
جس میں زندگی کے تاثرات، خیالات اور مشاہدات کو ایک نظریاتی وحدت اور ضبط کے
ساتھ نظم کیا جاتا ہے تو ہمارے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شعر کی زبان حسیہ تصورات کی زبان ہے اور یہی سبب ہے کہ شعر
کے دقیق سے دقیق تصورات بھی ہمارے اندر کسی نہ کسی احساس یا ایسی ذہنی تصویر کو بیدار
کرتے ہیں جس کا تعلق براہ راست احساس ہوتا ہے۔

ہم نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس شعر میں سنگ کا لفظ کسی مخصوص شکل کے سنگ کی تصویر نہیں ابھارتا ہے۔ بلکہ
اس چوٹ کا احساس بیدار کرتا ہے جو پتھر کھانے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ سر کا لفظ آتے
ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ابھی ابھی سر پھوٹا ہے۔ ممکن ہے کہ شاعر اس جذبے کی ترجمانی
کسی اور طرح بھی کر لیتا لیکن ایک داخلی احساس کو خارجی تصویر کے ساتھ ہم آہنگ کر دینا
بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ماضی کے کتنے تصورات بیک وقت ذہن میں گھوم جاتے ہیں اور
شاید یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ بچپن ہی کے زمانے میں زیادہ تر سر پھوٹتے بھی ہیں۔ بہرحال
اس شعر میں جو ذہنی تصویر پیش کی گئی ہے اس کا ظاہری مقصد تو ایک جذبے یا احساس کی ترجمانی
ہے۔ حالانکہ اصل مقصد ایک اخلاقی نکتہ کی ترسیل ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اخلاقی نکتہ کسی شعر میں اتنا
غالب آجائے کہ ترسیل جذبہ ختم ہو جائے تو اس صورت میں شعر ناکامیاب ہوگا۔

اس سے پتہ چلا کہ احساس ادراک سے الگ نہیں ہے۔ یوں تو کسی بھی چیز کا ادراک
احساسات کے بغیر ناممکن ہے لیکن جب ادراک کی ہوئی چیزوں کے تصورات صداقت
کی علامتیں PLATITUDES بن جاتے ہیں تو وہ احساسات سے آزاد بھی معلوم ہونے
لگتے ہیں۔ مادی علوم کے ذرائع ادراک انسان کے احساسات Sensations کو

ہیں لیکن مادی علوم کا فلسفہ بھی تجرید Abstractions سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا ہے۔ یہاں اس قسم کے فلسفے اور علوم کا تذکرہ نہیں ہے جو خالص تخیلی اور تصوراتی ہیں اور جن کی بنیاد انسانی عمل، تجربے اور احساسات پر نہیں۔

شعر فلسفے کے مقابلے میں اسی لئے زیادہ موثر ہے کہ شعر ادراک کے پورے طریق کار کو چھونے کی کوشش کرتا ہے اور فلسفہ طریق کار کو چھوڑ کر صرف تعمیمات کو پیش کرتا ہے۔ یہی بنیادی امتیاز دونوں کے ذریعۂ اظہار کو بھی متاثر کرتا ہے۔ شاعر کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے تاثرات، مشاہدات اور علوم کے حسی رشتوں کو چھوڑ کر جذبے اور عمل کی قوت کو بیدار کرے۔ اگر ذہنی تصویریں Images حسی نہیں ہیں تو وہ جذبے کی آفرینش کا سبب نہیں بن سکتی ہیں اور اگر جذبہ بیدار نہ ہو تو حقائق کو ادراک کرنے کی قوت گھٹ جاتی ہے۔ یہی ضرورت شاعر کو تشبیہہ اور استعارے کی زبان استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک تشبیہہ اور استعارے عام مشاہدوں کے نہ ہوں گے اور ان کا تعلق ہماری قوتِ حسیہ سے نہ ہوگا تو وہ ترسیل جذبہ بھی نہیں کرسکتے ہیں۔ شاعری موسیقی سے بھی اسی ضرورت کے ماتحت قریب آئی کہ موسیقی جذبات کو چھونے میں بڑی سُرعت اور تندی سے کام لیتی ہے۔ لیکن موسیقی کے ذریعے حقائق کا ادراک بہت مشکل ہے تاوقتیکہ اصوات ایسے الفاظ کے جامے میں نہ ہوں جو قوت مدرکہ کو بھی بیدار کرسکیں۔ شاعری کی صورت اور معنی پر بحث کرتے وقت ان دونوں چیزوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ تشبیہہ اور استعارے دور از کار، پیچیدہ، مرکب اور غیر معمولی تجربے یعنی عالم خواب کے نہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ ان کے اظہار میں ایک ایسی سنگیت ہونی چاہیئے جو ترسیل جذبہ کو آسان کردے اور یہ سنگیت خود شاعر کے منظم جذبات اور اظہارِ فکر کی وحدت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ رغبت کا جذبہ تو خیر حسین تشبیہہ اور استعارے سے اُبھرتا ہے لیکن نفرت کا جذبہ بیدار کرنے کے لئے اگر آپ مسخ شدہ تشبیہہ اور استعارے سے کام لیں گے، تو آپ ناکام رہیں گے

کیونکہ داغدار اور مکروہ ذہنی تصویروں سے تکدر تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن قدر آفریں نفرت کا جذبہ بیدار نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ کام پیپ اور ناسور کی تشبیہوں سے نہیں چل سکتا ہے۔ قدر آفریں نفرت اور تخریب کا جذبہ اتنا ہی مقدس ہے جتنا تعمیر اور تخلیق کا اور یہ جذبہ اسی وقت ہمیں عمل کی طرف راغب کر سکتا ہے جبکہ ہم اس جذبے کو زندگی کی ایک حسین قوت بنا کر پیش کریں۔ اس جذبے کی بڑی اچھی ترجمانی مخدوم محی الدین نے "حویلی" میں کی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ شاعری میں اس قسم کے معنی اور مقصد کے لئے کس قسم کی صورت کی ضرورت ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ معنی ہمارے اظہار کے طریقے کو کیونکر متاثر کرتا ہے دُنیا کی تمام زبانوں کے چند حدود ہیں۔ جو زبان اور اظہارِ خیالات کے اسالیب ہم نے ورثے میں پائے ہیں، وہ ہمارے مقاصد اور ترسیل پر اثر انداز بھی ہو سکتے ہیں۔ کوشش یہ کرنی ہے کہ یہ ان کے حدود کم از کم ہمارے اظہارِ خیال میں حائل ہوں کیونکہ تاوقتیکہ زبان میں خاطر خواہ سماجی عمل سے ترقی نہ ہو سکے۔ اظہارِ خیال میں زیادہ لوچ اور بانکپن پیدا نہ ہو سکے۔ ہم اس کے حدود پر قابو بھی نہیں پا سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ ہمارا مقصد صرف اظہارِ خیال نہیں ہے بلکہ اپنے خیالات اور جذبات کو پُرتاثیر بنا کر پیش کرنے کا ہے، ان میں زیادہ سے زیادہ دلکشی، زیادہ سے زیادہ جاذبیت اور زیادہ سے زیادہ حُسن پیدا کرنے کا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں شعری ادب کے تمام خزانے کو پرکھنا ہے، لوک گیت اور عوامی سنگیت کو جانچنا ہے۔

ہمارے وہ انقلابی شعراء جو اردو زبان میں شاعری کرتے ہیں، ان کے لئے غزل کی زبان سے بیک وقت بغاوت کرنا آسان نہیں ہے کیونکہ غزل کی زبان میں سات سو سال کا شعری خزانہ دفن ہے اور یہ شعری خزانہ تمام تر درباری نہیں ہے۔ اس میں عام انسانوں کی دُکھی زندگی کا رس۔ ان کی بغاوت، ان کا عزم، اعلیٰ ہمتی سبھی کچھ موجود ہے۔

آج اس خزانے کو کھنگالنے کی ضرورت ہے اور یہ کام مٹی سے سونا چھاننے کے برابر ہے سونا ذرات ہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اگر غزل کے شعری پیکر پر ایک طرف تصوف کا سایہ منڈلاتا رہا تو دوسری طرف اس نے رومانوی بغاوت، Lyricism جذباتی اور فکری اعلان اور حسیہ اظہارِ خیال کا موقع بھی بہم پہنچایا ہے۔ دوسری طرف اس کی معنویت میں ایک گہری انسان دوستی اور سماجی تنقید کے گراں بہا موتی بھی چھپے ہوئے ہیں ان کی انسان دوستی خواہ کتنی ہی پرانی نہ ہوجائے ہمارے لئے بالکل بے معنی نہیں ہوسکتی ہے۔ ان کی روایات کو رد و قبول کے بعد ایک نئی کیفیاتی تبدیلی کے لئے آگے بڑھانا ہمارا ہی کام ہے۔

ہمارے وہ انقلابی شعرا جنھوں نے غزل کی Lyricism اور رومانوی انقلابیت کو سائنٹیفک انقلابی معنی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، کافی مقبول ہوئے ہیں۔

یہ دوسری بات ہے کہ اکثر ان کا رومانوی تصورِ حیات انقلابی معنی ابھارنے سے قاصر رہتا ہے۔ یہ خامی ان کے نظریئے کی ہے جو اظہار پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوتا ہے کہ غزل کا ابہام ختم کر دے۔ اگر انقلابی شعور تیز ہو، جذبات انقلابی بانکپن کے حامل ہوں تو ہماری نظمیں اور غزلیں ایک نئے حُسن کے ساتھ اُبھر سکتی ہیں۔ یہ حُسن جدید ترین شعراء میں ساحر نے "نیا سفر ہے پُرانے چراغ گل کر دو" اور "آہنگِ انقلاب" میں پیدا کیا ہے۔ یہ حُسن بعض بعض ان نئی غزلوں میں نظر آجاتا ہے جن میں ایک تسلسل اور وحدتِ خیال کے ساتھ انقلابی معنی کا اظہار کیا گیا ہے۔ انقلابی معنی کو غزل کی Lyricism کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کرنا کہ ایک نیا نغمہ، ایک نئی آگہی اور لفظوں میں عمل و حرکت کی دھار پیدا ہو جائے ایک مشکل کام ہے۔ لیکن فن تو جگر کاوی کا کام ہے۔ اور آج کے ادیب کو تو شاید پہلے سے زیادہ محنت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ وہ زیادہ باشعور ہے اور اس کی توجہ صورت و معنی دونوں ہی پر ہوتی ہے۔

وہ ڈھیلاپن، ابہام اور ایہام، گنجلک خیالات، دور از کار تشبیہہ اور استعارے اور خالص تصوراتی اظہار کو برداشت نہیں کرسکتا ہے۔ ایسی صورت میں جلدی سے سپرڈالدینا اور ماضی کی صحت مند روایات سے اس حد تک بغاوت کرنا کہ شعر و نغمہ کی صورت ہی مسخ ہو جائے۔ اپنی کمزوری کا اعلان کرنا ہے۔ روس میں پشکن نے جس وقت شاعری شروع کی تو اس کے پاس تو اتنا بھی ادبی ورثہ نہیں تھا جتنا کہ ہمارے پاس تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جبکہ روس کے اُمراء ادبی مورچے پہ فرانسیسی ادب کی نقالی کر رہے تھے۔ لیکن پشکن نے اپنی زبان کے اظہار کو خراد اور مانجھا۔ لوک گیت اور کتھاؤں سے چیزیں مستعار لیں، جمہوریت اور آزادی کے جذبات اور خیالات سے آراستہ کرکے روسی عوام کے لئے ایک نئی شاعری کی داغ بیل ڈالی جو "شرفا" کی شاعری سے مختلف ہے، جو عوامی گیت کی سطح سے بلند ہے اور جس میں موسیقی اور رس، زندگی کی تڑپ اور آزادی کا جذبہ روس کے جمہوری ادب میں سب سے زیادہ گراں قدر ہے آج پشکن پوری قوم کی زبان پہ چڑھا ہوا ہے۔ پشکن، انھیں معنوں میں سب سے زیادہ روسی ہے۔ اس کا جواب دینا کم از کم میرے لئے مشکل ہے کہ انگلینڈ ایک دوسرا شکسپیئر، جرمنی ایک دوسرا گوئٹے اور ایران ایک دوسرا فردوسی یا حافظ کیوں نہ پیدا کرسکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج بھی ان کا کلام نہ صرف ان کے ملکوں میں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی بڑی وارفتگی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ میں اسے کوئی معجزہ نہیں سمجھتا اور نہ یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ اب شاعری کا دور ختم ہوگیا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ رومانوی دور کے بعد شاعری کو بے جان حقیقت نگاری اور صورت پرستی نے بڑا نقصان پہنچایا ہے اور یہ چیزیں سرمایہ دارانہ نظام کے انحطاط کی لائی ہوئی ہیں اور جب اسے اپنی خالص صورت پرستی اور بے جان کیفیت کا احساس ہوا تو اس نے داخلی، لاشعور اور دھندلکے میں قدم رکھنا شروع کیا۔ اس نے سرمایہ دارانہ نظام کے تضاد سے گریز کرنے کی بھی کوشش کی اور جس حد تک یہ زندگی کے مسائل سے گریز کرتی رہی یہ ذہنی انتشار اور غیر

ہم آہنگی کو بھی جنم دیتی رہی۔ ذہنی انتشار اور غیر جذباتی اظہار کے لئے اس نے ایسی صورتیں بھی گھڑیں جو جذباتی تنظیم کو متزلزل تو کرسکتی ہیں لیکن نئی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کا امکان نہیں رکھتی ہیں۔ اس قسم کی شاعری ہماری زبان میں بھی ملتی ہے لیکن وہ بہت تھوڑی سی ہے۔ اس کا اظہار میراجی اور اس قسم کے دوسرے شعراء کی بلینک ورس میں ہوا ہے۔ یہ صنف ہماری زبان میں نئی ہے۔ اس کی تاریخ اسمٰعیل میرٹھی کے وقت سے مرتب کی جاسکتی ہے۔ بلینک ورس صرف ایک صنف ہے اور صورت کا اطلاق صرف صنفِ سخن پر ہی نہیں ہوسکتا ہے۔

میرے خیال میں بلینک ورس کی ایسی ہی نظمیں کامیاب ہوسکتی ہیں۔ جنھوں نے داخلی سنگیت اور حسیہ حقیقت نگاری کو جگہ دی ہے۔ اس ضمن میں شاعری کو ایک نئی دولت حاصل ہوئی ہے۔ وہ دولت تشبیہہ واستعارے کی بلند عمارتوں کی ہے۔ یہاں ایک استعارہ ایک مکمل تصویر کی صورت میں پھیلتا ہے اور پھر وہ تصویر اپنا سفر آغاز کرتی ہے۔ اس قسم کی فلمی حقیقت نگاری کی گنجائش فی الحال بلینک ورس میں زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن پابند نظموں اور غزلوں میں اس کا نباہ مشکل نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہم پابندی کے مفہوم کو بدل دیں۔ قافیہ اور ردیف کے التزام خصوصی کی جگہ اگر ہم وزن الفاظ کی قید لگا دیں تو پابند نظموں کے میدان میں زیادہ وسعت پیدا ہوجائے گی۔ لیکن یہ تمام تجربے ہمارے مقصد اور معنی کے پابند ہیں۔ اگر ہم اپنے شعور اور جذبے کو ایسی صورت اور ایسی تصویروں میں پیش کر رہے ہیں، (جن سے عوام مانوس نہیں ہیں)۔ جو اُن کی تعلیم میں مددگار نہیں ہو رہے ہیں تو ہمیں نئے تجربوں کو ترک کرکے، ان اظہار کو اپنانا چاہیئے جن سے وہ مانوس ہیں۔ جن کی روایت سے وہ آشنا ہیں۔ آج کے دور میں جبکہ ہم کلچر اور ادب کو عام کرنا چاہتے ہیں اور اسے عوام کی تعلیم کا ذریعہ بھی بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں اس بات کا خاص طور سے لحاظ رکھنا ہے کہ وہ کونسی سنگیت، کون سا پیکر اور کون سا اظہار کا طریقہ ہے جو اِن کے دلوں میں گھر کرلیتا ہے۔ اگر ایک

طرف ادیب عوام سے سیکھتا ہے تو دوسری طرف ان کو کچھ دیتا بھی ہے۔ سیکھنے سکھانے کا یہ طریقہ ترسیل وتخاطب اور تعلیم کی نفسیات سے آزاد نہیں ہے۔ اگر آپ عوام کے سر پہ کھڑے ہو کر بولیں گے اور اس سے مُراد ان کی تعلیم لیں گے۔ تو وہ دن دُور نہیں جبکہ وہ یہ کہہ دیں کہ زبان یار من ترکی ومن ترکی نمی دانم۔ یہ کام کبھی کبھی خطابت سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس خطابت کو شاعری سے ہم آہنگ ہونے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہم ترسیل خیالات کے ساتھ ساتھ شعری ادب کی تخلیق بھی کرتے جاتے ہیں۔ ہم جذبات سے ایسے سانچے مرتب کرتے جاتے ہیں جو جاندار اور حسیہ ہوتے ہیں۔ جو برسوں ذہن ودماغ میں رہکے اور بسے رہتے ہیں۔ یہ خوبی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جبکہ ہم انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کریں۔ اسے سماجی رشتوں میں رکھ کر دیکھیں اور ان رشتوں سے متعلق کی ہوئی جذباتی تنظیم کی ساخت کو دیکھ کر یہ معلوم کریں کہ وہ کون سے محرکات ہیں۔ جن کی کسک صدیوں تک سینوں میں بند رہتی ہے۔ وہ کون سے جذبے ہیں جو موت سے بے خبر بنا کر آگے دھکیل رہے ہیں۔ وہ کونسا شعور ہے جو سینے کے داغ کو کھرچ کھرچ کر مٹاتا رہتا ہے۔ یہ انسان گوشت پوست کا انسان ہے۔ اس کے ساتھ اس کے جذبات اور خیالات، کی بھی تاریخ ہے۔ یہ اپنی تاریخ غیر شعوری جذبے کے ماتحت بھی بناتا رہا ہے اور آج شعوری جذبے کے ماتحت بھی بنا رہا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو انسان ہمارا مخاطب ہے۔ وہ شعور اور جذبات کی کونسی منزل میں ہے۔ اس کے شعور کو مہمیز کیونکر لگائی جا سکتی ہے۔ اس کے جذبات میں کیونکر طوفان اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اس کا بہت کچھ سراغ ان ادبی سانچوں میں بھی مل سکتا ہے جنھیں ہمارے انسان دوست شعراء چھوڑ گئے ہیں۔ اگر وہ جذباتی سانچے موسیقی سے ہم آمیز ہیں تو ہمیں یہ سوچنا پڑے گا کہ کہیں ہمارا تیر نشانے سے خالی تو نہیں جا رہا ہے۔ وہ سینے جنھیں ہم برمانا چاہتے ہیں ہمارے خون جگر سے پیوست ہیں کہ نہیں۔ مخاطب اور خطیب کی یہی قربت، شاعر اور سماج کا یہی رشتہ اسے نہ صرف عوام کی

زندگی سے قریب رکھتا ہے بلکہ اس کے خیالات اور جذبات سے بھی قریب کر دیتا ہے اگر کسی شاعر کے کلام میں اس کا اپنا ماحول، اس کا اپنا کلچر اور اپنی تاریخ نہیں ہے تو وہ بین الاقوامی سطح پر نہیں پہنچ سکتا ہے۔ وہ اپنے ملک کے سماجی رشتوں کی روشنی میں اپنے ہی ملک کے انسانوں کے ضمیر اور خمیر کو دیکھنے کے بعد دوسرے ملکوں کے انسانوں تک پہنچتا ہے۔ جس حد تک اس کی تعلیمات اپنے ملک کے انسانوں کے لئے صحیح ہوتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے انسانوں کے لئے بین الاقوامی صداقت کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ جب وہ اس جدلیاتی طریق کار سے قومیت کی سطح سے بین الاقوامی سطح پر پہنچتا ہے تو وہ پوری انسانیت کا نقیب بن جاتا ہے کیونکہ اس کرۂ ارض کے تمام انسانوں کے بُنیادی مسائل ایک ہی قسم کے ہیں۔ وہ ایک بہتر زندگی اور انسانیت کا وجدانی تصور چاہتے ہیں لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لئے شاعر یا ادیب اپنے کلچر کی قومی ہیئت کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے جو چیز اس کو بین الاقوامی رشتے میں گوندھتی ہے وہ اس کے کلام کا اشتراکی مواد ہے۔

نئے اور پُرانے کی جنگ ہر ملک اور ہر سماج میں ہوتی رہی ہے۔ دنیا کی تاریخ خود اپنے ملک کی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے۔ بین الاقوامی ادب کا مطالعہ اسی لئے کیا جاتا ہے کہ اپنے ادب اور اپنے مخاطب کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ لیکن جب اپنے ملک کے مظلوموں اور محکوموں کو ایک نئے مرحلۂ زیست کی طرف اکسانا ہوتا ہے تو اس تعلیم سے فائدہ اٹھا کر نئی حقیقت کو اسلاف کے محبوب لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ چونکہ حقیقت اور اظہار کا رشتہ جدلیاتی ہے اس لئے نئی حقیقت کے آنے سے پرانا لباس بھی بدل جاتا ہے لفظوں میں نئے معنی، تشبیہوں میں نئی قوت اور استعاروں میں نئی زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی بھی فن کار کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ وہ پرانی صورت کو اپنے نئے معنی پر اثر انداز نہ ہونے دے۔ بلکہ اپنے نئے معنی سے پرانی صورت کو ایک نیا روپ دیدے۔ عوامی ادب اور سنگیت کے بہت سے پُرانے فارم انہیں معنوں

میں اپنائے گئے ہیں۔

وہ نئی قوت جو اس طریق کار سے پیدا ہوتی ہے اس بات کے امکانات کو وسیع کر دیتی ہے کہ ملکی ادب بین الاقوامی ادب کے اثرات کو تیزی کے ساتھ قبول کر سکے۔ لیکن جب ادب کو صورت و معنی کے خانوں میں الگ الگ بانٹ کر صرف صورتوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو نہ صرف صورت پرستی ہی کا آنا لازم ہے۔ بلکہ ادب بے جان بھی ہو جاتا ہے۔

آپ اپنے معنی کا اظہار اپنی زبان کے الفاظ ہی کے ذریعے کرتے ہیں بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اس زبان کے الفاظ کی ایک تاریخ ہے۔ زندگی کے مختلف موڑ میں ان سے مختلف قسم کے اظہار کا کام لیا گیا ہے۔ غزل کی زبان میں اس کا خطرہ موجود ہے کہ اس میں ابہام باقی رہ جائے کیونکہ غزل کی زبان سے ابہام کا کام لیا گیا ہے۔ اس سے بچنے کا یہ راستہ نہیں ہے کہ ہم اس کی لغت ہی کو ترک کر دیں بلکہ یہ ہے کہ ہم اپنے خیال کی صفائی سے اس کے ابہام کو ختم کر دیں۔ پرانے تشبیہہ اور استعارے کے تصوّر آفریں رُخ کو بدل دیں۔

لیکن غزل کی زبان سائنس کی زبان نہیں بن سکتی۔ کیونکہ غزل کی زبان شعر کی زبان ہے۔ یہ ذہنی تصویروں کی تعبیرات کے لئے وضع کی گئی تھی۔ اب میں موجودہ دَور کی غزل کے چند ایسے اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جن میں ابہام قطعی نہیں ہے ؎

داغ ہیں آستانِ آدم پر ۔۔۔ آسمانوں کی جبہہ سائی دیکھ
بن گئے ہیں گناہ کے مدفن ۔۔۔ پارساؤں کی پارسائی دیکھ
اے نظامِ کہن کچھ آہٹ ہے ۔۔۔ وہ دبے پاؤں موت آئی دیکھ

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

سانس ہے گرم و تیز سینے میں ہوئی جاتی ہے دیر جینے میں
پھونک ڈالے جو نظمِ کہنہ تمام آگ ایسی ہو تیرے سینے میں

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

یہ بزمِ عام بھی اے دوست بزمِ عام نہیں
نگاہیں اُٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لئے

ابھی دُنیا کے کچھ نقش و نگار اشعار ہیں میرے
جو پیدا ہو رہی ہے حق و باطل کے تصادم سے

غمِ حیات وہی ، دَورِ کائنات وہی
جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

زمیں جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل
وہ رات ہے کوئی ذرہ محوِ خواب نہیں

بزمِ فطرت کا جمالِ آئینہ در آئینہ ہے
دور تک ختم نہیں سلسلے نظاروں کے

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں (فراق)

یہ تو اس قسم کے اشعار ہیں جن میں ابہام مطلق نہیں ہے ۔ اس قسم کے اشعار کے علاوہ نئی نظموں اور غزلوں میں ایسے بہت سے پُرانے رمز و کنائے استعمال کئے جاتے ہیں جن کی تصور آفرینی کا رُخ بدلا ہوا ہے ۔

مزاجِ عشق کو لازم ہے اب بدل جانا
کہ کچھ دنوں سے تو سنتے ہیں حُسن بھی ہے حزیں (فراق)

یا مخدوم کی نظم " انقلاب " کے تقریباً تمام ہی بند۔

اے جان نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لئے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

میرا ذاتی خیال ہے کہ مخدوم کے اس بند کو مسیح موعود کے انتظار شوق میں کوئی بھی ہندی مسلمان پڑھ سکتا ہے لیکن اس سے اس بند کے حسن میں کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح فراق گورکھپوری کے جو اشعار میں نے پیش کئے ہیں۔ اسے ہر وہ جماعت اپنے اپنے موقع پر پڑھ سکتی ہے جو زندگی، انقلاب، تبدیلی تغیر کے تصورات کو استعمال کرنا چاہتی ہے مگر اس موقع پرستی سے ان اشعار میں کوتاہی پیدا نہیں ہوتی ہے۔ شعر و ادب انسانی زندگی اور عوام الناس کے بارے میں ہوتے ہیں اور اگر ان کی زندگی کی کروٹ اور تڑپ کو کوئی جماعت استعمال کرے تو وہ قصور نہ تو شاعر کا ہے اور نہ شعر کا۔ وہ قصور اس طبقے یا جماعت کا ہے جو زبردستی شاعر کے مافی الضمیر کو اپنے ذاتی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے یا اپنے تصورات میں اسیر کرنا چاہتی ہے۔ فراق گورکھپوری کے اشعار کو بہت سے مسلم لیگی رہنما اپنی تقریروں کو زیب دینے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں تو گیا اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ فراق گورکھپوری نے مسلم لیگ کو مدنظر رکھ کر اشعار لکھے ہیں۔ میں خود علامہ اقبال کے مختلف اشعار کو استعمال کرتا رہتا ہوں حالانکہ جس شعور اور اغراض کے ماتحت انھوں نے اشعار لکھے ہیں وہ میرے شعور اور اغراض سے مختلف ہیں۔ تاہم ان میں جس حد تک خارجی حقائق کی خارجیت موجود ہوتی ہے، ان کا ذاتی عقیدہ ان اشعار پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے، میں انہیں استعمال کرتا ہوں۔ شعر میں اگر اتنی ہمہ گیریت اور آفاقیت ہو کہ وہ انسانوں کی اکثریت کی زبان پر چڑھ جائے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوتے ہیں کہ اس سے ہماری طبقاتی صف بندی

پر حرف آتا ہے۔ اکثر ہمارے اشعار کو ہمارے دشمن بھی گنگناتے ہیں خواہ وہ چھپ کر ہی
کیوں نہ گنگنائیں۔ گورکی اور روماں رولاں کی تعریف بورژوا طبقہ بھی کرتا ہے اور شولوخوف
کا ناول And quiet flows the Dawn مغرب کی بورژوازی میں بھی مقبول
ہوا۔ خواہ ان کی تعریف اور تنقید کا انداز ہم سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن ہمیں ورثے میں صرف غزل ہی کی زبان نہیں ملی ہے۔ ہمیں مثنوی، مرثیے اور نظم
کی زبان بھی ملی ہے۔ خارجی حقائق کے بیان میں ان اصناف کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ ان کے
بیان کی صفائی، سادگی، سلاست اور تسلسل غزل کی شدید داخلیت اور انشاء کو دُور کر سکتا
ہے۔ اسی طرح اردو مرثیے کا رزمیہ حصہ انقلابی نظموں کی تخلیق میں کامیاب ہو سکتا ہے۔
کیفی اعظمی نے اپنی انقلابی نظموں میں اس چیز سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ یہ تمام چیزیں تفصیلات
کی ہیں۔ ان پر ہمیں کام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

اُردو نثر کی صورتیں بھی اسی طرح معنی اور مقاصد سے متعین ہوئی ہیں۔ اردو نثر کی
ابتدا تصوف کے رسالوں اور داستانوں سے ہوتی ہے۔ صوفیوں کا مقصد کسی نہ کسی
صورت میں اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا تھا۔ اردو نثر کا کوئی معیار ان کے
سامنے نہ تھا اور نہ ان کے نثر نگاروں میں اتنی صلاحیت ہی تھی کہ وہ خود کوئی معیار
پیدا کر سکتے۔ کیونکہ اس وقت بہترین دماغ شعری ادب کی تخلیق میں لگے ہوئے تھے نتیجہ
یہ ہوا کہ ان رسالوں کی زبان نثری اظہارِ خیال کے لئے معیاری نہ بن سکی۔ مجبوراً نثری اظہار
کے لئے لوگوں کو فارسی نثر کی روایات کی طرف جھکنا پڑا، ابوالفضل اور ظہوری کی نثر صورت
پرستی کا بہترین نمونہ تھی۔ اس کے خیالات میں کوئی ندرت و جدت نہ تھی۔ وہ نثر اس
لئے لکھتے تھے کہ اپنی لفظی علمیت اور صناعی کا مظاہرہ کر سکیں۔ فارسی نثر کی یہ زبان "ہست
و بود" کو بدل کر رسمی خط و کتابت، تقریظ اور دیباچے کی زبان تو بن سکتی تھی لیکن
داستانوں کی زبان نہیں بن سکتی تھی۔ کیونکہ داستانوں کے لئے کسی حد تک روانی اور سلاست

کی ضرورت تھی ۔ نوطرز مرصع کی زبان مرصع ضرور ہے لیکن ادق نہیں ہے ۔ میر امن نے صحیح معنوں میں اردو نثر کی تخلیق کی لیکن باوجود اس امر کے کہ وہ بول چال کی زبان کو تحریر میں ڈھالنا چاہتے تھے لفظی صنعتوں کے التزام سے بالکل آزاد نہیں ہو سکے ۔ ہموزن لفظوں اور فقروں کے کہیں کہیں قافیہ کا التزام بھی ملتا ہے ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر میر امن کے ہاتھوں بھی فارسی نثر کی روایات سے بالکل آزاد نہ ہو سکی ۔ یہ بات کچھ میر اس ہی تک محدود نہیں ہے ۔ بلکہ غالب جیسا فن کار جس نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا وہ بھی ان رعایتوں کو برتتا رہا ہے ۔ غالب کی نثر کی تقلید اسی لئے مشکل ہوگئی ہے کہ وہ فنکارانہ نثر تھی ۔ اگر اس میں کہیں کہیں صورت و معنی کا بہترین امتزاج ہے تو کہیں صورت پرستی کی جھلکیاں بھی موجود ہیں ۔ اردو نثر لفظی صنعتوں کے بچے کھچے اثرات سے تو سر سید ہی کی کوششوں سے آزاد ہوئی ۔ سر سید بھی اس نتیجے تک بہت دیر میں پہنچے ۔ آثار الصنادید کی زبان تکلفانہ ہے لیکن سر سید تحریک کے نثری اسلوب بالکل ہی بے تکلفانہ ہیں ۔ یہ ضرورت ایک انقلابی تبدیلی کے باعث پیدا ہوئی ۔ جب تک خیالات رکے ٹھکے اور مسلمہ قدروں کے گرد گھومتے رہتے ہیں تو عام روش یہی ہوتی ہے کہ صورت گری پر زیادہ وقت صرف کیا جاتا ہے اور جب پرانی زندگی کے بطن سے نئے خیالات کے دھارے پھوٹنے لگتے ہیں تو وہ اپنے لئے نئے راستے بھی تلاش کرتے ہیں ۔ اگر سر سید اپنے آپ کو صرف پند و نصائح ہی تک محدود رکھتے تو اردو زبان میں اتنی وسعت نہ پیدا کر سکتے یہ وسعت ایسے موضوعات کے لانے سے پیدا ہوئی جن کا تعلق سائنس اور علوم طبیعیات سے تھا لیکن صرف موضوعات ہی نے سر سید کے اسلوب کو متعین نہیں کیا بلکہ ان کے پیچھے ان کا مقصد بھی شامل تھا ۔ وہ اپنے خیالات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا چاہتے تھے ۔ یہ دونوں ہی چیزیں ان کے اسلوب پر اثر انداز ہوئیں ۔ ان کی زبان متوسط طبقے کے لئے عام فہم اور کافی حد تک (Realistic) حقیقت نگار ہے ۔ لیکن سر سید کی زبان اظہار جذبات کے لئے کوئی راہ نہیں کھولتی ۔

وہ تخیلی اُڑان کے لئے توکسی حد تک کار آمد ہے کیونکہ سرسید کو بورژوا قدروں کو
مثالی بنا کر پیش کرنے کی بھی ضرورت تھی اور یہ مثالیت تخیل کی رنگ آمیزی کے بغیر ناممکن تھی۔
اس کی اچھی مثال ان کے تخیلی مضامین میں ملتی ہے۔ پھر بھی ان مضامین میں کوئی جذباتی بہاؤ
نہیں ہے اور یہ بات سرسید اسکول کے تمام ہی عقلیت پسند مصلحین کے لئے صحیح ہے ممکن تھا کہ
یہ لوگ ہمیں کچھ زیادہ دیتے۔ اگر یہ فرانس کے عقلیت پسند مفکرین کی طرح مادی فلسفے کے
پورے طور سے حامی ہوتے۔ پھر بھی سرسید نے اپنی ذاتی کوششوں سے بہت کچھ دیا ہے
اور اس اسکول کا یہی وہ تنہا شخص ہے جو تجدیدیت سے بہت کم متاثر ہے۔ ورنہ ڈپٹی نظیر احمد
تو اچھے خاصے تجدیدیت سے متاثر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ یورپ کے انیسویں صدی
کے ناول کے فارم کو اپنا نہ سکے۔ ان کے ناول کا فارم تو اس دور کی نمائندگی کرتا ہے۔
جبکہ اس سے مسیحی قدروں کی تبلیغ کا کام لیا جاتا تھا۔ مولانا کے کردار بھی قدروں کے خانوں
میں بیٹے ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی کش مکش نہیں ہے۔ وہ صرف اپنی مخالف قدروں سے
بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ اس طرح ناول کے پورے سفر کو دماغ کے راستے طے کر دیتے ہیں
یہ ضروری نہیں ہے کہ اس قسم کے ناول دلچسپ بھی ہوں۔ لیکن مولانا کے ناول دلچسپ ہیں
اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا نے اپنے مخاطب کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ ان
کے زیادہ تر ناول لڑکیوں اور لڑکوں کے منصاب تعلیم کے لئے لکھے گئے تھے۔

اس کے بعد اردو نثر کا رومانوی دور آتا ہے۔ مولانا عبد الحلیم شرر اسکاٹ کی
ناولوں کا چربہ اتارتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ ماضی کی اندھا دھند پرستش بھی کرتے ہیں
اسلامی عہد کے کارناموں کو ڈرامائی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ چونکہ مولانا عہد عتیق کی تجدیدیت
سے متاثر تھے اس لئے انھوں نے اپنا یہ فریضہ بنا لیا کہ مسیحی مغرب کی لائی ہوئی قدروں کا
اپنے عہد عتیق میں جواب پیدا کریں۔ محبت کی آزادی سرمایہ دارانہ نظام کی لائی ہوئی قدر
تھی۔ مولانا نے اس قدر کو اپنانے میں بھی کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ بالآخر مسلمانوں ہی نے

صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ کیا بکواس ہے ۔ بہر حال مولانا کی رومانیت اس حد تک تو قائم ہی رہی کہ انھوں نے انتہا جذباتیت، عقیدت مندی، مبالغہ اور غلو سے کام لیا اور یہ چیزیں ان کے اسلوب اور ان کے ناولوں کے فارم پر بھی اثر انداز ہوئیں ۔ مولانا کے اسلوب میں نہ صرف، غلو اور مبالغہ ہی ہے بلکہ تخیل کی شدید رنگ آمیزی بھی ہے ۔ ان کی تحریریں جذباتیت کے باعث بہاؤ تو ہے لیکن حقیقت نگاری سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے ان کے ناول کے کردار جیتے جاگتے نہیں ۔ ناولوں کے پلاٹ میں پہلے سے سوچی ہوئی بات اور یکسانیت ہے ۔ بہر حال اس اسلوب نے جذبات نگاری کی راہیں ضرور کھولیں ۔

پہلے حقیقت نگار ناولسٹ مرزا محمد ہادی رسوا ہیں ۔ وہ صحیح معنوں میں انیسویں صدی کی حقیقت نگاری سے متاثر ہیں ۔ وہ غلو اور مبالغے کی زبان استعمال نہیں کرتے ہیں اور نہ اپنے کرداروں کو رومانوی مہم کے لئے تیار کرتے ہیں ۔ اس کے برعکس ان کے کرداروں کو آگے بڑھنے میں کافی دشواریوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے ۔ چونکہ مرزا صاحب تجدیدیت سے آزاد تھے اس لئے ان کی تحریر بھی اس کے اثرات سے پاک ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مرزا صاحب کا مطالعہ سطحی ہے وہ صرف اوپری سطح کو کریدتے رہتے ہیں وہ تفصیلات کے اُستاد نہیں اور نہ ان کے ایجاز و اختصار میں اتنی جامعیت ہے کہ پوری حقیقت کو سمیٹ لیں ۔ تاہم اردو نثر کو حقیقت نگاری کی بنیاد پر کھڑا کر دینے میں ان کا بہت بڑا ہاتھ ہے مرزا صاحب کے یہاں سطحیت اس لئے بھی ہے کہ وہ پیسہ کمانے کے لئے ناول لکھتے تھے ۔ انھوں نے اپنے ناولوں پر کبھی بھی زیادہ وقت صرف نہیں کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بجز " امراؤ جان ادا " کے ان کا کوئی بھی ناول قابلِ اعتنا نہیں ہے ۔

منشی پریم چند نے انھیں روایات سے فائدہ اُٹھایا ہے وہ نہ تو رومان نگار ہیں اور نہ انیسویں صدی کے ایسے حقیقت نگار جو واقعات کی تفصیل نگاری تک اپنے آپ کو محدود کر کے حقیقت کے بارے میں اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتے ۔ وہ چونکہ

اصلاح پسند اور انسان دوست تھے اس لئے انھوں نے مظاہر کی مصوری کیساتھ ساتھ جذباتی اظہار ہمدردی اور اصلاح کے فلسفے کی تبلیغ کو بھی قائم رکھا۔ اُن کی ہمدردی نہ صرف مظلوم اور محکوم انسانوں ہی کے ساتھ ہے بلکہ اوپری طبقے کے نیک انسانوں کے ساتھ بھی ہے۔ چونکہ وہ نیت کو عمل پر مقدم کر دیتے ہیں اس لئے ان کی حقیقت نگاری کہیں کہیں مجروح بھی ہو جاتی ہے۔ پھر بھی وہ حقیقت نگار ہیں۔ وہ کسانوں کی زندگی کو رومانوی انداز میں پیش بھی کرتے ہیں۔ وہ واقعات کی مصوری میں مبالغے سے کام نہیں لیتے ہیں۔ اور نہ ان کی خارجیت پر اپنے تخیل کی رنگ آمیزی ہی کرتے ہیں لیکن جب کبھی وہ کانگرسی سیاست کے مبلغ بن جاتے ہیں اور گاؤں کے زمینداروں کو ایمان لانے پر مجبور کرنے لگتے ہیں تو اُن کا تبلیغی لہجہ حقیقت نگاری کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مگر جب وہ اپنی منظر سماجی تبدیلی کے طریق کار پر رکھتے ہیں تو وہ اشتراکی حقیقت نگاری سے قریب ہو جاتے ہیں۔ پریم چند نے یہ رتبہ صرف "گودان" میں حاصل کیا ہے۔

اس مختصر سے جائزے کے بعد میں اس حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہوں کہ شعوری یا نیم شعوری طور پر آپ کا معنی اور آپ کا مقصد ادب کی صورتوں کو متعین کرتا ہے۔ اگر آپ کا ذہن گنجلک ہے تو ادبی صورت بھی گنجلک ہوگی۔ اگر آپ اپنے لئے یہ ضروری نہیں سمجھتے ہیں کہ آپ کے خیالات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنا چاہیئے تو آپ ان صورتوں سے پرہیز کریں گے جو عوام میں مقبول ہیں۔ اور اگر آپ کو اپنے واضح خیالات تاثرات، مشاہدات اور محسوسات کو اپنے ذہن کی ایک منظم وحدت کے ساتھ دوسروں تک پہنچانا ہے اور ان کے جذبات میں بھی ایک منظم وحدت پیدا کرنا ہے تو آپ کو ان چیزوں پر غور کرنا ہے جن سے آپ کی روایات میں اثر اور آپ کی تصویر میں جان پیدا ہو سکے۔ افسانہ ہو یا ناول، ان کی کامیابی کا ثبوت یہ ہے کہ وہ کس حد تک زندگی کے طریقِ کار، سماجی تبدیلی کے طریقِ کار کو یقین آفریں انداز میں پیش کرتا ہے اور یہ یقین

آفرینی اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ کردار نارمل ہوں وہ خود چلیں پھریں اور بات کریں اور اگر آپ کو خود ہی بولنا ہے تو آپ اس ٹائپ اور طبقے کے کردار کو پیش کریں جو آپ کے ٹائپ اور طبقے کی نمائندگی کرتے ہوں۔ طبقاتی طرفداری اور جذباتی اظہار کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ جو بات آپ اپنے کردار سے نہ کہلا سکیں اسے آپ خود کہنے لگیں، خوبی یہ ہے کہ آپ ایسے کردار چنیں جو آپ کے دل کی باتیں خود کر سکیں۔ آپ کی طبقاتی اور جذباتی ہمدردی کردار کے انتخاب میں جھلکتی ہے۔ حقیقت نگاری کی دوسری شرط یہ ہے کہ آپ ضروری تفصیلات سے کام لیکر نتائج تک پہنچیں، زندگی کے فلسفے اور تعمیمات تک پہنچیں تاکہ پڑھنے والوں کو فائدہ پہنچے نہ کہ تفصیلات کی موشگافیوں میں پڑ کر حقیقت کو کھو بیٹھیں۔

حقیقت صرف واقعات کو بیان کر دینے یا کسی ایک مخصوص منظہر کو حقیقت کے اور دوسرے مظاہر سے الگ کر کے پیش کرنے سے گرفت میں نہیں آتی ہے حقیقت تک پہنچنے کے لئے سماجی ارتقار کی بنیادوں تک پہنچ کر سماجی ترقی کی رفتار اور سمت معلوم کرنا ضروری ہے۔ فرض کر لیجئے کہ آپ نے اپنے سماج کے کسی ایک منظہر کی مصوری بہت ہی یقین آفرین انداز میں کی ہے پھر بھی اگر وہ منظہر حقیقت تک رہنمائی نہیں کرتا ہے، اپنے بنیادی اسباب کو بے نقاب نہیں کرتا ہے تو آپ حقیقت کی مصوری میں ناکام ہیں کردار ہوں یا مظاہر یہ سب حقیقت تک پہنچنے کے ذرائع ہیں۔ اور اگر آپ غور سے دیکھیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اگر آپ اپنے سماج اور نظام کی حقیقت کو نہیں جانتے ہیں تو آپ کے کردار اور مظاہر کے انتخاب میں کوئی وحدت اور تنظیم نہ ہوگی۔ آپ کا انتخاب یونہی سرسری ہے یا کسی ذاتی پسندیدگی کے باعث ہوگا۔ اور اگر آپ اپنے سماج اور نظام کی حقیقت کو جانتے ہیں تو آپ ایسے مظاہر اور کردار کو منتخب کریں گے جو حقیقت کے پورے طریقِ کار کو کھول سکیں گے۔ طوائف کی زندگی، طوائف بازاری، جنسی گھٹن سرمایہ دارانہ نظام کے نمائندہ مظاہر نہیں ہیں۔ یہ مظاہر تو دَورِ غلامی سے چلے آرہے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام نے تو صرف ان کی ہیئت میں تبدیلی کر دی ہے اس نظام کی استحصالی بنیادوں تک پہنچنے کے لئے یہ مظاہر بڑے پُرپیچ ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بڑھتے ہوئے تضاد نے حقیقت کو اس قدر واضح کر دیا ہے کہ اسے براہ راست سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ حقیقت محنت اور سرمایہ کا تضاد ہے۔ وہ حقیقت کسان اور زمیندار کی جنگ ہے وہ حقیقت عام انسانوں کی اقتصادی جد وجہد اور غلامی ہے حقیقتیں مُطلق نہیں ہیں۔ یہ حقیقتیں زندہ اور متحرک ہیں۔ ان کے معرکے ہمارے مشاہدے میں روز آتے ہیں۔ ہم اس معرکے کو اپنی انفرادی سطح پر بھی محسوس کرتے ہیں۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ ہمارے متوسط طبقے کے بہت سے ادیب ان حقائق کو یقین آفرین اور موثر انداز میں اپنے ادبی تجربے میں منتقل نہیں کر پاتے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ان کا تعلق اس ڈانواں ڈول طبقے سے ہے جو اقتصادی کش مکش اور زبوں حالی کی چوٹ براہ راست اپنے سینے پر لیتے ہوئے بھی آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ سوچ کر آنکھیں چراتا ہے کہ شاید اس کی قسمت بدل جائے۔ یہ قسمت اتفاقات اور حادثات کی نہیں ہے۔ اس کی قسمت کو بنانے بگاڑنے میں ایک ایسے نظام کے خارجی قانون کو دخل ہے جو ہمدردی، تاسف اور انسانی جذبات سے آزاد ہے۔ اس نظام کے قانون کو جان کر اس نظام کے بدلنے ہی میں اپنی قسمت کا فیصلہ ہے یہ نظام آج دُنیا کے مزدور اور محنت کش عوام کی متحدہ کوششوں سے بدلا جا رہا ہے۔ یہ نظام نصف کرۂ ارض میں بدلا جا چکا ہے۔ متوسط طبقے کے ادیبوں نے اگر اس حقیقت کو محسوس نہیں کیا تو وہ کسی بھی زندہ اور جاندار ادب کی تخلیق نہیں کر سکتے ہیں۔

ہمارا یہی سماجی اور ادبی شعور، یہی معنی اور ادراک حقیقت متحرک زندگی کے سلسلے سے ایک ایسا پیکر تراشتا ہے جو زندگی، حرکت، صداقت اور حسن کا ثبوت اس بات میں دیتا ہے کہ وہ اپنی داستان خود سے کہتا ہوا منزل کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہاں صورت، معنی اور

تخلیقی جذبہ ایک نامیاتی وحدت میں عمل کرتے ہیں اور اگر ادراک حقیقت مکمل نہیں ہے، ذہن صاف نہیں ہے تو تخلیقی جذبہ بھی ادھورا ہوگا۔ اور صورت بھی بےمعنی ہوگی۔ صورت و معنی کا یہ رشتہ گوشت اور خون کے رشتے سے بھی زیادہ قریبی ہے۔ جس طرح صرف صحت مند خون حسین عضلات کو جنم دیتا ہے اسی طرح صرف زندہ اور متحرک حقیقت، صحت مند معنی سے حسین پیکر بھی تراشتا ہے۔ مریض اور ناپاک خون سے صورت اگر بن بھی جائے تو حُسن پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔

یہ حُسن جو معنی اور صورت کے جدلیاتی رشتے سے اُبھرتا ہے، جو صورت و معنی کے روابط میں ایک زندہ کائی کی طرح رہتا ہے۔ یہ حُسن جو اُبھرتی ہوئی حقیقت کا طرفدار اور مستقبل سے ہمکنار ہوتا ہے ایک معصوم بچّے کی طرح تھوڑی سی مزید توجہ کا طالب بھی ہوتا ہے۔ آپ صرف وہی لفظ لکھیں جس کی ضرورت ہے اور جس کا کوئی دوسرا بدل نہیں ہے۔ آپ صرف اتنی ہی تفصیل نگاری کو دخل دیں جتنی کہ ضرورت ہے۔ اتنی ہی انقلابی رومانیت سے کام لیجئے جتنی کہ نئی حقیقت کو ابھارنے کے لئے ضروری ہے۔

اور اگر اس تمام جتن کے بعد آپ کی تصنیف بے جان اور بےحُسن رہ جائے تو آپ اپنے سے خود سوال کیجئے۔

"میں جھوٹا تو نہیں۔ میرے نظریئے اور عمل میں دوئی تو نہیں۔ میری ہمدردی ظاہری اور میرا یقین ڈھلمل تو نہیں؟" جب اس کا جواب کچھ اُمید افزا ملے تو آپ دوسرا سوال کریں۔ "کیا میں نے اپنی صلاحیتوں کو پہچان کر اُدھر رُخ کیا تھا، کیا میں شعور اور جذبے کی پوری طاقت کے ساتھ اپنے حافظے پر جھپٹا تھا۔ کیا میں نے اس کی تمام تہوں کو اُدھیڑ کر پورے خزانے کا جائزہ لیا تھا۔ کیا لکھتے وقت میرے سینے کا زخم کھلا ہوا تھا۔ اور میری نگاہیں مستقبل کے منظر دیکھ رہی تھیں؟" اور اگر آپ کو اس کا بھی جواب اثبات میں ملے تو پھر آپ یہ سمجھیئے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ ٹھیک ہے اور اس کا منکر یقیناً" آپ کا دشمن ہے۔

سویرا
۷،۸

هنس راج رہبر

پریم چند کی شہرت

ہماری زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ ہم کہانی بن جائیں اور
ہماری شہرت ہر طرف بکھر جائے۔
پریم چند

پریم چند کو اپنی زندگی ہی میں کافی شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ وہ اُردو اور ہندی کے بہترین ادیب سمجھے جاتے تھے۔ کوئی دوسرا افسانہ نگار ان کے آس پاس بھی نہیں آتا تھا۔ اردو داں طبقہ نے انھیں "فطرت نگار" اور ہندی داں طبقہ نے "اپنیاس سمراٹ" کا خطاب دیا تھا۔ ان کی کہانیاں گجراتی، مراٹھی اور بنگالی وغیرہ ملکی زبانوں میں تو ترجمہ ہوتی ہی تھیں لیکن ان کے علاوہ انگریزی اور جاپانی وغیرہ غیر ملکی زبانوں میں بھی کافی کہانیاں ترجمہ ہو چکی تھیں، اور ان کی شہرت اب تک پھیل رہی ہے ابھی روسی زبان میں "گئودان" کا ترجمہ ہوا ہے۔

لیکن پریم چند نے شہرت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی، کیونکہ کوشش سے نہ شہرت حاصل ہوتی ہے اور نہ اس شہرت سے کوئی فائدہ ہے۔ بلکہ اس کا راستہ دوسرا ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں کہ "اگر ہم سچے دل سے جماعت کی خدمت کریں گے تو اعزاز و امتیاز

اور شہرت بھی ہمارے قدم چومے گی۔ پھر اعزاز و امتیاز کی فکر ہمیں کیوں ستائے اور اس کے نہ ملنے سے ہم مایوس کیوں ہوں؟ خدمت میں جو روحانی مسرت ہے وہی ہمارا اصلہ ہے۔"

پھر بھی ہر ایک آدمی کے دل میں شہرت کی جو تمنا ہوتی ہے، اس کی وجہ کیا ہے؟ پریم چند اپنی کہانی "ادیب کا فرض" میں اس کی وجہ بیان کرتے ہیں۔ ادیب اپنی بیوی سے مخاطب ہے۔ "اب میں تمھیں کیسے سمجھاؤں۔ ہر ایک شخص کے دل میں عزت اور احترام کی ایک بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لئے کہ یہ ہمارے روحانی ارتقار کی ایک منزل ہوتی ہے۔ ہم عالمگیر وسیع عظمت کا ایک جزو ہیں۔ جزو میں کل کا وصف ہونا لازمی ہے۔ اس لئے شہرت اور عزت روحانی ترقی اور تعلیم کی طرف ہمارا فطری رجحان ہے میں اس خواہش کو بُرا نہیں سمجھتا۔"

شہرت کا جذبہ ارتقار کی خواہش کا اظہار ہے اور وہ تبھی حاصل ہوسکتی ہے، جب آدمی زندگی کے مجموعی ارتقار، تاریخی حقیقتوں کو آگے بڑھانے میں مدد کرے۔ آدمی اپنے انفرادی ارتقار کو اس طرح انسانیت کے مجموعی ارتقار میں شامل کر دے جس طرح چھوٹے چھوٹے نالے اپنے آپ کو بڑی ندی میں مدغم کر دیتے ہیں اور ندی کا بہاؤ بڑھتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ اور وہ زندگی کو شاداب، زرخیز اور خوشحال بنانے کا کام کرتی ہے۔ یہی عمل اور یہی قربانی، قربانی ہے۔ جو عمل اور قربانی اس روش سے ہٹ کر کی جاتی ہے، اس کا نتیجہ شہرت نہیں بدنامی ہے۔ اور وہ زندگی کے لئے غیر مفید ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد ارتقار کو آگے بڑھانے کے بجائے اسے روکنا ہوتا ہے۔

پریم چند نے یقیناً زندگی کے ارتقار میں اضافہ کیا ہے دراصل وہ بذاتِ خود ارتقاء کی تحریک تھے۔ جوں جوں ادب کی ترقی پسند تحریک اپنی روایات کو برقرار رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اور پھیل رہی ہے۔ ان کی شہرت بھی نمایاں ہوتی اور پھیلتی جارہی ہے۔

پریم چند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے تنقیدِ حیات کا کام تو بہت کیا ہے، لیکن

باعمل کردار اور مثبت کردار بہت ہی کم پیش کئے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے بعد ترقی پسند تحریک کا قافلہ فرائڈ ازم کی پُرپیچ وادیوں میں بھٹک گیا تھا۔ اس سے جس قدر تحریک کی ترقی پسند روایات کو نقصان پہنچا اسی قدر پریم چند کی شہرت بھی ماند پڑ گئی۔ ہم نے انھیں اصلاح پسند کہہ کر نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ اگر پڑھنا بند نہیں کیا تو کم ضرور کر دیا تھا. ہم سمجھتے تھے کہ فرائڈ کے نظریے نے ہمیں " تجزیۂ نفس " کا وہ انمول گوہر عطا کر دیا ہے جس سے پریم چند واقف ہی نہیں تھے۔ اور اس نظریۂ کی بدولت ہمارا افسانہ اُن سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن ہم ان کو اور اپنے آپ کو بھلا رہے تھے۔ پریم چند نے فرائڈ ازم کو دیکھا، پرکھا اور مسترد کر دیا۔ وہ اپنی کہانی "ہس پد ما" میں لکھتے ہیں.

"پد ما نے تعلیم سے جو فیض اٹھایا ہے اس میں نفسیاتی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھی۔ بندش روح کی بالیدگی کے لئے زہر تھی۔ فرائڈ اس کا معبود تھا۔ اور فرائڈ کے نظرئے اس کی زندگی کے لئے مشعلِ ہدایت۔ کسی عضو کو باندھ دو۔ تھوڑے ہی دنوں میں دورانِ خون بند ہو جانے کے باعث بے کار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرضِ خطر میں ڈال دے گا۔ یہ جنون۔ مراق اور اختلالِ دماغ کی اتنی کثرت ہے۔ محض اس لئے کہ خواہشات میں رکاؤ ڈالا گیا نفسیات کی یہ نئی تنقیح پدما کی زندگی کا مسلمہ اصُول تھی۔"

ایک مرتبہ پریم چند اور جینندر کمار کے درمیان ادب پر گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو کا موضوع ٹیگور اور شرت چندر تھے۔ گفتگو کا آغاز جینندر کے ایک سوال سے ہوا تھا۔ اور وہ جینندر ہی کے الفاظ میں یہاں درج کی جاتی ہے۔

جینندر نے کہا:۔ بنگالی ادب دل کو زیادہ چھوتا ہے۔ اس سے آپ متفق ہیں تو اس کا سبب کیا ہے ؟

پریم چند نے کہا:۔ متفق تو ہوں۔ سبب! اس میں جنسیت زیادہ ہے۔ مجھ میں

وہ کافی نہیں ۔

جینندر ان کی طرف دیکھنے لگے ۔ اور پوچھا ۔ جنیت ہے اس سے وہ ادب دل کو زیادہ چھوتا ہے ؟

پریم چند بولے :۔ ہاں تو وہ جگہ جگہ Reminiscent (قابلِ یادداشت) ہو جاتا ہے ۔ یاد میں احساس کی لطافت زیادہ ہوتی ہے ۔ عزم میں احساس کی ریاضت ہوتی ہے ۔ تعمیر کے لئے دونوں چاہئیں :

کہتے کہتے ان کی آنکھیں جینندر کو پار کر کہیں دور دیکھنے لگی تھیں ۔ اس وقت ان کی آنکھوں کی سُرخی ایک دم غائب ہو کر ان میں ایک طرح کی دور اندیشی نیلاہٹ بھر گئی تھی بولے " جینندر مجھے ٹھیک معلوم نہیں ۔ میں بنگالی نہیں ہوں ، وہ لوگ تخیل پرست ہیں ، تخیل کی پرواز میں جہاں پہنچ سکتے ہیں وہاں میری پہنچ نہیں ۔ مجھ میں اتنی دین نہیں ؟ گیان سے جہاں نہیں پہنچا جاتا وہاں بھی تخیل سے پہنچا جاتا ہے لیکن جینندر میں سوچتا ہوں ریاضت بھی چاہیئے ، رابندر اور شرت دونوں عظیم ہیں ۔ لیکن ہندی کے لئے کیا یہی راستہ ہے یا شاید نہیں ۔ ہندی راشٹر بھاشا ہے ۔ میرے لئے تو یہ راہ ہی نہیں ہے "

"ہنس" اکتوبر ۱۹۴۷ سنہ ء

اسی لئے پریم چند ایسی شاعری کو خصوصاً غزل کو پسند نہیں کرتے تھے جو صرف زلفوں کے پیچ وخم میں اُلجھ کر رہ گئی ہو ۔ ایک مرتبہ دیا نارائن نگم نے " زمانہ " کا آتش نمبر نکالا تھا تو پریم چند ان پر بہت بگڑے تھے کہ اتنے صفحے بیکار ضائع کئے ۔ انھیں وہ ادب پسند نہیں تھا جو وقت کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو ۔ جنسی ادب کو وہ قومی زوال کا آئینہ خیال کرتے تھے ۔ لکھتے ہیں :۔

"بے شک شعر و ادب کا منشا ہمارے احساس کی شدت کو تیز کرنا ہے لیکن

انسان کی زندگی محض جنسی نہیں ہے۔ کیا وہ ادب جس کا موضوع جنسی جذبات اور ان سے پیدا ہونے والے درود یاس تک محدود، یا جس میں دنیا اور دنیا کی مشکلات سے کنارہ کش ہونا ہی زندگی کا ماحصل سمجھا گیا ہو۔ ہماری ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کو پورا کرسکتا ہے۔ جنسیت انسان کا ایک جزو ہے اور جس ادب کا بیشتر حصہ اس سے متعلق ہو۔ وہ اس قوم اور اس زمانے کے لئے فخر کا باعث نہیں ہوسکتا۔ اور نہ اس کے صحیح مذاق ہی کی شہادت دے سکتا ہے۔"

"خطبۂ صدارت"

ایک طرف ترقی پسند تحریک پر جنسیت کا غلبہ تھا اور ترقی پسند ادیبوں نے اپنے درمیانہ طبقہ کے اور بورژوا طبقہ کے جنسی رجحانات اور کمزوریوں کو بیان کرنا ہی کافی سمجھا اور مزدوروں کسانوں کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں رکھا تو دوسری طرف اصلاح پسند اور گاندھی وادی ادیب تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی تھے اور خلاف بھی تھے۔ وہ پریم چند کا جائزہ بھی اپنی ہی فطرت کے مطابق لیتے تھے اور پریم چند کو ترقی پسند مانتے ہوئے بھی اصلاح پسند اور گاندھی وادی بنا کر پیش کرتے تھے۔ اور ان کے ادب کے انقلابی کردار کو بالکل نظر انداز کر دیتے تھے۔ ان لوگوں کا کسی ادیب، مفکر اور رہنما کو بڑا بنا کر پیش کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی شہرت سے ان کے پرانے سماج کو سہارا ملے اور لوگ اس کی ترقی پسند روایات کو بھول کر اسے بے ضرر دیوتا کی طرح پوجتے رہیں۔

ادب کے طبقاتی کردار پر ان کی نظر ہی نہیں جاتی۔ گاندھی ازم تو سیاست کے طبقاتی کردار پر بھی پردہ ڈالتا ہے۔ جو لوگ گاندھی کو اپنے دور کا سب سے بڑا ترقی پسند اور انقلابی کہتے ہیں اگر وہ پریم چند کو بھی ترقی پسند کہتے ہیں تو صرف اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں، انھیں انقلاب کی ان محرک قوتوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جو ادب کو اور انسان کو واقعی ترقی پسند بناتی ہیں جو پریم چند کی تحریروں میں جاری وساری ہیں۔

روس کے عظیم فن کار طالستائی کے ساتھ بھی بورژ وا طبقے کے ادیبوں نے یہی سلوک کیا تھا۔ طالستائی نے اپنے ناولوں اور کہانیوں میں زارشاہی سماج پر جو نکتہ چینی کی ہے۔ حاکم طبقہ کے مظالم اور بے انصافیوں کے خلاف جو آواز بلند کی ہے غریب کسانوں کی امنگوں اور آرزوؤں کو لاوے کی طرح اُبلتے ہوئے دکھایا ہے اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں وہ تو صرف طالستائی کے نام سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے اپنے سیاسی سرمایہ میں اضافہ کرتے رہے۔ صرف لینن نے طالستائی کے ادب کے انقلابی کردار کو پیش کیا اور بتلایا کہ کیسے ممکن تھا کہ جب ملک میں اتنی بڑی ہل چل تھی تو طالستائی ایسا سچ مچ بڑا ادیب اس کے کچھ اہم پہلوؤں کو منعکس نہ کرتا۔

اب جبکہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کی سیاست کا طبقاتی کردار اُبھر کر لوگوں کے سامنے آگیا ہے۔ اور ادبی تحریک بھی واضح طور پر دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئی ہے پریم چند کا نئے شعور کے ساتھ جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بعض دوست پریم چند کو طالستائی سے مشابہت دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک کسانوں کی لوٹ کھسوٹ اور حاکم طبقے کے ظلم اور بے انصافی کے خلاف احتجاج کرنے کا تعلق ہے۔ دونوں میں مشابہت ہے۔ لیکن دونوں میں ایک بڑا فرق ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فرق یہ ہے کہ طالستائی شروع سے اصلاح پسند تھے اور آخر میں بالکل پادری بن گئے وہ روسی کسانوں پر ہونے والے ظلم اور دُکھ کی کہانیاں بیان کرتے رہے لیکن جب یہی کسان انقلاب کے لئے تیار ہوئے طالستائی کا زمیندارانہ کردار جاگ اُٹھا۔ انھوں نے انقلاب سے گھبرا کر چرچ میں پناہ لی اور مذہب کا پرچار کرنے لگے۔ ان کی مذہبی رنگ کی کتابیں ہمارے ہاں گاندھی ازم کا پرچار کرنے کے لئے خوب استعمال ہوئیں اور اب تک ہو رہی ہیں۔ اس کے برعکس پریم چند مذہب کے قائل نہ تھے۔ بلکہ مذہب کو ریاکاری کا زیور سمجھتے تھے اور کہتے تھے قسم کذب کی تائید ہے یعنی

وجہ ہے کہ ان کی اصلاح پسندی انقلاب میں تبدیل ہو رہی تھی آخری عمر میں اصلاح پسندی کے جو تھوڑے بہت عناصر باقی تھے ان کے دور ہو جانے کا امکان تھا۔ طالستائی نے نادانستہ طور پر انقلاب کی محرک قوتوں کا عکس پیش کیا ہے پریم چند نے دیدہ دانستہ انقلاب کی قوتوں کو ابھارا ہے۔ پریم چند کا ارتقار جاری تھا جبکہ طالستائی نے آخری عمر میں ارتقار کو جواب دیدیا تھا۔

ملک میں جوں جوں انقلاب کی محرک قوتیں ابھر رہی ہیں، ذہن صاف ہو رہے ہیں پریم چند کی شہرت اور عظمت بھی اُبھر رہی ہے۔ اور ادب کی ترقی پسند تحریک جس کی انھوں نے داغ بیل ڈالی تھی بھول بھلیوں سے نکل کر صحیح راہ پر چل پڑی ہے۔

"پریم چند" کتاب میں سے

نظمیں

احمد راہی
احمد ریاض
احمد ندیم قاسمی
اختر الایمان
افضل پرویز
بلراج کومل
حامد عزیز مدنی
حسن اعرابی
سردار جعفری
فراق گورکھپوری
فکر تونسوی
فیض احمد فیض
قتیل شفائی
کمال احمد صدیقی
مخمور جالندھری
منیب الرحمان
نیاز حیدر

غزلیں

ابن انشا
جاں نثار اختر
جگر مراد آبادی
جگن ناتھ آزاد
جمیل ملک
جوش ملیح آبادی
حبیب تنویر
ظہیر کاشمیری
غلام ربانی تاباں
مجروح سلطانپوری
محمد صفدر
معین احسن جذبی

احمد راہی

فرہاد

چند لوگوں کی مسرت ہے یہاں پیشِ نظر
چند لوگوں کی تمنائیں یہاں کھلتی ہیں

ہم خزاں بار بہاروں کا اگر ذکر کریں
پھانسیاں ہنستی ہوئی ہم سے گلے ملتی ہیں

اپنا حق مانگنا اک جرمِ بغاوت ہے یہاں
جس کی پاداش میں ہونٹوں کو سیا جاتا ہے

جگمگاتے ہوئے محلوں کے تحفظ کے لیے
بے شمار آنکھوں کو بے نور کیا جاتا ہے

یہ زر و سیم کی جھنکار میں ڈوبا ہوا دور
مصلحت کیش، ستم دوست، جفا پیشہ ہے

اس کو رہتا ہے سدا عشرتِ خسرو کا خیال
اور فرہاد کی محنت کا صلہ تیشہ ہے

شاہ کے وعدۂ شیریں سے بہلنے والا
مسندِ شاہ کی جانب کہیں لپکا ہوتا

سینۂ کوہ میں جس تیشہ نے ڈالا تھا شگاف
سرِ خسرو سے وہ تیشہ کہیں اُلجھا ہوتا

پھونک کر میری محبت، مری محنت کا چراغ
جگمگا سکتا نہیں اب کسی خسرو کا محل

نت نئے وعدوں کے پھندوں میں جکڑنے والو
بِن برسنے کے تو اب کھل نہ سکیں گے بادل

چوٹ کھائے ہوئے انسان کا بیدار شعور
اب کسی وعدۂ شیریں میں نہیں آئے گا

بے ستوں کوہ دھنک ڈالا تھا جس تیشے نے
آج وہ تیشہ سرِ خسرو سے ٹکرائے گا

سویرا
۸۶۶

احمد ریاض

دوسری انجمنِ اقوامِ متحدہ

جھومتے پرچمِ تہذیب و تمدّن کے تلے
پھر ہوئے جمع پئے امن خدایانِ زمن
پھر بڑھے عدل و مساوات کی میزان لئے
پھر اٹھے تھام کے دامانِ روایاتِ چمن
پھر نئے دام، نئے جال بچھانے کے لئے
آئے کھولے ہوئے تاریخ کے اوراقِ کہن
پھر ہوا پیش زمانے کی امامت کا سوال
پھر کہیں نالۂ آدم ہے کہیں فکرِ وطن

پھر سنائے گا غمِ گردشِ ایام انھیں
پھر نئے تیر، نئے خار چُنے جائیں گے
پھر مرتب کئے جائیں گے قوانینِ حیات
پھر نئے خواب نئے ہار بنے جائیں گے
پھر دیا جائے گا جمہور کو درسِ زنداں
پھر یہ سر فکرِ بغاوت میں دھنے جائیں گے
پھر بہم ہوگا غلامی کے تحفظ کا ثبوت
پھر ہر اک قوم کے دکھ درد سُنے جائیں گے

پھر زر و سیم کی تقسیم جِلا پائے گی
نسل اور رنگ کی تفریق کے چرچے ہوں گے
پھر نہتّوں کی طرف دستِ ہوس اٹھّے گا
فرطِ زر، دامنِ توفیق کے چرچے ہوں گے
پھر خداداد ذہانت کی نمائش کے لئے
ایٹم اور موت کی تحقیق کے چرچے ہوں گے
پھر فقط جاہ و حشم، صیدِ جہاں کی خاطر
اک نئی جنگ کی تصدیق کے چرچے ہوں گے

لیکن اس "انجمنِ ناز" کے منشور کی آب
فتنہ سازی کا بھرم، حیلہ نوازی کا طلسم
آج یہ زیست کی راہوں میں اندھیرے کا غبار
آج کھیتوں سے ملوں تک یہ پگھلتا لاوا

نئے آدم، نئی دنیا کے سنبھلنے تک ہے
فہم و ادراک کی قندیل کے جلنے تک ہے
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے
قصر سے دور بس اک موڑ بدلنے تک ہے

آج جمہور کا یہ قافلۂ علم و شعور
آج بے باک شراروں کا یہ سیلِ انوار
آج یہ عزم و اخوت کا درخشندہ جلوس
آج بڑھتا ہی بپھرتا ہی چلا آتا ہے

کہنہ آداب سیاست سے نہیں رک سکتا
کسی ہنگامۂ ظلمت سے نہیں رک سکتا
دیو قانون کی ہیبت سے نہیں رک سکتا
اب یہ طوفاں کسی طاقت سے نہیں رک سکتا

شاہراہ
مئی ۱۹۵۰ء

احمد ندیم قاسمی

موضوع

فن بڑی چیز ہے، تخلیق بڑی نعمت ہے
حسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست

ہے مرے مدِ نظر آج بھی تخلیق جمال:
گیسوئے شب میں الجھتے ہوئے تاروں کے خیال
وہ جوانی کے گلابوں سے مہکتے ہوئے جسم
پھیلتی باہوں میں مدہوش لپکتے ہوئے جسم
کنجِ گلشن کی خموشی میں امنگوں کے ہجوم
صندلی رخ پہ بدلتے ہوئے رنگوں کے ہجوم
پیار کی پیاس میں کھلتے ہوئے ہونٹوں کی پکار
آنکھوں آنکھوں میں لگن کا مترنم اظہار
فن کی تعمیر ہوئی ہے انہی عنوانوں میں
یہی مقبول تھے ماضی کے غزل خوانوں میں

انہی کلیوں سے کھلائے گئے گلزار ابتک
انہی شمعوں سے اجالے گئے دربار اب تک
انہی جھونکوں سے روایات میں باقی ہے حیات
منعکس ہے انہی آئینوں میں انساں کا ثبات
میں اگر ان سے الگ بات کروں تو دراصل
یہ فقط گردشِ ایام نہیں ہے اے دوست
حسن بیٹھا ہے سرِ راہ بھکاری بن کر
میرا اندازِ نظر خام نہیں ہے اے دوست
چند اڑتے ہوئے لمحوں کی حسیں نقاشی
میرے فن کا تو یہ انجام نہیں ہے اے دوست
پہلے میں ماہیتِ حسن تو پا لوں ورنہ
حسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست

جن کی تخلیق سے ہے حسن کی قدروں کو دوام
ان کے ہاتھوں کی خراشیں تو مٹا لوں پہلے

جن کی محنت سے عبارت ہے جمالِ عالم
ان کو آئینہ دکھانا بھی تو فن کاری ہے
ان کی آنکھوں میں جو شعلہ سا لرز اٹھتا ہے
اس کا احساس دلانا بھی تو فن کاری ہے
حکمرانوں نے عقابوں کا بھرا ہے بہروپ
بھولی چڑیوں کو جگانا بھی تو فن کاری ہے
کھیت آباد ہیں دیہات ہیں اجڑے اجڑے
اس تفاوت کو مٹانا بھی تو فن کاری ہے
دھان کی فصل کی تصویر ہے معراجِ کمال
دھان کی فصل اٹھانا بھی تو فن کاری ہے

کارخانوں سے اُمڈتا ہوا فولاد کا شور
تیری تہذیب کا اک گیت نہیں تو کیا ہے
چند صدیوں کے غلاموں کا مکمل ایکا
نوعِ انساں کی یہ اک جیت نہیں تو کیا ہے
زر کے ڈھیروں کو الٹتی ہے دہقی کی زباں
ارتقا کی یہ بھی اک ریت نہیں تو کیا ہے
لب و رخسار کو موضوعِ سخن ٹھہرا لوں
لیکن اس رنگ کا ماحول تو پا لوں پہلے
زلف کے پیچ تو گن سکتا ہوں لیکن اے دوست
ذہن سے بارِ سلاسل تو اٹھا لوں پہلے
جن کی تخلیق سے فن کار سبق لیتا ہے
ان کے ہاتھوں کی خراشیں تو مٹا لوں پہلے

امروز
۱۵ اگست ۱۹۵۰ء

اخترالایمان

یوں نہ کہو

کبھی نہ اس کے بھاگ کھلیں گے پیاسی مٹی رہے گی پیاسی
یوں نہ کہو مرجھائے پودے یوں ہی سدا مرجھائے رہیں گے

چلتے چلتے اس منزل میں آکر دھرتی رک جائے گی
یوں نہ کہو گہنائے سورج سدا یونہی گہنائے رہیں گے

تم تو شفق کے گھلتے ملتے رنگوں کی اک گلکاری ہو
تم تو سحر کا ہلکا ہلکا نور ہو جس سے دنیا جاگے

تم تو مہک ہو کھلتے پھول کی، چڑھتے دن کا اُجلاپن ہو
تم نے تو سلجھائے ہیں آکر کتنے ذہن کے اُلجھے دھاگے

تم کو ہم نے اپنا کہا ہے، تم تو یوں نہ کہو زنداں کے
کبھی نہ بھاری قفل کھلیں گے، کبھی نہ زنجیریں ٹوٹیں گی

تحریک
۱۵ مئی سنہ ۱۹۵۰ء

افضل پرویز

سیاست اور روٹی

بھوک سے روتے بلکتے ہوئے بچّے ننگیں
اور خونخوار گرجتی ہوئی سوتیلی ماں
پیٹتی ہے انھیں اور توے سے دھمکاتی ہے
کبھی مٹّی کے کھلونوں ہی سے بہلاتی ہے
یہ تشدّد یہ ریا تو نہیں ان کا درماں
اور وہ بچّے سہی پر ایسے بھی بچّے تو نہیں

انفرادیت

میں اندھیروں کی ناز پروردہ
مجھے نورِ سحر سے کیا لینا
میں، ہوں تنہائیوں کی اکلوتی!
وقت کے شور وشر سے کیا لینا
آنکھ کو روشنی کی تاب نہیں
دل ہم آہنگِ انقلاب نہیں

سنگ میل
نمبر ۱۱

بلراج کومل

راجدھانی میں

سکون سے سو رہے ہیں محلے
مگر میں آوارہ پھر رہا ہوں
مرے قدم آشنا ہیں سب راستوں سے پھر بھی جھجک رہے ہیں
کہ جیسے یہ راستے کسی غار کے اندھیرے کو گھومتے ہوں،
میں کیسے سو جاؤں آگ سی جانے کب سے آنتوں میں جل رہی ہے۔
بڑی حسیں ہے یہ راجدھانی
قدم قدم پر جمیل ایوان ہنس رہے ہیں۔
لچکتے جسموں کی لہلہاہٹ چہار سو ایک نرم لذت بکھیرتی ہے۔
ہزارہا لوگ جانے کس دھن میں پھر رہے ہیں
چمکتی کاریں پھسلتی جاتی ہیں، صاف سڑکوں کو ساتھ لے کر
بڑی حکومت یہاں دفاتر کی کرسیوں پر سجی ہوئی ہے
ممالکِ غیر سے جو لوگ آئے ہیں، وہ اکثر کہا کئے ہیں
کہ آئینہ ہے مرے وطن کا یہ راجدھانی

میں چلتے چلتے ٹھٹھک گیا ہوں
یہیں (اسی شہر میں) میں بیکار ہوں، پریشاں ہوں مدّتوں سے
اور آج شب
بھوک کی تڑپتی ہوئی رگوں میں وہ شور محسوس کر رہا ہوں،
کہ جس کو محسوس کرنے والے کروڑوں انساں،
حکومتِ وقت کی ستم پیشہ بھٹیوں میں پگھل رہے ہیں
یہ شور ایک ایسا جذبۂ سرکشی ہے، جو پل رہا ہے آنتوں کی لوریوں پر
اکھاڑ پھینکا ہے، جس نے اکثر تمدّنوں کو!

نقوش
جون

حامد عزیز مدنی

زمین

گنبد گرے، پرچم جلے گھوڑوں کی ٹاپوں کے تلے
سب میر و سلطاں آ چلے

برسے ہتھوڑے پے بہ پے آتش نفس گیتوں کی لے
اک سیج پر شمشیر و نے

چیں بر جبیں آفاق ہیں محلوں کے سونے طاق ہیں
سہمے ہوئے قزاق ہیں

بچھڑے ہوئے مل چل چکے چہرے لہو سے ڈھل چکے
بیڑی کے حلقے کھل چکے

ملتی ہیں کس کی آہٹیں اب سرحدیں غم کی ہٹیں
گونگھٹ کھلا، بکھری لٹیں

آ چوم لیں تیری جبیں اے جاگتی سوتی زمیں
ہم رقصِ مہرِ آتشیں
پائندہ باد اے نازنیں!
پائندہ باد اے نازنیں!!

سویرا
۸، ۷

حسن اعرابی

امن کی اپیل

اک ہاتھ میں قلم لئے اور امن کی اپیل
دنیا میں دھوپ چھاؤں کی آویزش جمیل

دوجے پہ فاختہ کو دیئے باز کا مقام
مثل نسیم شہر و گلستاں میں صبح و شام

تختہ بہ تختہ، خانہ بخانہ پھرا ہوں میں
بکھری لٹوں میں صورتِ شانہ پھرا ہوں میں

میرے وطن کے لوگ عجیب و غریب ہیں
جتنا یہ مجھ سے دور ہیں اتنا قریب ہیں

مجھ سے برنگِ خندۂ شام و سحر ملے
جس طرح دل جلوں کی نظر سے نظر ملے

سن سن کے لفظِ امن نگاہیں چمک گئیں
منزل جھلک جھلک گئی، راہیں چمک گئیں

لکھتے تھے اپنا نام سنہری اپیل پر
پیاسوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے سبیل پر

حسرت سے دیکھتے تھے کبھی نام نام کو
بھوکے جسم جسم کے تھے تکتے طعام کو

تیرا قدم قدم بھلا سوئے عدم نہیں
کیا اے سپاہی تیرا محرک شکم نہیں

اپنے لئے لڑے مرے تو ایک بات ہے
ورنہ ترا نہیں یہ ہلاکو کا ہات ہے

حضرت قلم کی نوک گھسانے سے فائدہ؟
جو ڈاکوؤں کے ہاتھ اڑانے سے فائدہ

یہ بھاگ دوڑ پاؤں گھسائی نہیں حضور!
کوئی عوام سا بھی قصائی نہیں حضور

ہے جنگ مقتضائے حیات اور اٹل عذاب
احمق کے سر پہ سینگ بھی ہوتے ہیں کیا جناب

کرتے ہیں یوں غریبوں کا بیڑا ضرور پار
چُن کر سفین بچاروں کی دیتے ہیں باڑا مار

لڑنا پڑے تو اب کے برنگِ دگر لڑیں — جنگ اور جنگ بازوں پہ مل کر برس پڑیں

اس کربلا میں بے گنہ تو کام آ گئے — البتہ میر قافلہ گولی بچا گئے

لپکے تھے سبز باغ کے پیچھے جو چل ہو چل — ان میں سے بعض محض پکھیرو ہیں آج کل

رکھتے ہو تم بھی کھاٹ کھٹولہ نہ گھر نہ گھاٹ — اب تک نہ ہو سکے تمہیں چھپر تلک الاٹ

تم شام کو نکلتے ہو یوں کارخانے سے — روح اڑ گئی ہو جیسے جلے دانے دانے سے

اس دوڑ دھوپ میں کہ تنورِ شکم بھرے — بچے تلک بھی کھانے کمانے کے ٹھیکرے

پیسے کی اندھی جُروا نے آفت مچائی ہے — جو نیں ہے دیس دیس تو گھر گھر لڑائی ہے

جم دوت چاہتے ہیں کہ گولی چلا سکیں — جی بھر کے آدمی کے لہو میں نہا سکیں

یہ ہو گا اس لڑائی پہ اک وار ساتھیو! — ہر جنگ کے لئے ہے جو تلوار ساتھیو!

یہ ہاتھ چھٹی آخری اعلان ہے کھلا — جنتا پہ ہاتھ پھینکنے کا دیکھ لیں مزا

بھولے کسانو تم کہ نکردہ گناہ ہو! — منڈی کے درمیاں کہ سرِ قتل گاہ ہو

جب کھیت کے لکھے پڑھے ہشیار ہو گئے — سمجھو کہ بھاگ دیس کے بیدار ہو گئے

ہل والو! کام خاک نہ آئے وہ دو لوے — آزاد ہو کے آ گئے تہرے جوئے تلے

کھائیں جسیم فیل، کمائیں نحیف بیل — کھائیں بھی اور ڈرائیں بھی طرّہ دراز چھیل

مشکا سی توند راہِ ترقی کا روڑا ہے — یہ توند گاؤں گاؤں کی چھاتی کا پھوڑا ہے

مرنا اگر محال ہے، جینا وبال ہے — جگ میں اناج کال نہیں، راج کال ہے

اپنوں کا راج، جسم کو لتہ نہ پیٹ اناج — اپنوں نے ناؤ بھر کے ڈبو دی وطن کی لاج

اپنوں کو اپنوں ہی سے خدا واسطے کی لاگ
اپنوں کی سامراج کے ہاتھوں میں ڈور باگ
لپکی وہ اپنے دیس کی جانب پرائی آگ
اپنے تو کھیلنے کو ہیں اپنے لہو سے پھاگ
ہیروشِما کا واقعہ بھولے نہیں اگر
اپنے جہان، جان، جوانی کی لو خبر
دشٹوں کے موت نامے پہ تم دستخط کرو
یا ان کے حلقِ تر پہ یوں انگشتِ تر دھرو

لوگوں پہ ٹیکس، چندے کی بھرمار الاماں
چندہ نہ ہو تو ڈنڈے کی بوچھار الاماں
بکری پہ ٹیکس، مال منگانے پہ ٹیکس ہے
چلنے چلانے، کھانے کمانے پہ ٹیکس ہے
آکاس بیل ٹیکس کی ہیٹو مہنت ہے
پت جھڑ ہے بوٹے بوٹے پہ اس پر بسنت ہے
جونکوں کا گھر ہے فنڈ کی ڈائن کی آنت آنت
پہنچے ہیں دور دور خزانے کے تیز دانت

شہروں میں تم دہات میں بدحال ہیں کساں
ہر دست کار لوٹ کے ہاتھوں لہولہان
افسوس ہے کہ اس پہ بھی جنگی بجٹ بنے
جنتا کی نس پہ نس کٹے، گنجی کی لٹ بنے
اس چھت کے نیچے کیا ہمیں ٹیکے کا ڈر نہیں؟
شاید تمھاری زنگِ فضا پر نظر نہیں
اس چارٹر کی ناک پہ یہ عہد نامہ کیوں؟
یو، این، او، کی سٹیج پہ لیگی ڈرامہ کیوں؟

یہ دھمکیاں، یہ جنگ کا پرچار کس لئے
زہریلی گیسیں، ایٹمی ہتھیار کس لئے
کیوں لبِ بہ لب اگلتے ہیں نشرِ فرنگی لاٹ
کیوں دیس دیس ناچتے پھرتے ہیں جنگی لاٹ
یہ ملک ملک ایٹمی اڈوں کے جال کیوں؟
دیسی بدیسی موذیوں کی ایک چال کیوں؟
روس جدید نے کبھی دھاوا کیا بھی ہے
اس بن اندھیری رات میں کوئی دیا بھی ہے
کتنی ہے یہ اپیل، کیوں نکلے ہماری کھاٹ
کیوں لوٹیں بھول بھول کے ڈاکو بڑا بہاٹ

مژدۂ صلح کیش ہے پنچایتوں کا دیش — نیکی میں بیش بیش ہے پنچایتوں کا دیش

جیون کی لازوال بہاروں کا باغ ہے — طوفانِ موج موج میں بحری چراغ ہے

آزاد بھائی چارہ کی منزل کا وہ نشاں — جس کی طرف سفینہ سفینہ رواں دواں

بھاتا نہیں ہے سایہ بنی جان کا اُسے — چسکا نہیں ہے بھوت کے پکوان کا اُسے

سائنس کے لالہ زار میں عنقا ہے بھوک پیاس — اس کے گلوں میں کینہ و نفرت کی بُو نہ باس

اُلٹا وہ اس کو دیتے ہیں بہتان جنگ کا — کرتے ہیں خود جو کھیڑے ہیئے سامان جنگ کا

پھانسی کے سائے میں کسی نازی کا غول ہے — "ہم پر بھی جرمِ قتل، یہ کیسا مخول ہے!"

فاشسٹ یانکیوں کو بھی شاید خبر نہیں — کچلا ملک بھی ان کے مقدر میں یاں نہیں

ٹھہریں گے وہ بھی قاتلِ انسان ایک دن — کر دیں گے ان کا آخری چالان ایک دن

جنگی جہازوں پہ لئے پھرتے ہیں بم پہ بم — ہائیڈروجن، ایر جراثیم ، ذرّہ بم

پھینکیں جو ریڈیائی شعاعوں کو دور سے — لپکے بلا کی برقِ جہنم کے طور سے

دیتے ہیں بات بات پہ حملے کی دھمکیاں — پہنی ہوئی نہیں کسی نے چوڑیاں یہاں

میدانِ امن و جنگ میں مردوں کی طرح آئیں — رکھیں تو ہاتھ ہاتھ پہ، دیکھیں جو جیت چلیں

شاہد ہے ذرّہ ذرّہ ستالن گراڈ کا — جگ میں نہیں جواب ہمارے جہاد کا

ہم کو ریا کی طرح جو ہاتھوں میں ڈھال لیں — نٹ پونجیوں کا دم میں جنازہ نکال دیں

سردار جعفری

پتھر کی دیوار

کیا کہوں بھیانک ہے
یا حسیں ہے یہ منظر
خواب ہے کہ بیداری
کچھ پتہ نہیں چلتا
پھول بھی ہیں سائے بھی
خاک بھی ہے پانی بھی
آدمی بھی محنت بھی
گیت بھی ہیں آنسو بھی
پھر بھی ایک خاموشی
روح و دل کی تنہائی
اک طویل سناٹا
جیسے سانپ لہرائے

ماہ و سال آتے ہیں
اور دن نکلتے ہیں
جیسے دل کی بستی سے
اجنبی گذر جائے

چیختی ہوئی گھڑیاں
زخم خوردہ طائر ہیں
نرم رو سبک لمحے
منجمد ستارے ہیں
رینگتی ہیں تاریکیں
روز و شب کی راہوں پر

ڈھونڈتے ہیں چشم و دل
نقشِ پا نہیں ملتے
زندگی کے گلدستے
زیبِ طاقِ نسیاں ہیں

پتیوں کی پلکوں پر
اوس جگمگاتی ہے
املیوں کے پیڑوں پر
دھوپ پر سکھاتی ہے
آفتاب ہنستا ہے
مسکراتے ہیں تارے
چاند کے کٹورے سے
چاندنی چھلکتی ہے
جیل کی فضاؤں میں
پھر بھی اک اندھیرا ہے

جیسے ریت میں گر کر
دودھ جذب ہو جائے
روشنی کے گالوں پر
تیرگی کے ناخن کی
سیکڑوں خراشیں ہیں

پتھروں کی دیواریں

بارکوں کی تعمیریں
اژدہوں کے پیکر ہیں
جو نئے اسیروں کو
رات دن نگلتے ہیں
اُن کے پیٹ کی دوزخ
کوئی بھر نہیں سکتا

پتھروں کی دیواریں

بھوک کا بھیانک روپ
چکیوں کے بھدے راگ
روٹیوں کے دانتوں میں
ریت اور کنکر ہیں
دال کے پیالوں میں
زرد زرد پانی ہے
چاولوں کی صورت پر
مفلسی برستی ہے
سنڈیوں کے زخموں سے
پیپ سی ٹپکتی ہے

پتھروں کی دیواریں

درد و غم کے پیروں میں
آنسوؤں کی زنجیریں

بے بسی کی محفل میں
حسرتوں کی تقریریں
رسیوں کی گانٹھوں میں
بازوؤں کی گولائی
نیم جان قدموں میں
بیڑیوں کی شہنائی
ہتھکڑی کے حلقوں میں
ہاتھ کسمساتے ہیں
پھانسیوں کے پھندوں میں
گردنیں تڑپتی ہیں

پتھروں کی دیواریں

جو کبھی نہیں روتیں
جو کبھی نہیں ہنستیں

اُن کے سخت چہروں پر
رنگ ہے نہ غازہ ہے
کھردرے لبوں پر صرف
بے حسی کی مہریں ہیں

پتھروں کی دیواریں
پتھروں کے سینے ہیں
جن میں خون کے قطرے
دودھ بن نہیں سکتے
پتھروں کے دفتر ہیں
پتھروں کی مسلیں ہیں
پتھروں کے جیلر ہیں
وارڈر ہیں پتھر کے
پتھروں کے نمبردار

پتھروں کی دیواریں
پتھروں کے فرش اور چھت
پتھروں کی محرابیں
پتھروں کے بازو ہیں
پتھروں کے دروانے
پتھروں کی انگڑائی
پتھروں کے پنجے ہیں
آہنی سلاخیں ہیں

اور ان سلاخوں میں
حسرتیں، تمنائیں
آرزوئیں، امیدیں
خواب اور تعبیریں
اشک، پھول اور شبنم
چاند کی جواں نظریں

دھوپ کی سنہری زلف

بادلوں کی پرچھائیں
صبح و شام کی پریاں
موسموں کی لیلائیں
سولیوں پہ چڑھتی ہیں

اور اس اندھیرے میں
سولیوں کے سائے میں
انقلاب پنپتا ہے
تیرگی کے کانٹوں پر
آفتاب چلتا ہے
پتھروں کے سینے سے
سرخ ہاتھ اُگتے ہیں
ہاتھ ہیں کہ تلواریں
رات کی سیاہی میں

جیسے شمع جلتی ہے
انگلیاں فروزاں ہیں
بارکوں کے کونوں سے
سازشیں نکلتی ہیں
خامشی کی نبضوں میں
گھنٹیاں سی بجتی ہیں

جانے کیسے قیدی ہیں
کس جہاں سے آئے ہیں
ناخنوں میں کیلیں ہیں
ہڈیاں شکستہ ہیں
نوجوان جسموں پر
پیرہن ہیں زخموں کے
لینتی جبینوں پر
خون کی لکیریں ہیں

اشک آگ کے قطرے
سانس تند آندھی ہے
بات ہے کہ طوفاں ہے
ابروؤں کی جنبش میں
عزم مسکراتے ہیں
اور نگہ کی لرزش میں
حوصلے مچلتے ہیں
تیوریوں کی شکنوں میں
نقشِ پا بغاوت کے

جتنا ظلم سہتے ہیں
اور مسکراتے ہیں
جتنے دُکھ اٹھاتے ہیں
اور گیت گاتے ہیں
جبر اور بڑھتا ہے

زہر اور چڑھتا ہے
ظالموں کی شدت پر
ظلم چیخ اٹھتا ہے
اُن کے لب نہیں ہلتے
اُن کے سر نہیں جھکتے
دل سے آہ کے بدلے
اک صدا نکلتی ہے
"انقلاب زندہ باد"

خاکِ پاک کے بیٹے
کھیتیوں کے رکھوالے
ہاتھ کارخانوں کے
انقلاب کے شہپر
کارل مارکس کے شاہیں
پتھروں کی کوروں پر

آندھیوں کی راہوں میں
بجلیوں کے طوفاں میں
گولیوں کی بارش میں
سر اٹھائے بیٹھے ہیں

بے کسی و مجبوری
مفلسی و ناداری

انقلاب ساماں ہے
ہند کی فضا ساری
نزع کے ہے عالم میں
یہ نظامِ زرداری
وقت کے محل میں ہے
جشنِ نو کی تیّاری
جشنِ عام جمہوری
اقتدارِ مزدوری
غرقِ آتش و آہن

تیرگی کے بادل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ کب
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آ جائے

(آرتھر روڈ جیل بمبئی)

سنگِ میل
مارچ ۱۹۵۰ء

فراق گورکھپوری

مزدور - سرمایہ دار - انقلاب

ہم دنیا کو چلانے والے
اور ہمیں پامال، یہ کیا ہے؟
ہم دنیا کے بچانے والے
اور اتنے بدحال، یہ کیا ہے؟
ہم کو بھوکا رکھ کر ہم سے
دھن کبیر کا کام لیا ہے
اپنی وشا سوچ کر اکثر
ہم نے کلیجہ تھام لیا ہے
ساتھی مرتا کیا نہیں کرتا
کس کس پر الزام دھرے
جم جم جیئے یہ پیاری دنیا
لیکن ہم بے موت مرے
اپنے پسینے کا جم جانا
دھن، پونجی، سرمایہ داری
سب اپنے ہی لہو سے پلے ہیں
سیٹھ، مہاجن، راج ادھیکاری

باغ میں ہیں، ان کو زہریلے
کانٹے بونا آتا ہے
اِن کے انرتھ کو دیکھ دیکھ کر
ساتھی رونا آتا ہے
کیسا اپنا دیس اپنا گھر
ساتھی اپنا بس ہے اتنا
پھٹے ناخنوں میں جتنا ہے
ٹکڑا بھارت کی مٹی کا
پانی میں یہ آگ لگا دیں
سیٹھ، مہاجن ایک کائیاں
جنگ کی گھاتیں صلح کی باتیں
دھماچوکڑی، اڑن گھائیاں
جب جب جنگ چھڑی دیشوں میں
جو بھی پڑی ہم پر ہی پڑی
بھس میں چنگی دے کر ساتھی
دیکھ جمالو دور کھڑی

capital congealed labour — Marx

اربوں کے ہیں وارے نیارے
داؤں بھی ہیں دوہرے دوہرے
چالیں ان کی بازی ان کی
ہم ہیں بس شطرنج کے مہرے

یہ سب مردم خور ہیں ساتھی
ان کے ساتھ مروت کیسی
یہ دنیا ہے ان کی ملکیت
اس دنیا کی ایسی تیسی

پنٹوا اب بپھری جنتا سے
کرنی دھرنی لے کر چاٹو
مٹھی بھر بھر کے دیتا ہیں
بوئی ہوا بو تڈر کا ٹو

سنگینوں سے بندوقوں سے
تم نے کئے ہزاروں دار
باری ہے اب مزدوروں کی
"اک کچلو ہیا آڑ دہمار"

دب سٹھ سے کب کام چلا ہے
لوہا ہی لوہے کو کاٹے
ساتھی سنا نہیں کیا تو نے
سیدھے کا منہ کتا چاٹے

بیکاری، بھوک مری، لڑائی
رشوت اور چور بازاری
بے بس جنتا کی یہ درگت
سب کی جڑ سرمایہ داری

ٹھوکر پر ٹھوکر کھا کر بھی
اپنی منزل سے بیگانے
آنکھ کے اندھے نام نین سکھ
ہم کو چلے ہیں راہ بتانے

آج بھی کھاتے والوں سے
صدیوں کا لیکھا ہم لیں گے
آٹے دال کا بھاؤ کھلے گا
جس دم جمع خرچ سمجھیں گے

لال، جواہر، سونا، چاندی
کومنٹانگ پر کیا نچھاور
کیوں نہ ہو؟ ڈالر سامراج کا
ناچ رہا تھا بھوت جو سر پر
اس دولت سے امریکہ کا
جوبن اور سنوارا ہوتا
آج امریکہ ایک زمانے کی
آنکھوں کا تارا ہوتا
بینکوں، ملوں، کارخانوں کو
ہم جو ہاتھوں میں لے لیتے
ہُن برسا دیتے ساتھی ہم
دیش کو سونے میں مڑھ دیتے
یو۔این۔او میں یونیسکو[ل] ہیں
روس پہ دوش لگاتے جاؤ
کرکے بے حیا تقریریں، تم
اپنی جھینپ مٹاتے جاؤ

جاپان اور مغربی جرمنی
یونان، اٹلی، یوگوسلاویا
کشمیر اور نیپال اور تبت
ساؤتھ کوریا اور ملایا
توڑ پھوڑ میں ہرج نہیں ہے
کچھ تو کریں جب جی للچائے
چور اگر چوری نہ کرے تو
ہیرا پھیری سے بھی جائے
چین کو مت تسلیم کرو
یاروں نے ڈھب کیا کیا سوچے
ٹھیک تو ہے کھسیانی بلی
کچھ نہ بنے تو کھمبا نوچے
اب فارموسا پر نظریں ہیں
گو یہ جگہ ہے نہایت چھوٹی
لیکن اب اس کو کیا کیجے
بھاگے بھوت کو بہت لنگوٹی

ل UNESCO

چین سے جب نکلے تو تم نے
ہند چین[ے] میں ٹانگ اڑائی
ڈٹ گئے نئے اکھاڑے میں تم
اور جو یہاں بھی منہ کی کھائی
مارشل ایڈ، ایٹلانٹک پیکٹ
خانے ٹرپڑ بھرتے جاؤ
اسی طرح دنیا بھر میں تم
گڑبڑ سربڑ کرتے جاؤ
وال اسٹریٹ کے سٹے بازو
کانپ جاؤ اس لشکر سے
ہٹلر، چیانگ کے اڑا دیئے سر
جس نے اپنی ٹھوکر سے
جنگ سے تم کو لابھ ہوا جو
اُس کو جوڑو اور شرماؤ
کنٹھ میں آنکھیں جیت کے دعوے
گنو اگر تم روس کے گھاؤ

زبردست جرمن فوجوں سے
لڑے اکیلے تم یا روس؟
جیتے ہوئے دشمن کو بھگاتے
برلن پہنچے تم یا روس؟
نگل لیے جانے پر کس نے
پیٹ اجگر کا پھاڑ دیا ہے
سب سے پہلے رائخس ٹاگ پر
کس نے جھنڈا گاڑ دیا ہے
آج روس پھنک جانے پر بھی
پنپ اٹھا ہے چمک اٹھا ہے
تم پر آنچ نہ آئی لیکن
باغ تمہارا سوکھ چلا ہے
دنیا بھر بازار ہے جس کا
اک منڈی ہیرا پھیری کی
اُس امریکہ کی یہ حالت
یہ بیکاری وحشت تیری کی[ے]

[ے] INDO CHINA

[ے] اس سمے امریکہ میں ایک کروڑ مزدور بیکار ہیں

ٹھنڈی لڑائی آخر کب تک
اک دنیا سے رہے گی جاری
امن کے سچے دلدادوں سے
بات نہ کی، تم نے جھک ماری

دم میں رسّا باندھ چکے ہیں
ٹھوکر دیں گے دھکا دیں گے
اسی گھڑی ہم دم لیں گے جب
چور کو گھر تک پہنچا دیں گے

اب کیوں دیر لگائیں ساتھی
اب تو کمر دشمن کی خم ہے
آدمی دنیا جیت چکے ہیں
اب تو منزل چار قدم ہے

دنیا ہاتھ نہیں آتی ہے
دنیا لے لی جاتی ہے
قسمت نہیں بدلتی ساتھی
قسمت بدلی جاتی ہے

دُنیا جسے "آج" کہتی ہے
سنگم کئی جگوں کا ہے
بیتا ہوا "کل" اوروں کا تھا
آنے والا "کل" اپنا ہے

سرد دیس کے سکھ سپنے میں
کون پکار رہا ہے ساتھی
جیون ساگر نئی دشا ہیں
ٹھاٹھیں مار رہا ہے ساتھی

روس چین کی ہمت کرنیں
پربھات کی آبھا لائیں
نو جگ کا سندیشہ لائیں

اُتر، دکھن، پورب، پچھم
آگے، پیچھے، اوپر، نیچے
دیش دیش میں دنیا بھر میں
توڑ رہی ہے دم تاریکی
سرخ سویرا ہونے کو ہے

بھارت کے آکاش میں ساتھی
اُدیاچل کی اوٹ سے ساتھی
وہ رکتم پو کھپوٹ رہی ہے
انگڑائی توڑ تا ایشیا
بند آنکھیں ملتا افریقہ
دمن، دلت، جابنگی، امریکہ
گہری نیند سے چونک اٹھے ہیں
دیش دیش میں مہاکرانتی کی
رن چنڈی، ہنکار رہی ہے
سو بل کھاتی ہوئی مچل کر
یا ناگن پھنکار رہی ہے
کاریگر۔ مزدور، کسان
کڑیل اور بگڑیل جوان
کاندھے سے کاندھا جوڑیں گے
دنیا پر دھاوا بولیں گے

تختہ دھرتی کا الٹیں گے
دنیا میں سمروودے ہوگا
نیا سماج آنکھیں کھولے گا
نئی سبھیتا قائم ہوگی
ذرہ ذرہ جاگ اٹھے گا
قطرہ قطرہ جاگ اٹھے گا
پتہ پتہ جاگ اٹھے گا
بوٹا بوٹا جاگ اٹھے گا
کونا کونا جاگ اٹھے گا
چپہ چپہ جاگ اٹھے گا
تپہ تپہ جاگ اٹھے گا
قصبہ قصبہ جاگ اٹھے گا
صوبہ صوبہ جاگ اُٹھے گا
دریا دریا جاگ اُٹھے گا
صحرا صحرا جاگ اُٹھے گا
جیون سپنا جاگ اٹھے گا

۱۸ ستمبر
اکتوبر

فکر تونسوی

ایشیا چھوڑ دو!

آج میں سن رہا ہوں،
در و بام سے، صبح اور شام سے
اک صدا ـــــ گھومتی، گونجتی چارسو
"ـــــ ایشیا چھوڑ دو! ایشیا چھوڑ دو!"
کون ہے، روک سکتا ہے جو آج اس سیلِ آواز کو
کون ہے نوچ لے
آج انسان کے سرخ ماتھے پہ سورج چمکتا ہے جو
کون ہے جو بُجھا دے اسے،
آج جلتا ہے جو وقت کی آنکھ میں ایشیا کا چراغ
آج تاریخ کی آنمار اک فیلر کے بنیکوں سے نکلی ہے پر جھاڑ کر
آج تاریخ نے کاغذوں، دفتروں، فائلوں سے ابھارے ہیں لاکھوں قلم

آج تاریخ آزاد کندھوں پہ جاتی ہے اُڑتی ہوئی
آج تاریخ لہراتی ہے زرد دریاؤں کی موج پر
آج تاریخ برما کے پیڑوں، ربڑ کی کھلی کھیتیوں میں ہے نغمہ فشاں
آج تاریخ کابل سمندر کی چھاتی پہ ہے تیز دم، تیز تر، تیز رو
آج تاریخ یوسان و پیکنگ کی گودیوں میں ہے کلکاریاں مارتی
آج تاریخ چائے کے باغات میں چن رہی ہے حرارت بھری پتیاں
آج تاریخ رانجھے کے بیلے میں بجتی ہے اک بنسری کی طرح
آج تاریخ گاتی ہے گندم کے کھیتوں میں جاٹوں کے راگ
آج تاریخ تجن کے چرخوں کی گھمکار میں کاتتی ہے بغاوت کا سوت
آج تاریخ دو چار دس کی نہیں
آج تاریخ لاکھوں کروڑوں کی ہے ـــــ!

(۲)

دیکھو اٹھے ہیں انگڑائیاں لے کے وہ ایشیا کے غلام
دیکھو ناچے ہیں جنگل، کہستاں، سمندر اسی تال پر
"ـــــ ایشیا چھوڑ دو، ایشیا چھوڑ دو!"
سالہا سال کی بدنما داستانیں نگاہوں میں ہیں
داستانیں وہ آنسو بہاتی ہوئی، کچھ نہ کہتی ہوئی، ظلم سہتی ہوئی

ایک چھاتی جو پھیلی رہی کوریا کے کناروں سے فردوسی شاعر کے طہران تک
مدّتوں اس پر ڈالر اگائے گئے
فورڈ کی موٹریں دندناتی رہیں
گاڑھا ہوتا رہا لنکا شائر کی ہر فیکٹری کا دھواں
وال اسٹریٹ کے میگساروں کے پیالے لبالب بھرے
نامیوں کے بڑے بوٹ آتے رہے
گنگا کی بیٹیوں کے گلابی لبوں کو کچلتے رہے
ساونوں کی پھواریں جرلاتے رہے
دھان کا دانہ دانہ اٹھاتے رہے
تاج محلوں، اجنتا کے غاروں پر پہرے بٹھاتے رہے
دودھ کی مٹکیاں پھوڑ کر بوتلیں وہسکیوں کی سجاتے رہے
اور کل ایشیا — ایک حیرت کے نقطہ میں سمٹا ہوا
دیکھتا، سوچتا، سوچتا، دیکھتا
——گندمیں کھیت میں لہلہاتی بھی ہیں
ندیاں اپنے موتی لٹاتی بھی ہیں
اور بوڑھے ہمالہ کی چھاتی کہ سونا اگلتی بھی ہے
صبحدم جگمگاتے بھی ہیں کاندھے پہ جاٹوں کے ہل

بیج اور گودیاں، بیلیاں، کونپلیں اور خوشے بھی ہیں
گلیوں، چوپالوں اور پنگھٹوں سے درانتی اُبھرتی بھی ہے
بچے، مٹیارنیں، بیویاں، بوڑھیاں، بڈھے، گبھرو سبھی
مل کی سیٹی جنھیں کھینچ لیتی ہے ہر روز اپنی طرف
خوں نچڑتا بھی ہے، ہڈیاں چرچراتی بھی ہیں
ہونٹوں پر پپڑیاں، آنکھوں میں بے حسی رنگ اپنا جماتی بھی ہے"
اس پہ بھی ایشیا سوچتا، دیکھتا، دیکھتا، سوچتا
"کیوں گنہگار ہیں، کیوں ستم خوار ہیں
کیوں گذرتی ہے بس دھول ہی پھانکتے، ریت ہی چاٹتے"

(۳)

آج حیرت کا جادو مگر ٹوٹ کر رہ گیا دوستو!
آج ابھری ہیں یوں ایشیا کی ہواؤں میں بھنچتی ہوئی ان گنت مٹھیاں
جیسے گہرے اندھیرے میں نکلا ہو اک مشعلوں کا جلوس
اور یہ مشعلیں روشنی پھینکتی جا رہی ہیں لٹیروں کے چہروں پہ آج
راہزن اب کوئی چھپ سکے گا نہیں
چاہے وہ فرانس ہو، ڈچ ہو، امریکا ہو یا کہ برطانیا
آج اتریں گے چہروں سے سارے نقاب

وہ کوئی باؤ دائی ہو، تھاکن ہو یا اصفہانی ہو، برلا ہو یا چیانگ ہو

آج کوئی نہیں جو کروڑوں نگاہوں سے اٹھتی ہوئی آندھیاں روک لے

آج کوئی نہیں جو کروڑوں صداؤں کو ڈالر کی جھنکار میں کھو سکے

آج کوئی نہیں، آج کوئی نہیں، آج کوئی نہیں

آج تو سن رہا ہوں میں چاروں طرف

اک صدا گونجتی، جھومتی، گھومتی

"ـــــ ایشیا چھوڑ دو! ایشیا چھوڑ دو!"

شاہراہ

دسمبر

فیض احمد فیض

قوّالی

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گذرے گی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہولے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صدا آ تو چکے محفل میں اس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پندِ بیجا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

شاہراہ
سالنامہ

سرِ مقتل

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

سویرا
۸۶۷

قتیل شفائی

جشنِ بہاراں

مینہ برستا ہے تو دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھول کھلتے ہیں تو گلشن پہ نکھار آتا ہے

لیکن اے جشنِ بہاراں کے نئے منتظمو!
خود فریبی سے کہیں دل کو قرار آتا ہے

تم اگر جشنِ بہاراں بھی کہو گے اس کو
موت کے گھاٹ یہ دھوکہ بھی اتر جائے گا

بادِ صرصر کو اگر تم نے کہا موجِ نسیم
اس سے موسم میں کوئی فرق نہیں آئے گا

یہ گلستاں، یہ گلستاں میں سسکتے غنچے
اپنے اعمال کے پردے میں انھیں ڈھانپ تو لو

اقتدار آج بھی سرگرمِ سفر ہے لیکن
رہگذاروں کے ارادوں کو ذرا بھانپ تو لو

آج انسان کی عظمت نے کیا ہے اعلان
خود فریبی سے کوئی جی کو نہ بہلائے گا

جب تک آرائشِ گلزار نہیں ہو جاتی
کسی کونپل کسی غنچے کو نہ چین آئے گا

لیکن اے جشنِ بہاراں کے نئے منتظمو!
یہ تماشا ہمیں بیکار نظر آتا ہے

مینہ برستا ہے نہ دھرتی کی نظر جھومتی ہے
پھول کھلتے ہیں نہ پھولوں پہ نکھار آتا ہے

جو کلی ہے غم و اندوہ سے مرجھائی ہے
کون کہتا ہے کہ گلشن میں بہار آئی ہے

نقوش جالندھر
اکتوبر

کمال احمد صدّیقی

دائمی امن کے لئے

موت کا کب تک رہے گا زندگی پر اقتدار
کب تک آخر موت کا چلتا رہے گا بیوپار!
کب تلک یہ آستیں کے سانپ یہ سرمایہ دار
کب تلک یہ سامراجی بھیڑیئے بے اختیار
قوّتِ تخلیقِ انساں پر کریں گے یونہی وار

آج تو اک جرمِ سنگیں تر ہے انسانوں کی بات
زندگی کے، امن و خوشحالی کے ارمانوں کی بات
معتبر ہے صرف ڈالر کے جہانبانوں کی بات
عظمت و تقدیسِ حسن و فن ہے افسانوں کی بات
نُت کے بازاروں میں بک جاتا ہے ہر شاہکار

ڈالروں کے دیس کے سیٹھوں کی یہ عیّاریاں
کوریا کے شہریوں پر ان کی یہ بم باریاں
قتل اور غارتگری اور قحط اور بیماریاں
ان کا مقصد ہیں فقط ان کی اجارہ داریاں
ان کی دولت کا فقط ہے لُوٹ پہ دارومدار

بو رہے ہیں امن کے کھیتوں میں یہ چنگاریاں
کر رہے ہیں جنگِ عالمگیر کی تیّاریاں
متّحد اقوام کے پردے میں یہ مکّاریاں
لاکھ ایٹم بم سے یہ پیدا کریں دشواریاں
آج دنیا بھر کی جنتا ہو چکی ہے ہوشیار

ہو منافع کے پجاری موت کے سوداگرو!
جس تمدن کا بھی چاہو آج تم دعویٰ کرو
آدمیت سے غرض کیا تم تو آدم خور ہو
ڈالروں کے دیس کے اے بنیو، بقالو سنو
آج تم اپنی ہی جنتا کی نگاہوں میں ہو خوار

منڈیاں ہیں تیل کے چشمے ہیں ٹن ہے اور ربر
اس وجہ سے ایشیا پر ہے عنایت کی نظر
چین سے بڑھ کر ہے تم پہ فارموسا کا اثر
(انڈمن کو دو گے تم ترجیح ہندستان پر)
بے ایمانوں کو کوئی کیسے کہے ایمان دار

ہم نے دیکھا ہے تمہاری وحشی فوجوں کا چلن
شاہراہوں پر زنا بالجبر ہے جن کی لگن!

سڑ رہی ہیں خندقوں میں لاکھوں لاشیں بے کفن
کوریا میں ہم نے دیکھا ہے، محبانِ وطن
تم نے گولی سے اُڑائے ہیں قطار اندر قطار

قید کر سکتے ہو اور کوڑے لگا سکتے ہو تم
اور بنامِ امن گولی سے اُڑا سکتے ہو تم
قتل کے جھوٹے مقدمے بھی چلا سکتے ہو تم
کیا حقیقت کو بھی سولی پر چڑھا سکتے ہو تم
زندگی کی روشنی ہے بے نیازِ گیر و دار

متحدہ اقوام کی ساری سیاست کھل گئی
دعویٰ و دستور میں جو تھی صداقت کھل گئی
زر خریدوں، جی حضوروں کی شرافت کھل گئی
جنگ کا نعرہ دیا تم نے، حقیقت کھل گئی

کب تلک ہو کے ہیں لکھ سکتا تھا آخر اشتہار

رہزنوں کو دیکھ بن بیٹھے ہیں کیسے راہبر
کوئی ٹرومن ہے، کوئی چرچل، کوئی ہیک آئے کھر
کوئی جنرل فرانکو ہے، کوئی ٹیٹو ہے، مگر—
سب کے سب لعنت ہیں اپنے ملک، اپنی قوم پر
ہٹلر و میسولینی، ٹوجو کی ہیں یہ یادگار

سنگمن ری نے جو ڈھائی ہے قیامت دیکھ لی
ڈاکٹر ہٹا کی، تھاکن کی قیادت دیکھ لی
جو اٹھائی باؤ دائی نے ہزیمت دیکھ لی
چیانگ کائی شیک کے پتوں کی قیمت دیکھ لی
کوڑیوں کے مول اب بکنے لگے ہیں شہریار

(۲)

جن کی محنت پر ہے تعمیر جہاں کا انحصار
وہ بنائے کب تلک اوروں کے محل، اپنے مزار
جبر سرمایہ کے آخر کب تلک رہتے شکار
کب تلک آخر کرتے رہتے اپنے اشکوں کا شمار
آج خود انصاف کرنے کو اٹھے ہیں کامگار

متحد ہیں ایک مرکز پر جہاں بھر کے عوام
آسمانی ان کا پرچم، امن ہے ان کا پیام
موت بھی کرتی ہے ان کی زندگی کا احترام
کوئی کر سکتا نہیں ان کے ارادوں کو غلام
پھیل سکتا ہی نہیں ان کی صفوں میں انتشار

آج ہر انسان بہتر زندگی کا ہے سفیر
زندگی کو آج کوئی کر نہیں سکتا اسیر
زندگی اور امن کی تحریک ہے آفاق گیر
آج زر سے تُل نہیں سکتا محبت کا ضمیر
جنگ کی سازش کا دامن ہو چکا ہے تار تار

جنگ تو ہے اہلِ سرمایہ کا اک خواب گراں
شاہراہِ امن پر انسانیت کا کارواں
جا رہا ہے زندگی کے گیت گاتا ۔ کامراں
امن ہے قوت کا مرکز ۔۔ وہ ہیں اس کے پاسباں
جن کی شریانوں میں خوں ہے، جن کے سینوں میں شرر

نو بہ نو ہستی موت کے سانچے میں ڈھل سکتا نہیں
کلچر اور تہذیب کا اب ڈھونگ چل سکتا نہیں
فیصلہ جنتا جو کر لے وہ بدل سکتا نہیں
یہ نظامِ زر کسی صورت سنبھل سکتا نہیں
ہم نے دیکھے ہیں زمانے کے سبھی لیل و نہار

جنگ کا اڈا نہ بننے دیں گے ہم اپنا وطن
یہ ہماری زندگی، یہ زندگی کا بانکپن
یہ ہمارے شہر، یہ دیہات، یہ دشت و دمن
یہ شگوفے، یہ بہاریں، یہ خیاباں، یہ چمن
ہم نے اپنے خون سے سینچا ہے ہر اک لالہ زار

لے کے آئے گا حیاتِ نو کی سرخی آفتاب
رقص میں ہوں گی بہاریں، وجد میں ہوگا شباب
عالمِ نو کی بنا ڈالیں گے مزدوروں کے خواب
زندہ باد اے انقلاب ۔ اے انقلابِ کامیاب
آج اسی دھڑکن کا قلبِ ہند کو ہے انتظار

شاہراہ
دسمبر

مخمور جالندھری

ہائیڈروجن بم

نقابِ ریشم، غلافِ مخمل میں چھپنے والو
تمھیں اسی ریشم اور مخمل کی چاندنی میں برہنہ تن دیکھتا رہا ہوں
تمھیں تمھارے تمام پردوں، تمام پیراہنوں میں پہچانتا رہا ہوں
میں تم سے تاریخِ دہر کے ہر ورق پہ جنگ آزما رہا ہوں
یقیں نہ ہو تو پلٹ کے دیکھو
خزاں خزاں دامنِ زمانہ میں کچھ تمھارے ہی کوہ قامت طلسم ٹوٹے ہوئے ملیں گے
تمھارے ہی چند جدِّ امجد نظامِ گل سڑ کے طاقچوں میں پڑے ملیں گے
مگر تمھیں میں عمیق گہرائیوں، نشیبوں سے پستیوں سے ہمیشہ اٹھتا ہوا ابھرتا ہوا ملوں گا
غلاظتوں کی، عفونتوں کی مجھے توقع رہی ہے تم سے
کہ تم ہو جرم و گناہ، حرص و ہوا کے وارث
تماشہ گاہِ کلوشیم کے کئے ہیں دروازے بند میں نے
کہ جس میں شیروں کو تم نے آدم کے خوں پہ پالا
کہاں ہیں وہ شرمناک بازار جن میں تم نے
گراں بہا عصمتوں کو ہنس ہنس کے ڈھول کے بھاؤ بیچ ڈالا
پلٹ کے دیکھو کہ تم نے ہر ہر قدم پہ مجھ سے شکست کھائی
وہی پرانے گماں، وہی کہنہ سال امیدیں ہیں اب بھی تم سے
کہ جب بھی تم کپکپاؤ گے تو گراؤ گے آسماں سے پتھر
تم اپنے ذہنوں میں گندگی اور سڑاندا تنی رچا چکے ہو

کہ جب بھی ایجاد کچھ کروگے تو وہ بھیانک عذاب ہوگا
تمہیں تو تھے وہ جنھوں نے سوچا
کہ آدمی کے بدن میں ٹھونکوگے کیل تو اس کی سب سے پُر لطف موت ہوگی
جدا ہوا تن سے سر "گلوٹن" میں تو وہ منظر حسین اور دلفریب ہوگا
پگھل کے شہر اک دھواں دھواں ہوگیا۔ تو اس کے کھنڈر کی تصویر خوشنما شاہکار ہوگی
بچھا کے پھولوں کو سیج پہ تم مسلتے آئے
کہ میں چمن بندیوں سے بیزار ہو اٹھوں گا
مگر میں گلکاریوں سے اب تک تھکا نہیں ہوں
ڈرا رہے ہو مجھے تم اپنے نئے کرشمے کی ہولناکی بتا بتا کر
پلٹ کے دیکھو تمھارے ہر شعبدے کا انجام کیا ہوا ہے
پہاڑ مٹھی میں بند کرلو۔ سمندروں کو سمیٹ لاؤ
غلیظ ارادوں کو ایک بار اور آزمالو
یہ میری دنیا ہے، اپنی دنیا تباہ ہونے نہ دوں گا، اب کے
یہ شہر اب منہدم نہ ہوں گے نئے مقام آشکار ہوں گے
میں اپنے بچوں کو سونپنا چاہتا ہوں۔ ایسا جہاں کہ جس میں تم ایسا زنگ سیہ نہ ہوگا
نقابِ ریشم، غلافِ مخمل میں چھپنے والو
اُسے ڈراتے ہو جس نے اوہام توڑ کر رکھ دیئے تمھارے
وہ جس کے بازو اُداس کھیتوں کا ہیں تبسم
وہ جس کی مضبوط انگلیاں ہیں کلوں کی دھڑکن
وہ جس کا ذہن اک عظیم گلشن؟

منیب الرحمن

ساقی نامہ

مرا فکر ہے کوچہ گردِ سپہر | مجھے لے گئی جستجو شہر شہر
گیا میں ہر اک میکدے میں وہاں | کہ شاید ملے مجھ کو تسکینِ جاں
رہا واسطہ میرا عرفان سے | زبور و اوستا و قرآن سے
فلاطوں سے میں درس لیتا رہا | سخنداں تھا میں داد دیتا رہا
نظر کی فرنگی طلسمات پر | مجھے دن کا دھوکا ہوا رات پر
وہاں بھی تھا بادہ، وہاں بھی تھے جام | مگر میں اٹھا تشنہ لب، تشنہ کام
ترے میکدے میں اب آیا ہوں میں | متاعِ دل و جان لایا ہوں میں

جوانانِ شیدا کا مسکن ہے یہ
میں طائر ہوں میرا نشیمن ہے یہ

نئے شیشہ و جام لا ساقیا | مئے نو کشیدہ پلا ساقیا
یہاں آج بدلا ہوا رنگ ہے | تری بزم کا اور ہی ڈھنگ ہے
یہ رندِ بلا نوش شب زندہ دار | وفورِ تمنا سے ہیں بے قرار
شرابِ کہن سے یہ بیزار ہیں | نئی آرزوؤں سے سرشار ہیں
عزائم نئے ان کے میداں نئے | نئی وحشتیں ہیں، گریباں نئے
انھیں مت سنا قصۂ باستاں | نہیں ان کو مرغوب یہ داستاں

وہ پیرِ فسوں ساز مردِ فقیر　　نظر بندیوں میں تھا جو بے نظیر

بتایا گیا ان کو ماضی کے راز　　سناتا رہا قصہ ہائے حجاز

ہوا ردِّ افسوں تو بس قہر تھا　　پتہ یہ چلا نوش میں زہر تھا

روایات کی گرچہ اک شان ہے
تغیّر مگر وقت کی جان ہے

زمانہ بہت تیز رفتار ہے　　یہ چلتی ہوئی ایک تلوار ہے

کسی کے لئے یہ ٹھہرتا نہیں　　مروّت کسی سے یہ کرتا نہیں

گزرتا ہے ہنگامہ کن پُر خروش　　لئے اپنے سینے میں طوفاں کا جوش

کبھی اس میں گل ہیں، کبھی اس میں خار　　کبھی یہ خزاں ہے، کبھی یہ بہار

کبھی آب و آتش، کبھی خاک و باد　　اٹھاتا ہے یہ فتنہ ہائے تضاد

کبھی دشت و صحرا، کبھی بوستاں　　کبھی سنگِ خارا، کبھی پرنیاں

کسی کو بنا کر مٹاتا ہے یہ　　کسی کو مٹا کر بناتا ہے یہ

جسے دیکھتا ہے اجل آشنا　　یہ کرتا ہے اس کو سپردِ فنا

وہی جسم پھر اس کے اعجاز سے　　اٹھاتا ہے سر بالشِ ناز سے

رگوں میں چمکتا ہے تازہ لہو　　مچلتی ہے دل میں نئی آرزو

اجل کو نہ سمجھو زوالِ حیات　　یہ ہے ابتدائے کمالِ حیات

گزرتے ہوئے اس سے ہر ایک شے　　مدارج بلندی کے کرتی ہے طے

یہ ہستی سے ہے اس طرح ہمکنار | کہ ہو جیسے ربطِ سرور و خمار
اسی سے یہ ظاہر، اسی میں نہاں | اسی کی یہ آتش، اسی کا دھواں
اسی سے سمندر کے طوفاں اسیر | اسی سے رواں دشت میں جوئے شیر
یہ اکسیرِ ہستی ہے، ظلمات ہے | یہی روزِ روشن، یہی رات ہے
یقیں بھی ہے یہ اور موہوم بھی | یہ لازم بھی ہے اور ملزوم بھی

فنا و بقا کی جو تکرار ہے

زمانہ اسی سے ثمر بار ہے

اٹھا ساقیا ہاتھ میں جامِ جم | دکھا مجھ کو ایّام کا پیچ و خم
خرد کو بنا راز جو، راز داں | نگاہوں کو دے وسعتِ بیکراں
حوادث کو مربوط و ملزوم کر | توہّم پرستی کو معدوم کر
خیالات کو ذوقِ تحقیق دے | حقائق سمجھنے کی توفیق دے
انھیں پاک کر گردِ ابہام سے | بچا لے تصوف کے کہرام سے
لگے ہیں کھڑے ہیں فریبوں کے دام | یہ ملّا، یہ مفتی، یہ شیخ و امام
معلّم ہے دانش سے نا آشنا | مکاتب نہیں، ہیں یہ دار الفنا
سیاست جہالت کی آئینہ دار | حکومت ہیں جمہوریت کا مزار
زبان و قلم پر ہزاروں قیود | مسلّط ہے اذہان پر اک جمود
یہ کہنہ پرستار، ماضی شکار | سمجھتے ہیں اپنے کو جدت شعار

مئے ذوق سے ان کو مدہوش کر — تجسس کی خُو سے ہم آغوش کر
انھیں سوزِ پیہم سے جلنا سکھا — اسی آگ سے پھر نکلنا سکھا

یہ تیرے سیہ مست ہیں تشنہ کام
اِدھر بھی ہو ساقی ترا فیضِ عام

تراشے غلامی نے اصنامِ نو — سیاست نے پھیلائے دامِ نو
مگر فاش ہونے لگا یہ طلسم — پگھلنے اٹھے ہیں گراں خواب جسم
بدلنے کو ہے اب نظامِ جہاں — نئے موڑ پر آگیا کارواں
گرے آن کی آن میں تخت و تاج — اجل سے ہم آغوش ہے سامراج
غلامانِ مہجور و آشفتہ سر — اٹھے ہاتھ میں لے کے تیغ و تبر
نئی شان سے جادہ پیما ہوئے — بڑھے اور قطرے سے دریا ہوئے
اٹھایا شراروں نے سر خاک سے — چھلکنے لگی مَے رگِ تاک سے
چلی ایک آندھی، گرا ناگہاں — فرنگی کے ہاتھوں سے جامِ جہاں
جھٹکا اور ریزوں کو چُننے لگا — نیا دامِ تزویر بُننے لگا

مگر شہ پہ شہ ہے بُرا حال ہے
یہ شطرنج کی آخری چال ہے

زمانہ بڑا حیلہ جو، حیلہ ساز — یہ کرتا ہے درہائے پیکار باز
بناتا ہے دن کا کفن رات سے — نفی کو لڑاتا ہے اثبات سے

اسی سے رہی جنگِ شاہ و غلام — اسی سے بدلتا رہا ہر نظام

ہوا اس لڑائی سے چالاک و چُست — غلام تہی ذوق، محکوم سُست

جہانِ محبت کا بدلا چلن — ملمع گرِ شیریں ہوا کوہکن

اُٹھی خاکِ پامال، مجنوں بنی — بیاباں بنی، چرخِ گردوں بنی

پرستش سے بندوں نے پائی نجات — گرے بہرِ تعظیم لات و منات

ہوا دورِ سرمایہ داری تمام — زمانہ ہے اب خانہ زادِ عوام

یہ بچے ہیں عصرِ جواں سال کے — امیں ہیں یہ مستقبل و حال کے

کریں گے یہ تخلیقِ دوراں نئے — نئے آدمی زاد، انساں نئے

بسائیں گے اجڑی ہوئی بستیاں — ملادیں گے افلاک سے بستیاں

یہ محکوم و مجبور کا دور ہے
یہ دہقان و مزدور کا دور ہے

پلا ساقیا مجھ کو ایسی شراب — کہ کھل جائیں ایوانِ ہستی کے باب

اٹھے ایک ہنگامۂ نائے و نوش — چلے جھومتا جب تو مینا بدوش

ہے آج پھر رقص دیوانہ وار — کہ ہونے کو ہے صبحِ نو آشکار

افق پر جو یہ تابشِ سرخ ہے — نئے دور کی آتشِ سُرخ ہے

دھڑکتا ہے پھر سینۂ غرب و شرق — مچلتی ہے ان کے رگ و پے میں برق

نقاہت سے تھا نیم جاں ایشیا — اٹھا بن کے سیلِ رواں ایشیا

گری ٹوٹ کر بندگی کی طناب — فرنگی کے خیمے ہوئے غرقِ آب

رجز خواں بڑھے یوں جوانانِ ہند — کہ خالی ہوا شہر سے میدانِ جنگ

ملا باد و برما و ہندوستاں — بنے ہیں کہستانِ آتش فشاں

یہ شعلہ فگن ہے شرر بار ہے — کبھی پھوٹ بہنے کو تیار ہے

مرے منچلوں کو خلش ہے نئی — نئی بھٹیاں ہیں، تپش ہے نئی

مگر سرد ہے ان کا جوشِ جنوں — یہ مدت سے ہیں آشنائے سکوں

گرفتارِ اوہام ہیں یہ ابھی — پرستارِ ابہام ہیں یہ ابھی

ہٹا ان کی نظروں سے افسونِ راز — دکھا زندگی کے نشیب و فراز

یہ ذرے ہیں ان کو نگینہ بنا
تجلی بنا، طورِ سینا بنا

ہوئے جمع رندانِ مدہوش آج — یہ ہے قبلۂ ہر بلا نوش آج

مٹے اس جگہ آ کے سب امتیاز — نہ مذہب، نہ ملت، نہ پست و فراز

یہاں کوئی ہندو مسلماں نہیں — یہاں فتنۂ کفر و ایماں نہیں

تو میکدے کی زمیں پاک ہے — یہ بستی کبھی ہمدوشِ افلاک ہے

ہمیشہ سے ہے میرا رندوں میں نام — پلا ساقیا مجھ کو بھر پور جام

چلا ہے تو یہ دور جاری رہے
یہ دنیا ہماری تمھاری رہے

جولائی، اگست

نیا نجید[۱]

تیسری جنگ نہیں ہو گی

نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا
جلالی کشش، انقلابی تبسم، رخِ چین کا جگمگاتا نظارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

دمکتا ہے لینن کے ماتھے کا سورج، فضا وجد آور سرور آفریں ہے
ترانوں کا انداز گیتوں کا تیور شہیدوں کے خوں کی طرح آتشیں ہے
یہ معذور قانون، لنگڑے بہانے۔ بڑھو باغیو، کوئی کھٹکا نہیں ہے
نہیں ہارتی لال ویروں کی سینا[۲]، نہ خالی گیا وار کوئی ہمارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

رگیں رہزنوں کے بدن میں ہیں جتنی حساب ان کا اک اک نظر جانتی ہے
ٹرومین کے اور چرچل کے ایجنٹ، دنیا جنھیں خوب پہچانتی ہے
چھپائے ہوئے تیسری جنگ دل میں زباں پر مگر شانتی شانتی ہے
یہ کٹھ پتلیاں اب تھرکنے نہ پائیں، نہ اب چل سکے سامراجی اشارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں۔ وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

بہت پڑ چکی پھوٹ، پتے ہٹاؤ، نہ اکا نہ دُگی، نہ راجا، نہ رانی
چترورتی[۳] کے دن سدھارے مہلتے کہاں کے گرو اور کیا دھرم گیانی

---

[۱] فوج۔ [۳] چار ذاتوں کا نام

گلا پھاڑ کر چیخ لو، بے اثر ہے، فسادوں کا کھڑ راگ، دنگوں کی بانی
کہ شیخ و برہمن کی غسطایئت نے وہ گھونگھٹ ہٹایا وہ برقعہ اُتارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

ہمالہ کے سنگیں بدن سورماؤ! گریلا کسانو! امر کامگارو!
ہگولوں کی طغیانیوں کے نقیبو! جری شاعرو! اے نڈر حسن کارو!
لہو اپنے دل کا زمیں پر چھڑک دو سمے کی یہی مانگ ہے جاں نثارو
زمیں سے شفق رنگ طوفاں اٹھاؤ، یہ طوفان انسانیت کا سہارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

تراشی گئی زندگی پتھروں سے، اجنتا جگایا گیا پربتوں میں
بنایا گیا چاند کے نور سے تاج کن مشکلوں اور کن آفتوں میں
یہ انمول کاریگری سحر کاری چھپے جن کے سب راز ہیں محنتوں میں
یہ نایاب و نادر ہنر کے عجائب نہیں ہم کو ان کی تباہی گوارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

اناڑی کسان اور مزدور جاہل، یہ استاد ہیں عالموں، ماہروں کے
گیا وہ زمانہ گیا جب دماغ آسمانوں پہ تھے غاصبوں جابروں کے
نہ پوچھو دقیانوس کی آج ہلچل، سفینے ڈوبنے لگے تاجروں کے
چل اے زلفِ بنگال چل بن کے آندھی نہیں ہے ترا الجھنوں میں گذارا

نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں۔ وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

یہ افلاس کا زہر نفرت کی جوالا عوام اپنے دل میں کہاں تک چھپائیں
لٹیرے سنہرے ملمعوں سے کب تک بتاؤ سیہ کاریاں جگمگائیں
دبیں چھتر چھپایا ہیں وہ موج کرتے مگر ہم یہاں بھوک سے تلملائیں
تو پھر ان سے کہہ دو پلٹتی ہے کایا نشہ ٹوٹتا ہے اترتا ہے پارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں۔ وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

کھری شانتی اور سچ مچ کا سکھ ہے، جو پہچان لو کامگاروں کی راہیں
یہ ساہتکوں چترکاروں کے سندر وچاروں سے جگ مگ بہاروں کی راہیں
پکاسو نرودا، کرشن اور ایسے ہزاروں درخشاں ستاروں کی راہیں
لہو کے سمندر میں گر ڈوبنا ہے تو جنتا کی راہوں سے کر لو کنارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

ادھر زندگی کی سہانی مدھرتا سویرے کا چھیڑا ہوا راگ جیسے
اُدھر جنگ کی خون آلود نیت چتاؤں میں بھڑکی ہوئی آگ جیسے
ادھر امن، سنتوش، پاکیزگی جیسے ہو کے نتھرے دودھ کی جھاگ جیسے
اُدھر تو خزاں کے پیچھے اُدھر تو بہاروں کے پینگا بھرنے پکارا
نئے راستے ہیں نئی منزلیں ہیں، وہ دھرتی نے دیکھو نیا روپ دھارا

[illegible]

[illegible]

ابن انشا

غزل

خوب ہمارا ساتھ نبھایا، بیچ بھنور کے چھوڑا ہات
ہم کو ڈبو کر خود ساحل پر جا پہنچے ہو ـــــ اچھی بات

شام سے لے کر پو پھٹنے تک، کتنی رتیں بدلتی ہیں
آس کی کلیاں ـــ یاس کی پت جھڑ، صبح کے اشکوں کی برسات

اپنا کام تو سمجھانا ہے، اے دل رشتے جوڑ کہ توڑ
ہجر کی راتیں لاکھوں کروڑں ـــ وصل کے لمحے پانچ کہ سات

ہم سے ہمارا عشق نہ چھینو ـــ حسن کی ہم کو بھیک نہ دو
تم لوگوں کے دور ٹھکانے، ہم لوگوں کی کیا اوقات

روگ تمہارا اور ہے انشا بیدوں سے کیوں چھل کرو
درد کے سودے کرنے والے، درد سے پا سکتے ہیں نجات

جاں نثار اختر

غزل

آج مینا سرخ ہے، مے سرخ ہے پیمانہ سُرخ
ہو گیا ہے ساقیا میخانے کا میخانہ سُرخ

سینۂ خاکِ چمن سے پھوٹ نکلی وہ شفق
پھول کیسے ہو گیا خود سبزۂ بیگانہ سُرخ

جل رہا ہے آج کی محفل میں وہ گلگوں چراغ
ہو گیا ہے جس کی ضو سے ہر پرِ پروانہ سُرخ

لالۂ و گل کی حکایت محو ہو جانے کو ہے
آج ذرّوں کی نظر کہتی ہے اک افسانہ سُرخ

کیا ادھر بھی خونچکاں گذرا ہے کوئی قافلہ
ہو گیا ہے آج کیسا ہر قدم ویرانہ سُرخ

یوں زمیں سے خون کے شعلے اٹھیں گے کب تلک
ہاں اٹھا پرچم اٹھا اے ہمّتِ مردانہ سُرخ

پھر لہو کی آنچ سے لوہا پگھل جانے کو ہے
ہو چکی ہے دیکھ زنجیرِ دلِ دیوانہ سُرخ

بتکدے میں ہند کے اب تو جلا گلگوں کنول
برہمن لے چین کا بھی ہو گیا بتخانہ سُرخ

سرخیٔ خونِ شہیداں ہے کہ عنوانِ بہار
چشمِ گیتی میں جھلکتا ہے کوئی افسانہ سُرخ

باغ میں اب مستقل ہو گا بہاروں کا قیام
خاکِ گل تعمیر کر دے جلد اک کاشانہ سُرخ

اب کہیں جا کر ملا ہے سُرخ منزل کا نشاں
یوں تو اختر تھا سدا سے مسلکِ رندانہ سُرخ

تحریک
۱۵ / اکتوبر

یہ لالہ و گل، یہ صحن و روش، ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں، سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

اس جہد و طلب کی دنیا میں، کیا کارِ نمایاں ہوتے ہیں
ہم صرف شکایت کرتے ہیں، وہ صرف پشیماں ہوتے ہیں

رندوں نے جو چھیڑا زاہد کو، ساقی نے کہا کس طنز سے آج
اوروں کی وہ عظمت کیا جانیں، کم ظرف جو انساں ہوتے ہیں

تو خوش ہے کہ تجھ کو حاصل ہیں، میں خوش کہ مرے حصے میں نہیں
وہ کام جو آساں ہوتے ہیں، وہ جلوے جو ارزاں ہوتے ہیں

یہ خون ہے جو مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

یہ عشق کی وسعت کیا جانیں، محدود ہے جن کی فکر و نظر
وہ درد کی عظمت کیا سمجھیں، بے درد جو انساں ہوتے ہیں

آسودۂ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں، خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

جو حق کی خاطر جیتے ہیں، مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگرؔ
جب وقت شہادت آتا ہے، دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

نقوش
خاص نمبر

جگن ناتھ آزاد

غزل

غمِ دوراں غمِ جاناں کا بدل ہے کہ نہیں — اس میں بھی تابِ تب سوزِ ازل ہے کہ نہیں

محفلِ شعر میں کل تک جو رہی ہے ممنوع — آج اُس تلخ کلامی کا محل ہے کہ نہیں

جو حدودِ غمِ جاناں سے پرے جا نہ سکے — آج اس ذہن میں لے دے کے خلل ہے کہ نہیں

ہم نے گرچہ ترے درد کو بے مثل کہا — عشق میرا ابھی زمانے میں مثل ہے کہ نہیں

علم افکار زمانے میں بڑا علم سہی — علم ہر دور میں محتاجِ عمل ہے کہ نہیں

جس نے اس دور میں مجبور کا خوں گرمایا — وہ ہنر مسئلۂ دہر کا حل ہے کہ نہیں

اُڑ سکے عرش پہ جو، خاک پہ جو چل نہ سکے — آج اُس فکر میں تقصیر و کسل ہے کہ نہیں

موت اور اس کے عواقب سے ڈرانے والے — موت کی طرح غمِ زیست اٹل ہے کہ نہیں

جس کو تو زہر سمجھتا ہے ادب کے حق میں — وہ مرے شعر میں تریاک و عسل ہے کہ نہیں

اے غزل کو غمِ محبوب سمجھنے والے
یہ جواب میں نے سنائی ہے غزل ہے کہ نہیں

جمیل ملک

غزل

اب تذکرۂ گل چھوڑ بھی دے، اب ذکر نہ کر پیمانوں کا
سنگین حقائق کہتے ہیں یہ دور نہیں افسانوں کا

عشرت خانوں کے سائے میں دُنیا کو بھلا کر بیٹھے ہو
اے عیش و طرب کے متوالو احساس بھی ہے غمخانوں کا

یہ دیر و حرم کی قید بھی کیا ان زندانوں سے باہر آ
میداں ہی ٹھکانا ہے پیارے آزاد منش انسانوں کا

ان پر بھی بہاریں آئیں گی، یہ دورِ خزاں تو جلنے دو
اک روز ستارہ چمکے گا دھندلائے ہوئے ویرانوں کا

دیکھو کہ وہ سارے محنت کش برسوں کی نیند سے جاگ اُٹھے
سمجھو کہ زمانہ بیت گیا سنسار تھا جب دھنوانوں کا

وہ دن بھی کبھی آجائے گا جس دن کے تصور میں ساقی
ہر دل میں مچلتا رہتا ہے طوفان نئے ارمانوں کا

جو پی کے بہک جاتے ہیں جمیل اب ان کی کوئی سنتا ہی نہیں
انداز بدلتا جاتا ہے، میخواروں کا، میخانوں کا

شاہراہ
سالنامہ

جوش ملیح آبادی

رباعیات

ہر شے پہ تصرفِ ملل ہے اے دل
گذری ہوئی صدیوں کا عمل ہے اے دل
ان راہ کے روڑوں کو حقارت سے نہ دیکھ
ہر سنگ میں اک تاج محل ہے اے دل

کرتی ہے گہر کو اشک باری پیدا
تمکین کو، روحِ بے قراری پیدا
سو بار چمن میں جب تڑپتی ہے نسیم
ہوتی ہے کلی پر ایک دھاری پیدا

قطرات میں طوفان نہاں ملتے ہیں
خاشاک میں گلہائے جناں ملتے ہیں
ذرات بسرِ راہ گذر پر اے جوش
خورشید کے بوسوں کے نشاں ملتے ہیں

سویرا
۸، ۷

حبیب تنویر

غزل

وہ پھر اک قلزمِ خوں ہنزلوں کے درمیاں نکلا
مگر زخمی دلوں کا عزمِ آزادی جواں نکلا
محبت کب پنپ سکتی تھی زہریلی فضاؤں میں
بغاوت کا علم ہی دردِ دل کا ترجماں نکلا
وطن کی خاک نے قطرہ سمجھ کر پی لیا لیکن
جب آنسو خاک سے ابھرا تو بحرِ بیکراں نکلا
اکیلا جان کر جب میری جانب بجلیاں لپکیں
تو ہر شاخِ چمن پر آج میرا آشیاں نکلا
مرے گلچیں نے غداری کی تہمت جس کے سر تھوپی
وہ جھونکا ہر چمن پر برگِ گل کا پاسباں نکلا
یہ کیسی گفتگو پھر ایک عالمگیر سازش کی
یہ کیسا سانحہ! پھر خاک کے دل سے دھواں نکلا
وہ دیکھو ہر افق سے امن کے پھر قافلے نکلے
سروں پر جن کے خونیں پرچموں کا سائباں نکلا
زمیں پھر تل رہی ہے حق و باطل کی ترازو میں
اُدھر اک ذرہ کا تودا، اس طرف سارا جہاں نکلا

حسرت پھر عوامی جمہور کے میداں میں ہجوم اٹھی
دہکتی آگ کے شعلوں میں دیکھو گلستاں نکلا

ہر اک دہقاں پکار اٹھا ہمالے کی بلندی سے
تلنگانہ ہماری کھیتیوں کا پاسباں نکلا

مٹانا کیسا؟ اے اندھے لیڈرو! دیکھتے جاؤ
کہ ہر نقشِ قدم کی خاک سے اک کارواں نکلا

اب ایسے کارواں کو کون لوٹے کب تلک لوٹے
کہ جس کا ہر مسافر کارواں در کارواں نکلا

اہنسا سامراجی زہر کو کیسے نہ ہوں ساتھی
کہ مارِ آستیں ہر کانگریسی حکمراں نکلا

دلاسے کو جوا بنے اک بزرگ اک سوشلسٹ آئے
ارے وہ رہنما بھی رہزنوں کا ہمزباں نکلا

سلاسل کی صدا بانگِ جرس کی طرح گونج اٹھی
قفس سے شور اک اٹھا کہ جیسے کارواں نکلا

بڑھو اے ساتھیو، ہاتھوں میں جلادوں کے رعشہ ہے
شہیدوں کا لہو سولی پہ چڑھ کر جاوداں نکلا

غزل سنتے ہی ہر مزدور ہر دہقاں پکار اٹھا
خوشا اے ساتھیو! تنویر اپنا ہمزباں نکلا

مخلص ... [illegible]
۱۵/اپریل

ظہیر کاشمیری

غزل

اب صاحبِ دوراں آتے ہیں اب فاتحِ میداں آتے ہیں
وہ شیر تو شیرِ قالیں تھے، اب شیرِ نیستاں آتے ہیں

جو تُند بگولوں سے اُلجھے، وہ عزمِ سفر کی بات کرے
اس منزلِ نو کے رستے میں کتنے ہی بیاباں آتے ہیں

آہنگ تفنگ و تیر میں ہم، گاتے ہیں سرودِ آزادی
ہنگامۂ دار و گیر میں ہم سرمست و غزلخواں آتے ہیں

تسلیم کہ ساحل والوں نے اک سیلِ خراماں روک دیا
ساحل کا نشاں تک مٹ جائے کچھ ایسے بھی طوفاں آتے ہیں

ہم ایسے امن پسندوں کو الحاد کا طعنہ دیتے ہیں
اس بزم میں خنجر در دامن جتنے بھی مسلماں آتے ہیں

پھولوں پہ مسرّت ناچے گی، کلیوں پہ اُجالا برسے گا
ہم لوگ برنگِ نورِ سحر، اے صبحِ گلستاں آتے ہیں

قاتل بھی ظہیر اب دامن کے دھبوں کو چھپاتا پھرتا ہے
اس وجہ سے مل کے چہروں پہ ہم خونِ شہیداں آتے ہیں

غلام ربانی تاباں

غزل

انسان کے خوابوں کی تاباںؔ تعبیر اُبھرتی آتی ہے
اک عالمِ تازہ کی جیسے تصویر اُبھرتی آتی ہے

اے کاش اسے پڑھ سکتے وہ ہیں بند ابھی جن کی آنکھیں
دیوارِ زمانہ پر جو کچھ تحریر اُبھرتی آتی ہے

جس جا پہ شہیدوں کے خوں کی اک بوند گری تھی کل ساقی
دیکھا بھی ہے تو نے آج وہاں شمشیر اُبھرتی آتی ہے

ظلمات کا افسوں ٹوٹ چکا مدفوق ستارے ڈوب چلے
پورب کے افق کے دامن پر تنویر اُبھرتی آتی ہے

تقدیر کی خواب آلودہ اور تاریک فضاؤں سے جیسے
خورشیدِ درخشاں کی صورت تدبیر اُبھرتی آتی ہے

زنجیر ہمیں پہناتے تھے جو کل تک اُن کے ذہنوں میں
یہ کیسا تغیر ہے تاباںؔ زنجیر اُبھرتی آتی ہے

تحریک
یکم مئی

مجروح سلطانپوری

غزل

ستم کو سرنگوں، ظالم کو رسوا ہم بھی دیکھیں گے
چل اے عزمِ بغاوت چل تماشا ہم بھی دیکھیں گے

غلامی میں تو بس انجام ہی دیکھا محبت کا
کہاں ہے وہ بہ آغازِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے

پلا کر خونِ دل دھرتی پہ لے شوقِ چمن بندی
کفِ ہر غنچہ میں تقدیرِ صحرا ہم بھی دیکھیں گے

نگاہِ چیں کا گھائل تو توڑتا ہے دم سرِ مقتل
بچا لے آ کے اعجازِ مسیحا ہم بھی دیکھیں گے

فضائے ایشیا پر یہ گھٹا ہے جنگ کی ساقی!
بہار آئی تو سوئے جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

ابھی تو فکر کر اِن دل سے نازک آبگینوں کی
بہ فیضِ امن پھر ساغر میں دریا ہم بھی دیکھیں گے

ہمیں یوں امن کی حاجت ہے اس طوفانِ ظلمت سے
کہ شمعِ رنگ سے روشن یہ دنیا ہم بھی دیکھیں گے

ضرورت امن کی ہے پنجۂ سنگین و خنجر سے
کہ ہر تن پر قبائے شعر و نغمہ ہم بھی دیکھیں گے

ضرورت امن کی ہے ہم کو استبدادِ ایٹم سے
کہ نقشِ مانی و تصویرِ فردا ہم بھی دیکھیں گے

برائے اطلس و دیبا اماں بارود و آتش سے
کہ ہر بوٹے کو محنت کا سراپا ہم بھی دیکھیں گے

برائے فصلِ گندم امن پامالی کی فوجوں سے
کہ ہر خوشے کو ہمدوشِ ثریا ہم بھی دیکھیں گے

برائے نسلِ آدم چاہیئے امن و اماں ہم کو
کہ رشکِ خلد ہر آغوشِ تنہا ہم بھی دیکھیں گے

اب اپنا رخ بدل دیں کہہ دے ان جنگی بلاؤں سے
نہیں تو پھر برا ہو یا کہ اچھا ہم بھی دیکھیں گے

جبیں پر تاجِ زر، پہلو میں زنداں، بینک چھاتی پہ
اٹھے گا بے کفن کب یہ جنازہ ہم بھی دیکھیں گے

مسلط زندگی پر کب سے ہے زنداں کی تاریکی
نکل اے مہرِ آزادی اُجالا ہم بھی دیکھیں گے

محمد صفدر

غزل

اوس کی تمنائیں جیسے باغ جلتا ہے
تو نہ ہو تو سینے کا داغ داغ جلتا ہے

چاند چل دیا چپ چاپ سو گئے ستارے بھی
رات کی سیاہی میں دل کا داغ جلتا ہے

موت اک کہانی ہے زیست جاودانی ہے
اک چراغ بجھتا ہے اک چراغ جلتا ہے

قتل گاہ سے لے کر قاتلوں کے دامن تک
خونِ ناحقِ مزدور کا سراغ جلتا ہے

ساتھیوں سے دوری ہے اک جہاں سے دوری ہے
مے میں دم نہیں ساقی اور ایاغ جلتا ہے

سحر
جولائی اگست

معین احسن جذبی

غزل

ابھی زمین حسیں ہے، نہ آسماں حسیں
ابھی بنی ہی کہاں ہے مری بہشتِ بریں

ابھی ہے ذوقِ جنوں اپنا مصلحت آگیں
ادھر بھی ایک نظر اے نگارِ خطۂ چیں

یہ سوچتا ہوں کہ بدلا بھی ہے نظامِ الم
یہ دیکھتا ہوں کہ موجِ نشاط بھی ہے کہیں

یہ اہتمام، یہ تیاریاں تباہی کی
عرق عرق ہوئی جاتی ہے زرفشاں سی جبیں

تمھیں ستم کا ازل ہی سے حق سہی لیکن
یونہی رہے گا کوئی تابکے ملول و حزیں

حقیر جس کو سمجھتے ہیں تیرے تیرو سناں
اُسی لہو سے مگر سرخ ہو رہی ہے زمیں

ہے اس کا صید زمانہ کا ایک اک صیاد
فقط فضاؤں میں اڑتا نہیں مرا شاہیں

چمن پہ گذری سو گذری، مگر یہ کیا کم ہے
کہ فاش ہو گئے جھوٹی بہار کے آئیں

چمن پرستوں کو مژدہ چمن کی لوٹ کے ساتھ
اُلجھتا جاتا ہے کانٹوں میں دامنِ گلچیں

شدید تر ہو جو احساسِ دردِ محرومی
تو یہ وہ تیر ہے کہ جس کے لئے خطا ہی نہیں

"شکست و فتح نصیبوں سے" اب نہیں جذبی
کہ آج ہے دلِ ہر ناتواں میں عزم و یقیں

افسانے خاکے

ابراهیم جلیس
پرکاش پنڈت
خواجہ احمد عباس
راجندر سنگھ بیدی
ریاض روفی
سنتوکھ سنگھ دھیر
شوکت صدیقی
عصمت چغتائی
کرشن چندر
کنھیا لال کپور
مہندر ناتھ

ابراھیم جلیس

ڈرائنگ روم گوسپ

لپ سٹک، ٹوتھ پیسٹ، انگوٹھی، جوتے وغیرہ

مجھے اشتہارات پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ جب کوئی تازہ اخبار یا رسالہ خریدتا ہوں تو پہلے اس کے اشتہارات پڑھتا ہوں اور بعد میں خبریں اور مضامین ـــــ آپ یہ سُن کر فوراً دریائے حیرت میں ڈوب جائیں گے مگر جب آپ کا دریائے حیرت پایاب ہوجائے گا تو آپ بھیگے بھیگے متعجب لہجے میں مجھ سے پوچھیں گے کہ بھئی عجیب اُلٹے آدمی ہو۔ ایسا اُلٹا کیوں چلتے ہو ـــــ؟ تو اس کا سیدھا جواب میرے پاس یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں تجارتی اشتہارات کو جتنی اہمیت حاصل ہے اتنی نہ جارج برنرڈشا کے ڈراموں کو حاصل ہے اور نہ نیویارک ٹائمز کی خبروں کو ـــــ دُنیا کی تین چوتھائی سے زیادہ آبادی جی۔ بی۔ شا کے ڈراموں سے زیادہ ہنری فورڈ کی موٹر کاروں سے واقف ہے۔ کیونکہ سرمایہ دارانہ سماج میں کتاب موٹر کار کے مقابلے میں بڑی ہیچ اور حقیر تصوّر کی جاتی ہے ـــــ آپ کسی بازار میں چلے جایئے ہاورڈ فاسٹ کا ناول آپ کو دس بارہ روپے میں ملے گا۔ اور فورڈ کی موٹر کار دس بارہ ہزار روپے میں ـــــ حالانکہ کتاب انسان کو بناتی ہے اور موٹر کار انسان کو روندتی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ بورژوا سماج میں سیم و زر نے، آرٹ اور مشین نے انسانیت کو بُری طرح کچل کر رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں ڈالرز یادہ پیدا ہوتے ہیں اور انسان زیادہ مرتے ہیں۔ زمین کی سطح پر جتنے زیادہ بینک اُبھرتے جارہے ہیں اتنی ہی زیادہ قبریں زمین میں دھنستی جارہی ہیں۔

اس تمہید کی روشنی میں یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں زندگی ـــــ زندگی برائے تجارت ہے۔ انسان ایک تاجر کی طرح چند برسوں کے لئے اس دنیا میں آتا ہے۔ اس ہاتھ دیتا ہے، اس ہاتھ لیتا ہے اور پھر لٹ لٹا کر اس دُنیا سے چلا جاتا ہے۔ گویا دنیا انسان کا گھر نہیں ہے، انسان کا بازار ہے مگر بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ اس بازار میں تجارت بھی تو اتنی نہیں ہوتی جتنی اشتہار بازی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بورژوا زندگی اشتہار کا دوسرا نام ہے جس طرح اس سماج میں انسانیت چاندی کے سکوں تلے دبی ہوئی ہے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ تجارت بھی اشتہار کی اوٹ میں چھپی ہوئی ہے۔ اگر ہم کسی سکول بوائے کی طرح یہاں خلاصہ لکھنے بیٹھ جائیں تو یوں لکھیں گے۔

"پس ثابت ہوا کہ سرمایہ دارانہ سماج تجارت ہے اور تجارت محض اشتہار ہے۔"

اس خلاصے کی تفصیل یہ ہوگی کہ سرمایہ دارانہ تجارت کا وجود محض اشتہار کے وجود سے قائم ہے۔ اگر سرمایہ دارانہ تجارت کے جسم سے اشتہارات نوچ لئے جائیں تو پھر وہ بالکل ننگی ـــــ ننگی بھی ایسی ننگی جیسے "ایسوپس فیبلز" کا وہ کوا جو اپنے پروں میں ہنس کے پر لگا کر راج ہنس بن گیا تھا اور جب اس کے پر نوچ لئے گئے تو وہ کوا ـــ بالکل کوا ہو کے رہ گیا۔ اس تلمیح کے ضمن میں اگر بورژوا سماج کو وہ "کوا" کہوں جو تجارتی اشتہارات کے پر لگا کر راج ہنس بنا ہوا ہے تو اس میں بُرا ماننے کی کونسی بات ہے؟

بلکہ آپ تو تعریف آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے فرمائیے کہ واہ بھئی واہ ــــ تم تو بڑے ذہین ہو، بڑی کمال کی تشبیہیں دیتے ہو۔

اس ذرہ نوازی پر آپ کو مجبور کرتے ہوئے میں یہ عرض کروں گا کہ آپ میری ذہانت کے مداح ہوں یا نہ ہوں میں تو کم از کم سرمایہ دارانہ تجارت کی اشتہار بازی کے کمال کا بڑا معترف اور بڑا مداح ہوں ــــ سرمایہ دارانہ سماج اندر سے جتنا کھوکھلا نظر آتا ہے اس کی روح یعنی تجارت کا بھی یہی حال ہے۔ یہ بھی اندر سے بالکل کھوکھ ہے مگر اوپر سے رنگ برنگے اشتہارات میں لپٹی ہوئی نظروں کو فریب دے رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر آپ بالکل یہی محسوس کریں گے جیسے سینٹ میری گرلز ہائی سکول کے فینسی ڈریس مینا بازار میں آپ نے آٹھ آنے کا ایک رنگین بنڈل خریدا، اس کی خوبصورت پیکنگ کا ایک ایک رنگین کاغذ الگ کیا اور اندر سے پیتل کا صرف ایک بٹن آپ کے ہاتھ لگا ــــ یہاں برسبیل تذکرہ میں اس عبرت انگیز حقیقت کی طرف اشارہ کر ہی دوں کہ اے صاحبو! یہ سرمایہ داری کی دُنیا بھی گویا فینسی ڈریس مینا بازار ہے جہاں زندگی ایک خوبصورت پیکنگ کیا ہوا بنڈل ہے جس کے اندر کچھ نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

ماڈرن تجارت کے اشتہارات کو پڑھ پڑھ کر ہم بہ آسانی دھوکہ کھاتے ہیں کہ انسان نے سرمایہ داری کے دَور میں کتنی حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ وی ٹیکس آپ کو گنجا ہونے سے بچاتا ہے۔ ہارلکس آپ کو سدا بہار جوانی عطا کرتا ہے۔ وکس کی گولیاں آپ کی کھانسی کو جڑ پیڑ سے اُکھیڑ پھینکتی ہیں۔ یارڈلیز کے کریم آپ کے چہرے پر جھریوں اور بڑھاپے کو آنے نہیں دیتے۔ پنسلین کے انجکشن آپ کو کبھی مرنے نہیں دیتے۔

مگر ان اشتہارات کے پیچھے جھانک کر آپ انسانیت کو دیکھئے تو وہ گنجی، لنگڑی لولی، کھانستی، رینگتی، سسکتی دم توڑتی ہے ــــ اور اشتہار کے اس طرف حیوانیت انسانیت کا مصنوعی زرق برق لباس پہنے سرمایہ داروں کے اس فینسی ڈریس مینا بازار میں

زندگی کا رنگین بنڈل ہاتھ میں لئے گھڑی ہے جو اندر سے بالکل خالی ہے ۔

. . . . چلئے میں آپ کی یہ بات تسلیم کر لیتا ہوں کہ اشتہار بازی تجارت کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے مگر آپ کو جواباً میری یہ بات بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ موجودہ تجارت کی طرح موجودہ اشتہار بازی بھی آپ کو صرف اکسپلائٹ کرتی ہے اور بجز اکسپلائیٹیشن اس کا کوئی مقصد نہیں ہے ۔ مثلاً ابھی ابھی میں نے ـــــ آن لکر میگزین ـــــ میں کالگیٹ ڈینٹل کریم کا ایک اشتہار پڑھا تھا جو یہ تھا ۔

بے چاری مارگریٹ ٹاک ووڈ !

لوگ اس کے دانتوں کی بدبو کے باعث اس سے دور بھاگتے تھے مگر اس نے ایک ڈاکٹر کے مشورے سے کالگیٹ ربن ڈینٹل کریم استعمال کرنا شروع کر دیا جس کے باعث آج اس کے اطراف اس کے دوستوں کا جھمگھٹا لگا رہتا ہے ۔"

لیجئے ـــــ بورژوا سماج میں ڈینٹل کریم دانت صاف کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے گرد دوستوں کے جھمگھٹے جمع کرنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے ۔ پونڈز کریم اور ایوننگ ان پیرس سینٹ چہرے کی چمک اور کپڑوں کی خوشبو کے لئے نہیں بلکہ لڑکیوں کو پھانسنے کے کام آتی ہیں ـــــ "آئی سلما کریم" لڑکیوں کو ایک چمکیلا چہرہ نہیں بلکہ ایک Kiss Attracting Face عطا کرتی ہے ۔ پیرس ٹراسپیرنٹ گیسرین سوپ اور کچی کیورا کے صابن آپ کا منہ نہیں دھلاتے ہیں بلکہ آپ کو ایستھر ولیمز یا ثریا بننے میں مدد دیتے ہیں ۔ اوکاسا کی مقوی گولیاں آپ کو جنسی تعلقات کی فطری نوعیت بتانے کے بجائے جی بھر کر عیاشی کرنے کی دعوت دیتی ہیں کیونکہ اوکاسا کمپنی کا دعویٰ ہے کہ آپ ساٹھ برس میں بھی چار شادیاں کر سکتے ہیں ـــــ کوٹیکس کے سینیٹری نیپکن استعمال کیجئے ورنہ ڈانس فلور پہ آپ کا ڈانس پارٹنر آپ کو اکیلا چھوڑ دے گا ۔ میکس فیکٹر لپ سٹک لیبارٹریز کا اشتہار ہے کہ ہمارا لپ سٹک لگائیے ، پھر اپنے محبوب کو ایک ہزار بوسے

دیکھیئے۔ مگر ہونٹوں پر ذرا سا نشان، کوئی Tell-Tale یا ایک بھی نشانۂ راز منظر نہ آئے گا۔ گویا لپ سٹک ہونٹوں کو رنگین اور خوبصورت بنانے کے لئے نہیں بلکہ چور محبت کے ہزاروں بوسوں کو چھپانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کیوٹکس کا نیل پالش استعمال کیجیئے ورنہ کوئی مرد آپ کی انگلیوں میں شادی کی انگوٹھی نہیں پہنائے گا۔ مسٹر جو بو نو ہو پر دیپرائیٹر، بونو مو ہوم کورس آن بسٹ کلچر براڈ وے نیو یارک امریکی لڑکیوں کو متنبہ کرتا ہے۔

BEAUTIFY YOUR BUST

Because all the gay boys of Broadway club are after those girls who have appe--aling, plumpy, developed, thrillingly cur--ved, alluring and high pointed busts.

یعنی اپنا سینہ اپنے جسمانی حسن کے لئے نہیں بلکہ براڈ وے کلب کے چند شوقین نوجوانوں کے لئے خوبصورت بنائیے۔

ان اشتہارات کا بغور مطالعہ کیجیئے تو آپ اپنی ذہنی استطاعت کے مطابق جلد یا بدیر اس نتیجے پر ضرور پہنچیں گے کہ دور سرمایہ داری کی تجارت نے انسان کو زندگی کے فطری تقاضوں کے بجائے مصنوعی مقاصد کی راہ پر ڈال دیا ہے جس کا یہ اثر ہوا ہے کہ زندگی بھی مصنوعی ہو کر رہ گئی ہے۔ انسان گویا فطرت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ راک فیلروں، ٹریڈ کمپنیوں، فیکٹریوں اور بینکوں کے لئے زندگی بسر کر رہا ہے۔ جیسے وہ دنیا میں رہنے بسنے کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ ڈالر جمع کرنے کیلئے ٹہلتا ٹہلتا دنیا کی سطح پر کچھ دیر کے لئے آ گیا ہے۔ جیسے زندگی میں اور کوئی جد وجہد نہیں، اور کوئی اسٹرگل نہیں سوائے اس کے کہ اپنے گرد دوستیں اور چاہنے والوں کا جمگھٹا جمع کیا جائے یا

جیسے زندگی، سٹوڈی بیکر خریدنے کے بعد شروع ہوتی ہے اور اپنی محبوبہ کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی پہنا دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے یا پھر وہی آدمی ـــــ انسان ہے جس کی تجوری سکوں سے بھری ہے، جس کی جیب میں چیک بک ہے، جس کے گراج میں رولز رائس کھڑی ہے، جس کے وارڈ روب میں جیک دیسرمن اینڈ کو کے لباس بھرے ہیں جس کے سگرٹ کیس میں بلیک اینڈ وائٹ کے سگرٹ ہیں۔ جس کی بوتلوں میں شمپئن اور درماؤتھ بھری ہوئی ہے، جس کے ڈریسنگ ٹیبل پر ویسٹ مور کمپنی کا میک اپ کا سارا سامان رکھا ہوا ہے، جس کے بیڈ روم میں روز ایک نئی نویلی لڑکی ایک رات کے لئے انگوٹھی پہنتی ہے جس کے سرونٹ کوارٹر میں نیگرو اور ہندوستانی غلام ہیں۔

سرمایہ داروں کے اس بازار میں پہنچ کر انسان زندگی کی اصلی منزل سے بالکل ہی بھٹک جاتا ہے کیونکہ سرمایہ داروں نے انسان اور اس کی اصلی منزل کے درمیان بہت سی مصنوعی منزلیں کھڑی کر دی ہیں جس سے وہ سمجھتا ہے کہ میں گھر سے نکل کر سیکرٹیریٹ پہنچ گیا تو منزل تک پہنچ گیا۔ اسے امپیریل بنک تک جانا ہے۔ امپیریل بنک منزل ہے۔ اس نے صاحب کے جوتے پالش کر دیئے۔ زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔ بیچ بازار میں پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو ایک دھوکا دیا اور زندگی ختم ہو گئی۔

دھوکا ـــــ سرمایہ دارانہ تجارت محض دھوکا ہے اور اس کا اشتہار، اشتہار نہیں دھوکے کی ٹٹی ہے ـــــ انسان کو بیوقوف بنانا بورژوا سماج کا واحد نصب العین ہے

اب اس اجمالی کی تفصیل میں ایک واقعہ سُنئے۔ ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ نئی دہلی کے رائے سینہ پارک میں ایک امریکن لیڈی نے ایک ہوٹل قائم کیا جس کا نام "رین بو" ہوٹل تھا۔ وہ ہوٹل کچھ چلتا نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دہلی نئی دہلی بن جانے کے باوجود آخر ہندوستان ہی کی بستی تھی جو رین بو سے باتیں کرنے والے سکائی سکریپرس میں نہیں رہتے بلکہ زمین پر رہتے بستے ہیں۔ ان کی رین بو تک کہاں پہنچ ـــــ؟ ایک دن وہ

امریکن لیڈی مکھیاں مارتے مارتے تنگ آگئی اور ایک برٹش ایڈورٹائزمنٹ فرم میں گئی اور اپنے ہوٹل کی ویرانی کے بارے میں صلاح ومشورہ کیا۔ اس ایڈورٹائزمنٹ فرم نے وعدہ کیا کہ وہ ایک ہی دن میں اس ہوٹل کو نئی دہلی تو کیا ساری دنیا میں مشہور کردے گی امریکن لیڈی نے اس سے کانٹریکٹ کرلیا۔ دوسرے دن برٹش ایڈورٹائزمنٹ فرم نے اس ہوٹل کے پُرانے سائن بورڈ کی جگہ نیا سائن بورڈ لگایا —— "آٹھ دروازہ ہوٹل" حالانکہ اس ہوٹل کے صرف تین دروازے تھے —— اب جو آدمی اُدھر سے گذرتا بڑے حیرتناک لہجے میں اپنے ساتھی سے کہتا۔

"ارے دیکھو تو —— کس پاگل نے یہ ہوٹل قائم کیا ہے۔ نام رکھا ہے "آٹھ دروازہ ہوٹل" اور دروازے ہیں صرف تین ۔ آؤ۔ اندر چل کر ذرا اس پاگل کو تو دیکھیں!"

مگر اندر جا کر جب وہ اس امریکن لیڈی کے تابناک حسن اور میٹھی مسکراہٹ کو دیکھتے تو خود پاگل ہوجاتے۔ پھر باہر آکر ہر ایک کو پاگل ہونے کا مشورہ دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ دن کے اندر اندر وہ ہوٹل نئی دہلی تو کیا سارے شمالی ہندوستان میں مشہور ہوگیا۔ دہلی اور علی گڈھ یونیورسٹی کے سینکڑوں طالب علم پاگل ہوآئے تھے جن میں آپ کے اس خاکسار کو بھی پاگل پن کا یہ شرف حاصل ہوچکا ہے ہم چند سٹوڈنٹ ہر جمعہ کی چھٹی میں کافی روپیہ بے کر آٹھ دروازے والی لیڈی کے سامنے اپنی امارت کا خوب خوب مظاہرہ کرتے مگر یہ دوسری بات ہے کہ اس ہوٹل کا کوئی نواں دروازہ نہیں تھا۔

اب ایک اور مزیدار واقعہ بھی لگے کانوں سُن لیجئے۔ مجھے ایک زمانے میں "ریڈرز ڈائجسٹ میگزین" پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک بار میں نے اس کے ایک کرسمس نمبر میں امریکہ کے مشہور افسانہ نگار جارج لاٹن کی ایک کہانی پڑھی جو بڑی دلچسپ تھی اور ادھوری تھی۔ افسانہ نگار نے کہانی کو یوں ادھورا چھوڑا تھا:۔

"اگر آپ میری کہانی کی ہیروئن کے بارے میں مزید کچھ جاننا چاہتے ہیں تو فلاں ناول نویس کا فلاں ناول جو فلاں پبلشر نے شائع کیا ہے۔ ضرور پڑھیئے"۔

میں نے بڑی بے تابی سے فوراً فلاں پبلشر کو ایک خط لکھکر فلاں ناول نویس کا فلاں ناول منگوالیا۔ مگر وہ ناول اتنا واہیات تھا کہ میں نے غصے میں آکر ایڈیٹر ریڈرز ڈائجسٹ کی معرفت افسانہ نگار جارج لاٹن کو لکھ دیا کہ تم نے اپنی بہترین ادرادھوری کہانی کے ذریعے جس ناول کو پڑھنے پر مجبور کیا تھا وہ بالکل بکواس ہے۔ تم نے ایسی بد دیانتی کیوں کی۔ بواپسی ڈاک جلد جواب دو۔

میرے اس خط کا جواب شکاگو سے یوں آیا:۔

مائی ڈیر ابراہیم جلیس

تمھارا شکوہ بجا ہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ اس ناول کا پبلشر میرے پاس آیا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے اس ناول کو ساٹھ ہزار کی تعداد میں شائع کیا ہے اور چھ مہینے گذرنے پر بھی ایک کاپی فروخت نہیں ہوئی اگر آپ اس کی اشاعت کی کوئی ترکیب مجھے بتائیں تو میں آپ کو دس ہزار ڈالر معاوضہ دے سکتا ہوں۔ مجھے میری بیوی کی زچگی کے لئے روپوں کی شدید ضرورت تھی اس لئے میں نے ایک اشتہاری کہانی لکھی اور اس کو ادھورا اس لئے چھوڑا کہ میرے قارئینِ کرام بھی اس ناول کو پڑھیں۔ چنانچہ پبلشر نے مجھے بتایا کہ میری کہانی کی بدولت ایک مہینے کے اندر اندر اس پہلے ایڈیشن کی ساٹھ ہزار جلدیں ساری کی ساری فروخت ہوگئیں۔

یہ ادبی بد دیانتی تو ہے لیکن میرے دوست مجھے داد دو کہ میں نے

تشہیر کے اس عجیب و غریب طریقے کو پیش کر کے امریکہ اور انگلستان کی بڑی بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کو بھونچکا کر دیا ہے۔

جواب کا منتظر
تمھارا
جارج لاٹن

خط پڑھ کر میں بھی بھونچکا رہ گیا۔ جب بڑی دیر بعد میرا بھونچکا پن ختم ہوا تو میں نے نہ صرف وہ واہیات ناول، بلکہ جارج لاٹن کی بھی ساری کتابیں بک شیلف سے نکال کر کھڑکی سے باہر سڑک پر پھینک دیں۔ ادبی دیانت یا بد دیانتی کو تو الگ رکھیئے۔ ذرا موجودہ تجارت کی اس دھوکہ بازی کو دیکھئے۔ چیل اُڑتی ہے تو شور مچاتے ہیں کہ بھینس اڑ رہی ہے اور بھینس ڈکرا رہی ہو تو اعلان کرتے ہیں کہ کاربن مرانڈا گا رہی ہے۔

آپ یہاں مجھ سے ایک سوال ضرور پوچھیں گے کہ میں اپنے وطن کو چھوڑ کر انگلستان اور امریکہ کی اشتہار بازی کی دھجیاں کیوں اُڑا رہا ہوں حالانکہ اپنے وطن بلکہ پورے برعظیم میں تو اشتہار بازی بڑی ہی زبوں حال ہے۔ یہ سوال یقیناً پوچھا جانا چاہیئے تھا مگر چلئے بعض اوقات سوالات کے پوچھے جانے کے بغیر ہی جوابات دینے پڑتے ہیں۔ یہ بھی آخر بورژوائی سماج کا ایک اخلاق ہے۔ اس لئے جواب یہ ہے کہ پہلے انگلستان اور امریکہ کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں ہمارے مائی باپ ہیں، ہمارے آقا ہیں، ہم تو ان کے غلام ہیں اور مجھے حق نمک حلالی ادا کرنا تھا اور سچ پوچھئے تو اپنے وطن کی اشتہار بازی کا ذکر علیحدہ کیا ضروری ہے — جبکہ دونوں ملک ہندوستان اور پاکستان خود بھی انگلستان امریکہ کے بازاروں کی دو شاخیں ہیں۔ ای نوز کا کروشن سالٹ انگریز اور امریکن بھی کھاتے ہیں اور ہندوستانی اور پاکستانی بھی کھاتے ہیں تاکہ وقت ضرورت یہ نمک پھوٹ پھوٹ کر نکلے —— ڈبلیو ڈی اینڈ ایچ۔ او۔ وِلس کی سگرٹیں لندن اور نیویارک کے علاوہ دہلی اور کراچی میں بھی پی جاتی ہیں۔ سیون او کلاک بلیڈ سے آرتھر مرے اور جارج السبرگ

بھی شیدکرتے ہیں اور قمرالدین اور رام لال بھی ـــــ چونکہ غلامی کی برکات نے انار کلی اور
چاندنی چوک کے بازاروں کو وال سٹریٹ اور بانڈ سٹریٹ کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ دیا ہے
اس لئے بورژوائی تجارت کی مخصوص اشتہار بازی پاکستان اور ہندوستان پر بھی چھائی ہوئی
ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ دھوکہ دہی، جھوٹ اور مبالغہ آرائی میں ہم اپنے آقاؤں سے ایک
دو ہاتھ ذرا اونچے ہی ہیں۔ اس کا ایک تازہ ثبوت دینے کے لئے میں یہیں تیار ہوں۔
ہوا یہ تھا کہ کچھ دن پہلے لاہور میں ایک ہندوستانی فلم دکھائی جارہی تھی جس کا اشتہار
اخبار میں یوں چھپا تھا۔

مجسٹریٹ نے ملزم کو پھانسی کی سزا سناتے ہوئے پوچھا:۔
"بتاؤ ـــــ تمھاری آخری خواہش کیا ہے؟"
ملزم نے عرض کیا:۔
"حضور! ـــ میں پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے فلم "بازار"
دیکھنا چاہتا ہوں۔"

اس اشتہار کا مجھ پر بڑا اثر ہوا اور میں نے محض اسی اشتہار کے اکسانے پر
فلم "بازار" دیکھی۔ مگر آدھی فلم ہی سے اٹھ کر گھر چلا آیا اور اس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو
ایک مشورے کا خط لکھا۔

جناب من!
میں نے فلم بازار کے بارے میں آپ کا اشتہار پڑھا اور فلم بھی دیکھی
اب فلم دیکھنے کے بعد میں اس اشتہار میں کچھ ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ امید
ہے کہ کل سے وہ اشتہار اخباروں میں آپ یوں شائع کرائیں گے۔
مجسٹریٹ نے ملزم کو پھانسی کی سزا سناتے ہوئے پوچھا۔
"بتاؤ ـــــ تمھاری آخری خواہش کیا ہے؟"

ملزم نے عرض کیا :۔

"حضور! ـــــ پھانسی تو بڑی اذیت ناک سزا ہے اس کے بجائے آپ مجھے فلم "بازار" دکھا دیجئے۔ آپ کا مقصد پورا ہو جائے گا اور میں بھی آرام سے مر جاؤں گا "

ظاہر بات ہے کہ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا البتہ مجھے اپنے ڈھائی روپوں کے اس طرح ٹھگ لئے جانے کا بڑا رنج ہے۔ اگر میں فٹ پاتھ کے ڈاکٹروں کی نصیحت کے مطابق یہ ڈھائی روپے پان کھا کر تھوک دیتا یا سگرٹ پی کر پھونک دیتا تو جناب دل کو ایک تسلی تو رہتی کہ چلو جی روپے ضائع نہیں ہوئے۔

اس قسم کے فریب آمیز مبالغے اور مبالغہ آمیز فریب سے بھری ہوئی اشتہار بازی میں اپنے پاکستان اور ہندوستان کے بھائی لوگوں کا نہ تو انگریز مقابلہ کر سکتے ہیں، اور نہ امریکن ـــــ

اپنے پیارے وطن کے اشتہارات میں مجھے سب سے زیادہ دلچسپ اشتہارات تو صرف دو ہی معلوم ہوئے۔

ایک شادی بیاہ کے اشتہار ـــــ دوسرے تجہیز و تکفین کے اشتہارات۔

روزنامہ "ہرا پاکستان" میں روزانہ اس قسم کے اشتہارات چھپتے ہیں۔

ایک قبول صورت دوشیزہ جس کی عمر اٹھارہ سال ہے، جو میٹرک تک تعلیم پا چکی ہے، امور خانہ داری میں ماہر ہے، کشیدہ کاری، سوئیٹر بننے اور کیرم کھیلنے میں بڑی مشاق ہے، سید زادی ہے، اس کے لئے رشتہ مطلوب ہے ـــ لڑکا خوبصورت اور صحت مند اور جوان نہ ہو تو کوئی حرج نہیں۔ اس کی ماہانہ آمدنی کم از کم تین سو روپے ہونا نہایت ضروری ہے۔

ایک مہاجر لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے۔ یہ لڑکی بے چاری نساداتٓ

میں اغوا، ہوگئی تھی ۔ اب کوئی مسلمان بھائی اس سے بیاہ کر کے اس غریب کی
زندگی کی ڈوبتی نیا کو بچالے ۔ لڑکا شادی شدہ ہو تو بھی کوئی بات نہیں شریعت
کے مُطابق تو چار شادیاں کی جاسکتی ہیں ۔

ان اشتہارات کو پڑھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظامِ زندگی انسانیت کو
پھر سے بابل اور نینوا اور مصر و بغداد کی شاندار تہذیب کی طرف واپس لئے جا رہا ہے جہاں
بازاروں میں نوجوان لڑکیاں منظرِ عام پر فروخت کی جاتی تھیں وہ طریقہ کار ذرا زیادہ بُرا تھا
اس لئے بورژوا سماج نے اسی طریقہ کار کو ایک مہذب شکل عطا کر دی ہے ۔ اب بھی لڑکیاں
بھرے بازار میں فروخت ہوتی ہیں ۔ مگر کتنی عزت و تکریم سے لڑکی کو جہیز سمیت بنا سنوار کر اخبار
کے صفحے کے پیچھے چھپا دیا جاتا ہے ۔ جس کو خریدنا ہوتا ہے وہ چپ چاپ اخبار کے صفحے کے
پیچھے چلا جاتا ہے ۔

بورژوا سماج میں عورت کا اشتہار اسی طرح دیا جاتا ہے جس طرح عورت عورت نہیں
ہے چیونگ گم ہے ، لپ سٹک ہے یا گوڈریج کا سپرنگ دار پلنگ ہے ـــــ بازار میں
گوڈریج کا پلنگ نوّے روپے میں ملتا ہے اور مصباح الدین کی لڑکی تین سو روپیہ ماہوار میں!

ہائے عورت ـــــ ! تو کبھی جون آف آرک بھی تھی ! تیرا نام زویا بھی تھا !

دوسرا اشتہار ـــ تجہیز و تکفین کا اشتہار ۔ فدا علی ناصر علی اینڈ سنز ماہران کفن دفن
کا ہے ۔ جو روزانہ اخبارات میں اس طرح چھپتا ہے :۔

اگر آپ کا کوئی عزیز مر گیا ہو تو ہمیں ۲۹۲۶ پر ٹیلیفون کر دیجئے ۔ ہم اُجرت پر
ایسے بہترین طریقے پر آپ کے عزیز کو کفنائیں گے اور دفنائیں گے کہ مرحوم
کا آخری سفر نہایت آرام دہ ہوجائے گا ـــ ہماری فرم کا دعویٰ ہے کہ
آج تک کسی مُردے نے ہمارے کام اور انتظام کی بُرائی نہیں کی ۔ اگر ممکن
ہوتا تو ہم بڑے بڑے نامی گرامی مردوں سے تعریفی سرٹیفکٹ بھی حاصل کر لیتے

لیکن ہم جھوٹ نہیں کہتے ۔ ہم بہترین غسل دیتے ہیں ۔ بہترین قبریں کھودتے ہیں ۔ ایسی قبریں جو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں ایرکنڈیشنڈ ہوجاتی ہیں

ہماری فرم میں پھلیرے، مرثیہ خواں اور نوحہ خواں بھی ملازم ہیں۔

تجہیز و تکفین کا مکمل کورس صرف پچاس روپے میں ۔

المشتہر

فدا علی ناصر علی اینڈ سنز ۔ دی بونا فائیڈ کانفرنس اینڈ گریڈ گرس

بالمقابل جامع مسجد، میکلوڈ روڈ۔ کراچی

بورژوا تجارت کی اس حیرت انگیز ترقی کے دور میں ہمیں اتنی آسانیاں ہیں کہ اگر کوئی عزیز مرجائے تو ہمیں صرف اپنی تجوری یا چیک بک کی طرف دیکھنا پڑتا ہے اس کی لاش پر رونے کی ضرورت نہیں کیونکہ فدا علی ناصر علی اینڈ سنز کے پاس کرائے کے رونے والے موجود ہیں اور آپ کی طرف سے آپ سے زیادہ دھاڑیں مار مار کر روسکتے ہیں کیونکہ رونا آپ کا پیشہ نہیں ان کا پیشہ ہے ۔ مرحوم کی قبر پر روزانہ پھول چڑھانے کے لئے آپ کو تکلیف کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ فدا علی ناصر علی کے ملازم ہر روز قبر پر پھول چڑھا آتے ہیں اور پھول کے دام اور قبر تک آمد و رفت کے اخراجات کا بل روز کا روز پیش کر دیتے ہیں ۔

دیکھئے دور سرمایہ داری میں انسان نے سچ مچ کتنی ترقی کر لی ہے ۔ اب ایک انسان پر دوسرے انسان کی تکلیف یا موت غم بن کر کبھی نہیں چھا سکتی ۔ سرمایہ داری دوسرے انسان کی مصیبت یا موت کے غم کو آپ کی آنکھ کا آنسو نہیں بننے دیتی ۔ دور سرمایہ داری نے آپ کے دل کو گوشت کے فضول لوتھڑے کے بجائے چاندی اور سونے کا سخت اور چمکیلا دل بنا دیا ہے جس پر جو بھی غم گرے گا وہ چاندی بنے گا — سونا بنے گا — آنسو نہیں بنے گا — تہمت نہیں بنے گا —

اب ذرا چند اور اشتہارات ملاحظہ فرمائیے ۔

محکمہ راشننگ کے ہیڈ آفس کے آگے ایک اشتہاری بورڈ لگا ہے۔ جس پہ ایک اناج کے گودام کی تصویر ہے جس کے دروازے پر ایک طرہ باز موٹا جاگیردار کھڑا مونچھوں پہ بل دے رہا ہے مگر اس کی ٹانگوں کے درمیان سے ایک چوہا پولیس کی وردی پہنے اندر داخل ہو رہا ہے۔ اور نیچے یہ عبارت لکھی ہے:۔

چور بازاریوں اور ذخیرہ بازوں کا ـــــ پتہ لگانا آپ کا قومی فرض ہے۔

اس اشتہار پہ کہاں تک عمل ہوتا ہے اس کا ہمیں علم نہیں۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ جب کبھی کسی نے بلیک مارکیٹ یا ذخیرہ باز کا پتہ لگایا ہے تو اسے کم از کم راشننگ افسر اور زیادہ سے زیادہ کسی صوبے کا وزیر بنا دیا گیا ہے۔

محکمہ آبادکاری مہاجرین کا یہ اشتہار آپ کو دہلی اور کراچی کی بڑی بڑی شاہراہوں پہ نظر آئے گا۔ جس میں ایک لٹے ہارے قافلے کی تصویر ہوگی اور نیچے بڑے دردناک الفاظ میں لکھا ہوگا:۔

یہ آپ کے مہمان ہیں۔
انھیں اپنے گھروں میں جگہ دیجیے۔
تاکہ آخرت میں آپ کو جنت میں جگہ ملے!

لیکن چونکہ موجودہ زمانہ مادیت کا زمانہ ہے۔ لوگ کل کی جنت کے مقابلے میں آج کے گھر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اس لیے جب مہاجرین یا شرنارتھی سرکاری کیمپوں کے بجائے ہمارے آپ کے گھروں کا رُخ کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ جنت کا دروازہ کل کھولنے سے یہ بہتر ہے کہ آج ہی اپنے گھر کا دروازہ اندر سے بند کر لو ـــــ اور پھر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حکومت مہاجرین کو اور شرنارتھیوں کو گورنمنٹ ہاؤس یا سرکاری کیمپ میں مہمان رکھنے کے بجائے ہمارے تمہارے گھروں کی طرف کیوں ہانک دیتی ہے۔ مہاجرین اور شرنارتھی کیا لیا تعلق

اور نہرو کے مہمان نہیں ہیں عبداللہ اور نارائن داس کے مہمان ہیں ـــــ ؟ اب اس پیدا شدہ سوال کا جواب پیدا ہوتا ہے کہ حکومت کا کام صرف اشتہار بازی ہے اور عوام کا کام مہمان نوازی ہے۔ جس ملک کے عوام جتنے زیادہ مہمان نواز اور حکومت جتنی زیادہ اشتہار باز ہوگی۔ وہ ملک اور اس کی حکومت جمہوریت کی تاریخ میں بڑی عزت کی مستحق قرار پائے گی۔

جملے کو ادھورا چھوڑ کر چند اور اشتہار پڑھیئے۔ یہ حکومت کی طرف سے تو نہیں ہیں البتہ حکومت کی بڑی حد تک ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ نے یہ اشتہار ہر جگہ دیکھا ہوگا۔

پاکستان کو مضبوط بناؤ

جہاد کشمیر کے لئے نوجوانوں کو تیار کرنے کا واحد طریقہ ڈالڈا بناسپتی گھی کا استعمال ہے

یہ اشتہار نہ صرف تجارتی بلکہ سیاسی اہمیت کا بھی حامل ہے۔ یہ اشتہار کا اشتہار ہے اور حکومت کو ایک سیاسی مشورہ بھی ہے کہ حکومت کیوں بیکار میں اپنے بجٹ کا ۶۶ فیصدی حصہ فوج پر خرچ کرتی ہے اس کے بجائے اگر وہ ڈالڈا بناسپتی کا سارا اسٹاک پاکستان کے لئے خرید لے تو انشاءاللہ العزیز پاکستان نہ صرف کشمیر فتح کر لے گا بلکہ سارے ہندوستان پر بھی قبضہ کر لے گا۔

دوسرا اشتہار کپڑوں کے ایک بڑے تاجر کا ہے۔ جو یہ ہے:-

قائدِ اعظم کا فرمان

اتحاد، تنظیم اور عمل

بہترین ورسٹڈ، ٹوئیڈ اور گیبرڈین ـــــ ہم سے خریدیئے ـــــ ہم ہیں پاکستان میں انگلستان اور امریکہ کے کپڑوں کے سب سے بڑے اسٹاکسٹ:-

حاجی ہدایت علی نظام علی اینڈ سنز کلاتھ مرچنٹ، بندر روڈ، کراچی

تیسرا اور آخری اشتہار فلیکس شوز کمپنی کا ہے۔ اس اشتہار میں ہندوستان اور پاکستان کا نقشہ دکھایا گیا ہے اور اس پر فلیکس شو کو اس طرح رکھا ہے کہ جوتے کی ایڑی تو دہلی پر ہے اور تلا پاکستان پر اور نیچے سوائے "فلیکس فٹ دیہ" کے کچھ نہیں لکھا ہے۔ غالباً "لکھنے کی اس لئے

ضرورت نہیں تھی کہ یہ اشتہار دیکھنے اور پڑھنے سے زیادہ سمجھنے اور غور کرنے کا ہے۔ میں نے اس اشتہار پر جہاں تک غور کیا ہے اور جتنا اسے سمجھنے کی کوشش کی ہے اتنا ہی مجھے غصہ آیا ہے کہ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔۔۔ ؟ فلیکس شوز کمپنی کو ہماری دونوں آزاد مملکتوں کی آزادی کا اگر مذاق ہی اڑانا تھا تو اس کے اور بھی طریقے ہو سکتے تھے۔ ہماری آزاد مملکتوں نے کب یہ کہا تھا کہ وہ اینگلو امریکن بلاک سے علیحدہ ہونا چاہتی ہیں ۔۔۔۔ مانتا ہوں کہ یہ اشتہار سچائی پر مبنی ہے مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ہر سچائی کی اس طرح تشہیر کی جائے کہ وہ سراسر جھوٹ معلوم ہو۔

حضور ملک معظم کے زیر سایہ اینگلو امریکن بلاک کی یہ دونوں آزاد مملکتیں فلیکس شوز کے اس اشتہار کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہیں ۔ آپ لاکھ کہیں کہ یہ توہین نہیں بلکہ "پاپوش عبرت" ہے میں نہیں مانوں گا۔ یہ سراسر ہماری توہین ہے ہمارے ملکوں کی نہیں تو نقشوں کی توہین ضرور ہے۔

آئیے چودھری ظفر اللہ خاں اور سر گوپالا سوامی آئنگر کو ایکسپریس ٹیلیگرام دیں کہ حفاظتی کونسل کے کسی قریبی اجلاس میں اس اشتہار کو پیش کر کے فلیکس شوز کمپنی کے خلاف فوری کارروائی کا آغاز کریں کیونکہ حفاظتی کونسل ایسے ہی اہم مقدمات کے تصفیوں کے لئے قائم کی گئی ہے۔

اور اگر بالفرض اس کا فیصلہ حفاظتی کونسل میں نہ ہوا تو پھر قسم ہے تاج برطانیہ کی اس کا تصفیہ میدان جنگ میں ہوگا اور بزور تلوار ہوگا۔

برے ہو ڈان کوئیکزوٹ!

سویرا

۸،۷

پرکاش پنڈت

آزادی کے بعد

•

عجیب بے کسی کے انداز میں جب اس نے اپنے آپ کو چائے کی اس مخصوص دکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر آن گرایا تو اُسے محسوس ہوا، وہ بہت تھک چکا ہے۔

تھکاوٹ اور اضمحلال دُور کرنے کا اس کے پاس ایک ہی سہل اور آزمودہ طریقہ تھا کہ وہ اپنی پریشانیوں سے وقتی طور پر منہ موڑ لے اور سیاہ گڑ کے کاڑھے میں اُبلی ہوئی کڑوی کسیلی چائے کا گلاس گھونٹ گھونٹ کر کے اپنے حلق سے نیچے اُتار جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ آج وہ چائے نہیں پی سکتا۔ اس کے پاس صرف ایک دوّنی رہ گئی ہے۔ جسے وہ کسی ناگہانی ضرورت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑنا چاہتا ہے۔

"کیوں چائے نہیں پیو گے آج؟ لائلپور میں اپنا سب کچھ لٹا کر آئے ہوئے گڑ کے کاڑھے میں چائے کی پتیوں کو دو اُبالے دیکر دو دو آنے فی گلاس بیچنے والے مانک چند سنگھ شاہ نے اس سے پوچھا "کچھ پتہ چلا"؟

سر کو نفی کی ہلکی سی جنبش دے کر بے مقصد طور پر اس نے قریب ہی زمین پر اکڑوں بیٹھے اور نیم دراز حالت میں لیٹے ہوئے بارہ افراد پر مشتمل ایک کنبے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا جن میں بحث چل رہی تھی کہ رات تو جیسے تیسے کٹ ہی جائے گی، کل صبح بھی اگر بچوں

کو دودھ میسر نہ آیا تو گیا ہو گا۔ اسی حالتِ غیر سروکارانہ میں کہ جس طرح وہ ان کی طرف متوجہ ہوا تھا، اس نے نگاہیں پھیر لیں اور اپنے پاس بنچ پہ بیٹھے ہوئے سردار صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔ سردار صاحب پھونکیں مار مار کر چائے پینے کے ساتھ ساتھ ضلع شیخوپورہ میں واقع اپنی چالیس بیگھے زمین۔ تین جوڑی نسلی بیل، بیسیوں ڈھور ڈنگر۔ اناج سے بھرے ہوئے کوٹھوں کی داستانِ غم سُناتے ہوئے بار بار عجیب رازدارانہ طور پہ اس فقرے پہ آ رُکتے تھے " لالہ، زندگی رہی تو ایک بار ضرور وہاں جاؤں گا۔"

پاؤں سے چپل اُتار کر ٹانگیں سمیٹتے ہوئے وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

پچھلے ڈیڑھ مہینے سے کہ جب سے وہ امرتسر میں آیا ہوا تھا، صبح پناہ گزینوں کے لئے حکومت کی طرف سے جاری کردہ لنگر میں دو کچی یا جلی ہوئی چپاتیوں اور سڑی بُسی دال کے لئے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دھکے کھانے کے بعد اپنی بوڑھی ماں، جوان بہن اور معصوم بھائی کی تلاش میں مارے مارے پھرنا اس کا معمول بنا ہوا تھا۔ ضلع سیالکوٹ کے ایک دُور اُفتادہ گاؤں میں رہنے والی تین روحیں اس کی روح کو بُری طرح اسیر کئے ہوئے تھیں۔ ہر صبح اُمید و بیم کی ایک جیتی جاگتی لہر محسوس طور پہ اس کے دل و دماغ میں حلول کرنے لگتی۔ حالات کی ناموافقت، تلخیوں اور بے پناہیوں کے باوجود اسے محسوس ہوتا جیسے وہ تینوں بے بس و بےکس ہستیاں امرتسر کی کسی سڑک کے کنارے، کسی سائبان کے نیچے، کسی جلے ہوئے شکستہ مکان کی دہلیز پہ کھڑی حسرت اور پُر امید نظروں سے ہر راہگیر کی طرف دیکھ رہی ہیں کسی غیر مغلوب خواہش کے زیرِ اثر وہ سوچنے لگتا کہ آج اچانک ہی جب وہ ان کے سامنے جا کھڑا ہو گا تو انھیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آئے گا۔ ماں لپک کر اسے چھاتی سے لگائے گی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے گی۔ وہ اسے دلاسا دے گا۔ اسے کہے گا ماں، صرف ہم ہی تو مصیبت زدہ نہیں۔ ہزاروں، لاکھوں انسان برباد و بےخانماں ہو چکے ہیں۔ دُنیا پہ کیا کیا گذری ہے۔ دیکھی جاتی ہے، نہ سُنی! ہمیں تو

اپنی زندگی اور اپنی عزت کی خیر منانی چاہیئے .... ننھا ہاشی بھیا بھیا چلاتا ہوا اُس کی ٹانگوں سے لپٹ کر جھولنے لگے گا۔ اپنی گود میں اُٹھا کر اور گال پہ ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے وہ اُسے کہے گا ـــــ کمبخت! سب سے زیادہ تو مجھے تمہاری فکر تھی۔ میں سوچتا تھا کہیں تم لوگ کسی پیدل قافلے کے ساتھ نہ چل کھڑے ہو ـــــ تم سے تو دو قدم بھی نہ بھرے جاتے ـــــ ساوتری البتہ حسب عادت خاموش رہے گی، نہ جانے کیوں، وہ ہر وقت مجھ سے شرماتی رہتی ہے۔ پچھلے دِنوں اچھا بھلا اس کے لئے بر تلاش کیا تھا۔ اپنے گھر اُٹھ گئی ہوتی تو اس کی طرف سے تو کچھ اطمینان رہتا۔ لیکن ماں ـــــ میں ماں سے کہوں گا۔ ان دنوں تو بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار بغیر ایک کوڑی تک لئے دیئے سروں کے بوجھ اتار رہے ہیں۔ زمانے کی حالت کس سے پوشیدہ ہے۔ اب وہ پہلی سی باتیں کہاں ـــــ اور اسی لہر کے لامحدود تاثرات دیکھی، جوش اور جد وجہد کے زیرِ اثر وہ سڑکوں، گلیوں اور ہر اُس مقام کی کہ جہاں اس علاقے سے آئے ہوئے لوگوں کی خبر ملتی، خاک چھانتا پھرتا۔ لیکن شام کے وقت جب مضطرب اور نڈھال اپنے آپ کو چائے کی اس دوکان کے سامنے پڑے ہوئے بنچ پر آن گراتا تو اُسے زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوتے۔ اس کا دل سیکڑوں ہیبت ناک اور دہلک وسوسوں میں گرفتار ہوتا کہ بنکے شاہ کے حلاوت آمیز الفاظ ـــــ "کیوں چائے نہیں پیو گے آج، کچھ پتہ چلا ـــــ ؟

اس کے لرزیدہ خیالات، اس کے گھومتے ہوئے ذہن کو ڈھکانے پہ لے آتے اس وسیع وعریض دُنیا میں اب ایک بنکے شاہ ہی ایسا شخص تھا جسے وہ اپنا ہمدرد وغمگسار دوست اور مہربان جو کچھ بھی کہنا چاہتا کہہ سکتا تھا۔ سوائے اس کے باقی ساری دنیا اس کے لئے بیگانہ تھی۔ بیگانہ اور بے اعتنا ـــــ بے اعتنائی اور غیریت سے لبریز اس دُنیا کا کوئی سر پھرا انسان آخر کیوں چل کے اُسے پوچھنے آتا کہ " بھائی تم اتنے

پریشان کیوں ہو؟ صبح سے تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں؟ رات کو کہاں سوؤ گے؟ تمہارے پاس تو کوئی کپڑا لتا بھی دکھائی نہیں دیتا —— منکھے شاہ نے سونے کے لئے دوکان کے سامنے والا بنچ اور بنچ کے علاوہ ایک پھٹی پرانی دری کہ جس کے متعلق وہ کہتا تھا کہ لائلپور سے چلتے وقت وہ بالکل کوری تھی، بچھونے کے طور پر اسے دے رکھی تھی اور حال ہی میں جب کیمپ آفیسر نے ضرورت مند لوگوں میں رضائیاں تقسیم کرنے کا اعلان کیا تو یہ منکھے شاہ ہی کی سفارش کا کرشمہ تھا کہ آدھی رات کے وقت جگا کر ایک بالکل نئی رضائی اس پر ڈال دی گئی تھی۔ اس کے اصرار کے باوجود ایک بار منکھے شاہ نے اس سے چائے کے دام بھی نہ لئے تھے اور جب دوکان کے بڑھاتے میں منکھے شاہ کا ہاتھ بٹاتے ہوئے وہ پھر سے اپنے لواحقین کی کہیں کھوج نہ ملنے کی روئیداد بڑے رحم طلب لہجے میں کہتا ہوا اس سے پوچھتا ——

"شاہ جی! آپ کا دل کیا گواہی دیتا ہے؟"

تو منکھے شاہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیتا —— "ان کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ تم تو خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہو۔"

—— تو کیا واقعی وہ خواہ مخواہ ہلکان ہو رہا ہے ——؟ بازوؤں کے تکئے پر سر رکھے آسمان کی طرف تکتے ہوئے آدھی آدھی رات تک وہ سوچتا رہتا —— ان کا بال تک بیکا نہیں ہوا —— لیکن اسے یقین نہ آتا۔ ہر روز اسے سیکڑوں ایسے لوگوں سے بھی سرو کار پڑتا تھا جن کے متعلقین کی آمد کی خبر بھی انھیں مل چکی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ان معتبر خبروں کو افواہوں سے تعبیر کرتے تھے اور برابر پوچھ پڑتال میں سرگرداں رہتے تھے اس سلسلے میں کم وبیش جتنے بھی لوگوں سے اس کا واسطہ پڑا وہ سبھی اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنے ہی آلام کی طولانی داستان بیان کرنا شروع کر دیتے تھے۔ ہر کسی کے ایک ہی قسم کے جذبات تھے۔ ذمہ دار لوگوں کی کم فہمی اور ناوقت شناسی کے جذبات انھیں اس حالت تک پہنچانے والوں کا لہو پینے کے جذبات، قریب قریب ایک

ہی قسم کی داستانیں تھیں۔ قتل و غارت کی داستانیں۔ اغوا و درندگی کی داستانیں، فاقوں اور خدائی قہر کی داستانیں ـــــ شروع شروع میں اس قسم کی کوئی داستان سنتے وقت اس کے جسم کے کل رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا تھا اور اس کے دماغ میں کئی باغی اور بے ہنگم خیالات کروٹیں لینا شروع کر دیتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا جی کڑا ہوتا گیا اور اب وہ ایک ایسے دَور میں تھا جہاں بڑی سے بڑی خونی داستان بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ وہ نامعلوم سا خوف، وہ موہوم اندیشہ اب بھی بدستور، مرض مزمن کی طرح اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ بلکہ جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے اس کی دلی کیفیت مایوس سے مایوس کن ہوتی جا رہی تھی۔ صبح سے شام تک کا وقت یہاں وہاں کھوج کھرچ ہی میں گزر جاتا، اور اگرچہ چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہو جاتے، سارا بدن کچے پھوڑے کی طرح دکھنے لگتا اور ہر گام پر اسے ناامیدی اور مایوسی ہی نصیب ہوتی۔ پھر بھی ہزاروں ہم جنسوں کی اپنے سے بھی بدتر حالت دیکھ کر اس کے وہ مخدوش خیالات اتنی شدت اختیار نہ کرتے۔ شعوری طور پر اسے حاسدانہ سی مسرت کے ساتھ کچھ اس طرح کا یقین ہونے لگتا کہ اس کی آج کی کاوش اکارت جا ہی نہیں سکتی۔ کوئی نہ کوئی غیر معمولی، خوش کن واقعہ از خود پیش آ جائے گا۔ کسی معجزے کے زیرِ اثر اس کی دلی مُراد بر آئے گی۔ لیکن وہ تمام طفل تسلیاں شام ہوتے ہی دلگیر اور تلخ خود فریبی میں تبدیل ہو جاتیں ـــــ لاچاری اور خستگی کی حالت میں وہ چائے کی دوکان کے سامنے رکھے ہوئے بنچ پر آن گرتا۔

سردار صاحب کی جگہ اب ایک بوڑھی عورت کھدر کی چادر میں لپیٹ کر بٹھائے ہوئے پانچ چھ برس کے مدقوق سے اپنے پوتے کو چائے پلانے کے ساتھ ساتھ گالیاں دے رہی تھی "ـ لے پی مر۔ میرے دشمن۔ میری جان کے لاگو۔ تم کیوں بچ رہے۔ ہیجا ہو جائے تجھے بھی۔ تجھے کسی کی آ جائے" پھر ایک گھونٹ خود بھر کر منگے شاہ سے مخاطب

ہوئی۔" پرسوں ماں اس کے ہیضے سے مرگئی۔ حرامجادہ دونوں جھٹ چائے مانگتا ہے
لٹا پٹا کر آئے ہیں۔ چائے میں دودھ نہیں ڈالتے لالہ؟"

دودھ ــــ غیرارادی طور پہ فوراً اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ چلا کر کہنے لگے۔" دودھ، لالہ کھتری کا پوت ہے مائی، اس سے چائے میں دودھ ڈلوانے کی توقع بیکار ہے اتنا کیا کم ہے کہ اس نے دو آنے میں پانی کا گلاس نہیں دیا۔ چائے دی ہے۔" لیکن وہ نا ملائم اور اہانت آمیز الفاظ اس کے منھ سے نکلتے نکلتے رہ گئے۔ ہنکے شاہ پیسے کا پیر ہے۔ غرض کا پتلا ہے۔ انسانیت اُسے چھو تک نہیں گئی۔ اس قسم کے بیسیوں احساسات واکثر وبیشتر محسوس کر چکا تھا اور کسی مناسب موقع پر ان کا اظہار بھی کرنا چاہتا تھا لیکن نہ جانے وہ کونسا نامعلوم جذبہ تھا جس کے تحت اس قسم کے الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوتے ہوتے رہ جاتے تھے۔ جیب میں ہاتھ ڈالکر اس نے دوّنی کو ٹٹولا پھر مسلا پھر ہاتھ باہر نکال لیا۔ وہ اتنا گرا ہوا تو نہ تھا۔ کاش لالہ نے آج بھوٹے منھ ہی سے اُسے مفت چائے پینے کی دعوت دی ہوتی۔

بڑھیا اسی طرح بکتی جھکتی اپنے پوتے کو اٹھا کر سڑک کی اس بے پناہ بھیڑ اور ہر لحظہ گہری ہوتی ہوئی تاریکی میں گم ہوگئی۔ بنچ کے قریب زمین پر ڈیرہ ڈالے ہوئے بارہ افراد پر مشتمل وہ کنبہ پاؤ بھر دودھ حاصل کرنے کی ترکیبوں پر غور کرتے کرتے لمبی تان چکا تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر ایک اور کنبہ ــــ اور اس سے ذرا ہٹ کر ایک اور ــــ درختوں کے کٹے ہوئے بے جان ٹہنوں کی طرح یہاں وہاں اِدھر اُدھر انسان ہی انسان گرے پڑے تھے۔ سڑک البتہ چلتے پھرتے ٹہنوں سے بدستور اَٹی ہوئی تھی۔ لیکن دن کے وقت کا سا ہنگامہ۔ دھکا پیل۔ شور وشغب نہ تھا شاید شور مچا مچا کر تھک چکے تھے وہ۔ اور اب کسی ابدی سکون کی تلاش میں خاموش، سر جھکائے رواں دواں چلے جارہے تھے اور کہیں دُور سے کسی کے قے کرنے

کی دھاڑیں واضح طور پر سُنائی دے رہی تھیں۔ یہ تاریکی اور تعفن میں لپٹی ہوئی فضا، یہ پر اسرار سکوت۔ اس نے سوچا۔ کل میں بھی ہیضے کا ٹیکہ کرا لوں گا۔

حکومت کی طرف سے جہاں ہر کس و ناکس کو ہیضے اور پلیگ کے ٹیکے مفت کئے جاتے ہیں اور ردی کپڑا مفت تقسیم ہوتا تھا وہاں رہنے کے لئے خیمے بھی لگوا دئے گئے تھے لیکن ہیضے اور پلیگ کا ٹیکہ لگوانا اتنا ہی آسان کام تھا جتنا کسی خیمے میں جگہ حاصل کرنا مشکل ترین تھا۔ پھر خیمے تو صرف کنبوں کے لئے مخصوص تھے افسروں کے آگے پیچھے پھرنے کے علاوہ کم از کم آٹھ افراد کے نام رجسٹر میں درج کرانا لازم تھا اور ان آٹھ افراد میں بھی جبتک نصف کے قریب عورتیں اور بچے نہ ہوتے تھے بات نہ بنتی تھی۔ منکے شاہ کے کنبے کا ایک فرد بن کر وہ خیمے میں جگہ حاصل کر سکتا تھا یعنی اگر منکے شاہ کو خیمے میں رہنا مقصود ہوتا۔ لیکن اسے تو ایک پکا مکان مل چکا تھا جس میں پانی کا نل اور بجلی بھی لگی ہوئی تھی۔ ایک اکیلی جان ـــــ وہ جانتا تھا خیمے کے خواب بھی نہیں لے سکتی۔ بھلے ہی اسے سردی ڈس لے۔ وہ ٹھٹھر ٹھٹھر کر مر جائے۔ حکومت اس کے لئے کچھ کرنے سے معذور تھی اور وہ تو یہ بھی جانتا تھا کہ بیس بیس افراد پر مشتمل کنبے بھی کیوں یخ بستہ زمین اور کھلے آسمان کو خیموں کی زندگی پر ترجیح دیتے تھے۔

جس احساس کمتری کا وہ آج تک شکار نہ ہوا تھا اور جس طرح صرف نوّے روپے ماہوار پر ایک ولایتی فرم میں کلرکی کرنے کے باوجود شہنشاہیت سی محسوس کرتا رہا تھا ـــــ سینہ پھلا کر اپنے دوستوں، اپنے واقف کاروں کی تنگ دستی پر اظہار افسوس کیا کرتا تھا۔ اُسے اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی ہی نظروں میں خود کو گرا دے۔ پناہ گزینوں کو بانٹے ہوئے ایک ہی رنگ اور ایک ہی وضع کے کپڑے پہن کر اپنی کس مپرسی کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے۔ اتنا ہی کیا کم تھا کہ اپنے سر اور چہرے کے گرد مفلر لپیٹ کر وہ لنگروں سے دو روٹیاں لے آتا تھا۔ پھر اسے خیمے میں جگہ حاصل کرنے کی اتنی خواہش

بھی نہ تھی۔ صرف رات کاٹنے کے لئے اسے چھ فٹ جگہ درکار تھی اور مینکے شاہ نے ساڑھے سات فٹ لمبا اور اڑھائی فٹ چوڑا بنچ اسے عنایت کر رکھا تھا جس کے قریب ہی سُلگتی یا بُجھی ہوئی بھٹی کی جان بخش گرمی کہ جبتک وہ جاگتا رہتا اس کے جسم کو گرمائے رکھتی تھی۔ آج سے ڈیڑھ ماہ پہلے کی اس پر وقار شہنشاہیت کا احساس تو اُسے نہ ہوتا لیکن قریب ہی زمین پر پڑے ٹھٹھر رہے یا بھٹی پر آگ تاپنے کی غرض سے آئے ہوئے لوگوں کی لاچاریاں دیکھ کر اسے یک گونہ مسرت ضرور ہوتی ــــ وہ سوچتا کہ اب بھی اس کا رُتبہ ہزاروں سے بلند ہے۔

لیکن اس بلند رتبے کا تلخ احساس اسے اس وقت ہوتا جب وہ دیکھتا کہ اپنا سب کچھ گنوا کر آئے ہوئے لوگ، کہ جن کے پاس جینے تک کا بہانہ نہ رہ گیا تھا ــ جو لنگر سے زیادہ سے زیادہ روٹیاں حاصل کرنے کے لئے جھگڑا کرتے تھے، بھیس بدلتے تھے۔ جو ایک ہی رنگ ایک ہی وضع کے کپڑے پہن کر اپنی ڈھٹائی کی کھلے بندوں نمائش کرتے تھے اور جو افسروں کی جھڑکیاں اور پولیس والوں کی گالیاں کھانے کے باوجود اسی ڈگر پر چلے جا رہے تھے، ایک ایسی قناعت ــــ ایک ایسے اطمینان کا سرچشمہ دکھائی دیتے تھے گویا صدیوں سے وہ اسی حالت میں رہتے آ رہے ہوں۔ گویا ان کے ساتھ کچھ بھی نہ ہوا تھا ــــ اور واقعی وہ سوچتا۔ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے وہ وہاں گھاس چھیلتے تھے۔ بان بٹتے تھے۔ قلابازیاں لگاتے تھے۔ بھاڑ جھونکتے تھے ــــ ان کا ہر بوڑھا، ہر بچہ بحفاظت پہنچ چکا تھا۔ بچے چھولداریوں میں کلولیں کرتے تھے اور بوڑھے چھولداریوں کے باہر حقے گڑگڑاتے ہوئے نوجوانوں کو اپنی زندگی پھر سے مرتب کرنے سے پیشتر کچھ دن سکھ کا سانس لینے کی تلقین کرتے تھے۔ جو وقت گذر جائے وہ غنیمت ہے۔ ساری عمر ہاتھ پیر توڑنے ہی کے لئے تو ہے۔

ــــ کاش اس کی بوڑھی ماں اس کی جوان بہن اور اس کا وہ معصوم

بھائی بھی بحفاظت پہنچ چکا ہوتا ــــ وہ بارہا سوچتا، پھر اسے کس بات کی پرواہ تھی کیا غم تھا ــــ وہ کبھی انھیں خیموں میں دھکّے کھانے نہ دیتا۔ ٹوکری اٹھاتا۔ بھیک مانگتا لیکن نہیں، اسے ٹوکری اٹھانے یا بھیک مانگنے کی کیا ضرورت تھی اس کے پاس علم تھا۔ لیاقت تھی، تجربہ تھا۔ عزت کی دو روٹیاں کمانا بھی کونسی بڑی بات ہے۔

یکایک اسے خیال آیا کہ اس کی جیب میں پڑی ہوئی دوّنی بھلا کب تک اس کا ساتھ دے گی۔ کل سے اُسے کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہوگا۔ اس کے کپڑے بھی تو انتہائی غلیظ ہو چکے تھے۔ ایک دوّنی کے صابن سے تو بمشکل ایک قمیص ہی دھلے گی ــــ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر پھر سے دوّنی کو مسلنا شروع کیا۔ لیکن جیسے یہ بالکل غیر اختیاری طور پر ہوا ہو، دوّنی اس کے ہاتھ کیساتھ ہی جیب سے باہر نکل آئی جسے اس نے عجیب شانِ بے نیازی سے منگے شاہ کے سامنے پھینکدیا ــــ "تو پلاؤ چاہئے"

دھواں دھار چائے سے لبا لب بھرا ہوا گلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ پہلا گھونٹ بھرتے ہی جہاں اُسے اپنے اندر توانائی کا احساس ہوا وہاں لاچارگی اور خستگی کے جذبات بھی شدت اختیار کر گئے جیسے اس سے دانستاً کسی شنیع فعل کا ارتکاب ہو رہا ہو، اس کے رگ و ریشے میں ایک ہیجان کروٹیں لینے لگا ــــ بالکل ایک بچے کی سی معصومیت کے ساتھ ــــ دکان بڑھانے کی فکر میں برتنوں کو سمیٹتے ہوئے منگے شاہ کی طرف ــــ اس نے دیکھا لیکن منگے شاہ اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ دوسرے گھونٹ پر اس کے رخساروں پر سے لڑھکتے ہوئے دو آنسو چائے کے گلاس میں جا گرے۔

منگے شاہ کے دوکان بڑھا کر چلے جانے کے بعد کافی دیر تک وہ اپنی ٹانگوں میں سر دیئے بچوں کی طرح روتا رہا۔ نہ بنچ پر اس نے دری ڈالی نہ بنچ کو سرکا کر بھٹی کے قریب کیا۔ آج پہلی بار اُسے سمجھ نہ آرہی تھی کہ اس کے ساتھ کتنا بڑا ظلم، کتنی

بے انصافی ہوتی تھی ؟ اس کی زندگی کس قدر کھوکھلی اور بے حس و حرکت ہو کر رہ گئی تھی
کس قدر لگاتار ڈیڑھ مہینے سے وہ ذلت اور آوارگی کی زندگی کے ساتھ سمجھوتہ کئے ہوئے
تھا اور ایک ناقابلِ حل عقدے کو دل میں جگہ دئے بھٹکتا رہا تھا ـــــ باوجودیکہ اس نے
اپنے آپ کو جذبات کی لہروں کے رحم پر چھوڑنا کبھی گوارا نہ کیا تھا اور ہمیشہ ہی سے ان لہروں
میں اُلجھ کر گم ہو جانے کے بزدلانہ خیال سے اسے نفرت تھی۔ لیکن اس وقت وہ سچ مچ
جذبات کی رو میں بہہ رہا تھا۔ یکے بعد دیگرے لہروں کے لاتناہی ریلے اُبھڑ رہے
تھے اور لہروں کے اس بے ہنگم ہجوم اس لایعنی شور میں وہ خود کو بالکل بے قابو اور
بے سکت پا رہا تھا ـــــ کیا وہ ماں کا پُر شفقت چہرہ کبھی نہ دیکھ سکے گا ؟ ماں کی
محبت بھری باتیں کبھی نہ سن سکے گا ؟ زندگی میں ساوتری کبھی اس کے سامنے نہ ہوگی ؟
ننھے بھائی کا بھیا بھیا کہنا اس کے کانوں میں کبھی نہ گونجے گا ـــــ ؟ اور پشت در
پشت چلا آرہا گاؤں کا وہ چھوٹا سا گھر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ بھولی بھالی
فضا۔ وہ تقویت بخش مٹی جس میں اس کا بچپن نہایا تھا جہاں اس نے جوانی کا ترش اور میٹھا
پھل چکھا تھا۔ جہاں کے کھیتوں میں چھپ کر اس نے کنواریوں کے گیت سُنے تھے۔
شیریں، رسیلے اور عمیق گیت ـــــ گیت جو اُن کے کنوارے جذبات کی ترجمانی کرتے
تھے۔ جن میں باپ کے گاؤں میں رہ کر تمام عمر کنوارپنے میں گذار دینے کی آرزو ہوتی
تھی۔ جن میں اپنی ہونے والی نند اور ساس کے سلوک کے اندازے کے ساتھ ساتھ
اپنے خاوند کی وجد آور محبت کی تعریف ہوتی تھی اور جس میں نسوانی حجاب، سماج کے
قیود اور اپنے نامراد عاشق کو موسوم تسلیاں پنہاں ہوتی تھیں۔ دیو بھی تو . . . . . .
جیسے وہ کسی انتہائی بلندی سے لڑکھڑا کر گر پڑا ہو۔ گھبرا کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ دری
جھاڑ کر اُس نے بنچ پر بچھالی اور بنچ کو بھٹی کے قریب سرکا لیا۔ پھر بنچ پر بیٹھ کر رضائی
کو اپنے اردگرد اچھی طرح لپیٹ کر ہاتھ سینکنے لگا۔

دیپو ـــــ دیپو کی یاد نے یکلخت لہروں کو گرداب کی صورت میں منتقل کر دیا تھا
اور اسے ایک دم محسوس ہونے لگا تھا گویا اس کے پاؤں سے کوئی غیر معمولی وزن باندھ
دیا گیا ہو۔ اور وہ نیچے ہی نیچے کسی اتھاہ گہرائی میں غرق ہوتا چلا جا رہا ہو۔ دیپو کی
یاد کو اس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دینے کی کوشش کی تھی۔ یعنی وہ اُسے
اس کے متعلق ہر بات کو اپنی زندگی سے خارج کر دینا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جس
کی خاطر اُس نے ماں کے منع کرنے کے باوجود، گھر کے سکھ آرام کو لات مار کر شہر
جا رہنے کی ٹھانی تھی اور اس وقت تک دوبارہ گاؤں نہ گیا تھا۔ جب تک کہ دیپو کا
بیاہ نہ ہو گیا اور وہ سسرال نہ چلی گئی۔ اسی دیپو کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔
پچھلے دو برس سے دیپو سے اس کی کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی اور اس سے ملاقات کا وہ
خواہاں بھی نہ تھا لیکن خود ستائی کے ان طویل دو سالوں میں اتنا اُسے یقین ہو چکا تھا کہ
دیپو کی یاد آسانی سے فراموش کی جانے والی یادوں میں سے نہیں ـــــ جب کبھی اُسے
دیپو کا خیال آیا، وہ کئی کئی دن تک دِل شکستہ اور مغموم رہا۔ اس کے دوستوں نے اس کی حالت
کے پیشِ نظر کئی فرضی معاشقے اس سے منسوب کر رکھے تھے لیکن اس نے کبھی کسی کو اپنے دل
کا راز نہ بتایا ـــــ "میں رو رو کر ساری عمر گذار دوں گی" برگد کے بوڑھے پیڑ کی چھاؤں
میں آنسو بھری آنکھوں سے اس نے اُسے الوداع کہتے ہوئے کہا تھا" لیکن بدنامی......"
اور وہ اسے کسی قیمت پر بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ دیپو جسے وہ بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔
جسے اس نے آج تک چھونے سے بھی گریز کیا تھا۔ جس کی یاد اس کے ذہن کو چاہے جانے
کے نورانی جذبات سے معمور کئے رہتی تھی اور اس کے تباہ حال ہو جانے کے باوجود
جس کی یاد نے اُس کے دل میں غیر معمولی قربانی کا پُر تمکنت احساس قائم کیا ہوا تھا۔
ـــــ وہی دیپو ـــــ ہاں وہی پاکدامنی اور پاک بازی کا مرقع آج وحشی اور
درندہ صفت لوگوں کی گرفت میں تھا، جنھیں انسانیت اور انسانیت سے متعلق

کسی تلخ یا ملائم جذبے سے کوئی سروکار نہ رہا تھا۔ جنھوں نے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ماضی کی رنگین اور سنہری یادوں کو ملیامیٹ کرنے کا اجارہ لے رکھا تھا۔ جنھوں نے مستقبل کے خوش آئند خوابوں پر اپنی درندگی کی مہریں ثبت کر دی تھیں اور جنھوں نے حال کے صبر و شکر پر خونیں ڈاکہ ڈالا تھا۔۔۔ دیپو، اس دیپو کے والد نے ۔۔۔ عورتوں کو درندوں کے چنگل سے نجات دلانے والے دفتر کے سامنے دیپو کے اغوا، کی بھیانک واردات سے آگاہ کیا تھا اور انتہائی صبر سے کام لیتے ہوئے اس نے اس وقت بھی کوئی ایسا لفظ منھ سے نہ نکالا تھا جس سے دیپو کے ساتھ اس کا کوئی تعلق تھا، ظاہر ہو سکتا ۔۔۔ وہ دیپو کو کسی قیمت پر بھی بدنام نہ کرنا چاہتا تھا۔

عورتوں کو چھڑا کر لانے والے دفتر کے سامنے دس دس بارہ بارہ برس کی معصوم لڑکیوں سے لیکر پینتیس چالیس برس تک کی ادھیڑ عمر کی عورتوں تک کے باپ، بھائی خاوند، بیٹے دن بھر ایک جم غفیر کی صورت میں موجود رہتے تھے۔ دیپو کے والد سے ملاقات کے بعد وہ خود بھی دن میں ایک مرتبہ ضرور وہاں سے ہو آتا تھا۔ اگرچہ اس کا وہاں جانے کا مقصد بھی انھیں سینکڑوں عزت لٹائے ہوئے لوگوں ہی کا سا تھا، جن کی مائیں، بہنیں، بیویاں اور بیٹیاں اغوا کر لی گئی تھیں لیکن اس کے دل کی بلا وجہ، کی خود اعتمادی اُسے ان کی طرح چلا چلا کر اپنی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بیٹیوں کا چرچا کرنے سے باز رکھتی تھی۔ اس کی ماں، اس کی بہن کا حشر ۔۔۔ اس کے دل کو کچھ یونہی سا یقین تھا کہ ہرگز ۔۔۔ ہرگز ۔۔۔

لیکن اسی دن اپنے گاؤں کے بے جوڑ جوان جودھا سنگھ کی زبانی اس کی پُر درد تباہی اور بربادی، اس کی لٹی ہوئی عزت و آبرو کا حال سن کر اور اس شخص کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر جو چوپال میں اپنی لاٹھی کا سم زمین پر مار کر لاٹھی کو زمین پہ گاڑتے ہوئے فخریہ کہتا تھا" رونا گتوں کا کام ہے جوان! میری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو گیا مجال

جو سِی تک کر جاؤں "! اس کے دِل کو بہت دھچکا پہنچا تھا اور پورے دو روز تک اس کی وہ کھوکھلی سی خود اعتمادی ڈانواڈول رہی ہے

جودھا سنگھ ــــ جودھا سنگھ جس کی لاٹھی کے چرچے بیس بیس کوس تک ہر زبان پر تھے۔ جس کے گاؤں میں کبھی چوری نہ ہوئی تھی۔ جس کے گاؤں کے ہر فرد کو دوسرے گاؤں والے صرف اس لئے عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ وہ جودھا سنگھ کے گاؤں کا رہنے والا تھا اور جس نے بیس بیس دشمنوں کو ایک وقت میں اکیلے ہی پچھاڑ دیا تھا، آج وہی جودھا سنگھ حیران تھا کہ کس طرح اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی عورت پر ہاتھ ڈالا گیا اور اُس نے اُف تک نہ کی۔ کس طرح اس کی دونوں جوان بہنوں کو حملہ آور گھسیٹ کر لے گئے اور وہ ٹکر ٹکر ان کا مُنھ دیکھتا رہ گیا۔ اور آج وہ رو رہا تھا ــــ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا ــــ "میں خود حیران ہوں کہ ان دنوں کی طرح کھیت میں چھپ کر اپنی جان بچانے کا خیال مجھے کیونکر آیا ــــ کیوں نہ میں نے وہاں ہی جان دے دی ؟"

ــــ آج از سر نو ان تمام واقعات کی تصویریں آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کا دل اور بھی وسوسوں میں گرفتار ہوگیا۔ اس کے یقین کو ٹھیس پہنچی۔ وہ اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ لیکن ان تمام باتوں کی تلخ اہمیت کا شدید احساس ہونے کے باوجود وہ انھیں دل میں جگہ نہ دینا چاہتا تھا۔ اُسے اب بھی یقین تھا کہ اس کی ماں، اس کی بہن، اس کا بھائی بالکل محفوظ ہیں اور امرتسر کی کسی سڑک کے کنارے، کسی سائبان کے نیچے، کسی جلے ہوئے شکستہ مکان کی دہلیز پر پڑے ــــ وہ تن کر سیدھا بیٹھ گیا۔ رضائی کو اچھی طرح اوڑھ لینے کے بعد حسبِ معمول اپنی آنکھیں اس نے آسمان پر گاڑ دیں، لیکن آسمان پر آج ستارے نہ تھے ــــ آسمان ابر آلود تھا ــــ آج بارش ہوگی ــــ بارش کے خیال نے لمحہ بھر کے لئے اُسے اور پریشان کر دیا اور جیسے سچ مچ ہی بوندا باندی شروع ہوگئی ہو، اس نے منھ پر بھی رضائی ڈال لی۔ لیکن اس طرح منھ پر رضائی ڈال کر

سونے کی اسے عادت نہ تھی اس کا سانس اور بھی گھٹنے لگا۔ منہ پر سے رضائی ہٹاتے ہوئے اس نے پھر گھیرے تاریک خلا میں اپنی آنکھیں بھٹکانا شروع کیں ــــ

غیر شعوری طور پر اس کے ذہن کے پردے پر اس کے متموج خیالات نے اپنا عکس ڈالنا شروع کیا۔ اور خاموش خنک فضا شیطانی قہقہوں سے لرزہ بر اندام ہو اٹھی۔ تلواروں، نیزوں، کلہاڑیوں، بندوقوں اور بموں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اور عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی دلخراش چیخیں، رقت آمیز ہاؤ ہو واضح تر ہو گئی ـ اللہ اکبر اور ست سری اکال کے فلک شگاف نعرے آپس میں گڈ مڈ ہو گئے اور اس نے دیکھا کہ وہ خود بھی ایک ننگی تلوار ہاتھ میں لئے انتہائی جوش کے عالم میں کسی نامعلوم سمت کی طرف لپکا جا رہا تھا ــــ گھبرا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کی انگلیاں خود بخود اس کے کانوں میں جا گھسیں ــــ نہیں، وہ اس قدر وحشی نہیں ہے ــــ وہ انسانیت سے گرے ہوئے فعل کا مرتکب نہیں ہو سکتا ــــ ناممکن!

معاً اسے خیال آیا کہ اس دن اسے کیا ہو گیا تھا جب سنگھ شاہ کے ذرا سے اکسانے پر اس نے سچ مچ تلوار ہاتھ میں لے لی تھی اور مسلم پناہ گزینوں سے بھری ہوئی ایک گاڑی پر حملہ کرنے کی نیت سے کلہاڑیوں، نیزوں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر جوق در جوق مقررہ مقام کی طرف بڑھتے جا رہے ہجوم میں جا شامل ہوا تھا ــــ لیکن اس کے دل نے اسے ملامت نہ کی ــــ بلکہ اسے کچھ اس طرح محسوس ہوا گویا کوئی شے اس کے اندر جگمگا اٹھی ہو۔ ــــ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس اکساہٹ میں آ جانے والے اپنے دل پر وہ کس قدر نادم ہوا تھا۔ اور اس ندامت اور پشیمانی کے زیر اثر اسے کھانا سوجھا تھا نہ رات اچھی طرح نیند آئی تھی ــــ جیسے وہ اپنے آپ سے چھپتا پھر رہا ہو۔ اور کوئی تیز اور تند روشنی اس کا تعاقب کر رہی ہو ــــ اپنے اس فعل پر غور کرتے ہوئے کچھ اسی قسم کا احساس اسے ہوا تھا ــــ اسے تعجب ہوا تھا کہ کس طرح کسی کے ہاتھوں مرنے یا

اسے اپنے ہاتھوں مار ڈالنے کے لئے ہم کسی وقت بھی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بات سمجھ میں نہ آئی تھی کہ آخر وہ کون سے دل ہوتے ہیں جو خونریزی سے کانپ جاتے ہیں؟ ـــــ یہ نہتے اور بے گناہ لوگوں کے سروں کو نیزوں پہ ٹانگنے ـــــ اُن کے خاک و خون میں لتھڑے ہوئے جسموں کو پاؤں تلے روندنے، کمسن بچوں کو ہوا میں اچھال کر انھیں تلواروں کی دھار پر روکنے، عورتوں کی دودھ بھری چھاتیاں کاٹ کر انھیں برہنہ نچانے کی آرزوئے عظیم ـــ جیسے زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ـــ آخر یہ سب کیا تھا؟ یہ سب صدیوں سے سمجھتے چلے آ رہے اس متمدن انسان ہی کے تو جذبات تھے اور کارگذاری تھی۔ اس بنی آدم کے جذبات اور کارگذاری جسے فطرتاً امن پسند کہا جاتا ہے ـــــ اور اسے یاد تھا کہ اپنی مردانگی کا کوئی جوہر دکھانے سے پیشتر ہی جب وہ لوٹ آیا تھا تو سنکھے شاہ نے اس کی اس بزدلانہ حرکت پر تعجب و افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ماں کی غلیظ ترین گالی کے ساتھ کہا تھا ـــــ "ان ملیچھوں پر تمہارا ہاتھ نہیں اُٹھتا ـــــ ان ماں ـــــ پر جنھوں نے تمہاری بوڑھی ماں، تمہاری نوجوان بہن اور تمہارے معصوم بھائی ـــــ"

لیکن اس دفعہ سنکھے شاہ کی ان اشتعال انگیز باتوں کی اس نے ذرا بھر بھی پرواہ نہ کی تھی ـــــ چاہے جو ہو، اس نے اپنے آپ سے فخریہ کہا تھا ـــــ "میں بہکانے میں آنے والا وحشی نہیں ہوں۔"

نہیں، وہ وحشی نہیں ہے ـــــ چند لمحے بیشتر کے بے ہنگم خیالات سے گھبرا کر اس کی مُندی ہوئی آنکھیں پھر کھل گئیں اور کانوں میں ٹھنسی ہوئی انگلیاں بھی باہر نکل آئیں اور وہ اپنی توجہ کو تمام اطراف سے سمیٹ کر ایک اس نقطے پہ لانے کی کوشش کرنے لگا کہ صبح کس حیلے اُسے کچھ پیسے دستیاب ہو سکتے ہیں؟ اس طرح تو کام نہیں چلے گا ـــ لیکن فوراً ہی بعد اُسے محسوس ہوا کہ اس وقت خصوصیت کے ساتھ کسی بھی ایک چیز

کے بارے میں کچھ سوچ سکنے کے عالم میں وہ نہیں۔ اس کا ذہن ٹھکانے پر نہیں۔ اور ذہن کا ایک آدھ لمحے کے لئے بھی ٹھکانے پر نہ ہونا ــــ اس کا تقریباً ہر روز ہی کا تجربہ تھا، متواتر کئی دنوں کے غیر معمولی کرب اور بے چینی کا موجب بن جاتا ہے ــــ وہ اب سوئے گا۔

لیکن بہزار کوشش اپنے آپ پر غنودگی کی کیفیت طاری کرنے میں وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے وہ پریشان اور ورد انگیز خیالات بدستور عجیب سرعت کے ساتھ اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لیتے گئے ذہن کو بیسیوں جھٹکے دینے کے بعد بالآخر تنگ آکر اس نے اپنے تئیں ان واضح اور غیر واضح سے خیالات کے سپرد کر دیا ــــ...

سپردگی کے عالم میں سب سے پہلے اس نے دیپو کے برہنہ جسم کو متعدد بھیڑیوں کے حلقے میں گھرے دیکھا جیسے اس کی بوٹی بوٹی نوچ لینے کی کوشش کو عمداً نامکمل چھوڑ دیا گیا ہو ــــ اس نے دیکھا کہ دیپو کے جسم سے جگہ جگہ خون رس رہا ہے اس کے رخساروں سے، اس کی چھاتیوں سے، اس کی رانوں سے خون کی دھاریں بہہ رہی ہیں، جوان اور صحت مند خون کی دھاریں۔ لیکن وہ خاموش ہے۔ خاموش، مبہوت اور ساکت۔ گویا اس کی قوتِ گویائی چھن گئی ہو۔ گویا وہ ایک بت، ایک بے جان لاش ہو ــــ پھر بھیڑیوں کا وہ ایڑیاں اُچھال اُچھال کر ناچتا اور وحشیانہ قہقہے اڑاتا ہوا ہجوم نہ جانے کہاں غائب ہوگیا اور اس نے دیکھا ــــ دیپو پوری پوشاک میں ملبوس ہے جس میں اس کے پیکر کا حسنِ ماہتاب برسوں اس کی پاکدامنی اور پاکبازی پر دلالت کرتا رہا تھا اور ایک نہایت ہی پُرسوز نغمہ اس کے لبوں پر تھرک رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ــــ لیکن نہیں، یہ اس کا واہمہ تھا۔ وہ دیپو نہ تھی، وہ اس کی اپنی بہن ساوتری تھی۔ ساوتری جو ہمیشہ اس سے شرماتی رہتی تھی۔ جس کی شادی کے بارے میں پچھلے برس ماں سے اس نے مشورہ کیا تھا۔ پھر دفعتاً ساوتری کی بغل سے

اس کی لاٹھی ٹیکتی ہوئی بوڑھی ماں بھی نمودار ہوگئی اور کہیں سے ننھا بھاشی بھی چلا آیا۔ ایک طرف سا وتری کو بغل میں لیئے اور دوسری طرف ننھے بھاشی کا ہاتھ تھامے ماں نے چلنا شروع کیا۔ ابھی انھوں نے دوسرا قدم ہی اُٹھایا تھا کہ یکلخت شور وشغب کا ایک طوفان اُمڈ آیا۔ تلواریں، نیزے اور برچھیاں چمکنے لگیں۔ بندوقوں اور بموں کے دھماکے زمین اور آسمان میں گونجنے لگے۔ اور نہ معلوم کہاں سے آ کر سنکے شاہ کے پرغضب الفاظ بھی اس کے کانوں میں پھٹنے لگے۔ ان ملیچھوں پر تمھارا ہاتھ نہیں اُٹھتا۔ ان ماں —— پرچھبوں نے تمھاری ماں، تمھاری جوان بہن، تمھارے معصوم بھائی ——"

نہیں —— وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھا اور دہشت ناک نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن اندھیرے میں اسے کچھ دکھائی نہ دیا —— فضا بدستور ساکن تھی —— ساکن اور تاریک۔

خیاباں
اکتوبر

خواجہ احمد عباس

معجزہ

چند گھنٹے ہی میں لاڈو دوائی کی زبانی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی۔ چھٹی کا دن تھا۔ لوگوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں رامو کے جھونپڑے کی طرف چل پڑیں کہ دیکھیں لاڈو ٹھیک کہتی ہے یا جھوٹ۔

"بھلا ایسا بھی کبھی ہو سکتا ہے؟"

"بھگوان کی لیلا ہے۔ بھیا جسے دینا چاہتا ہے چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"رامو کی بہو بڑی قسمت والی نکلی۔ ایک نہ دو......"

"ہی، ہی ہی"

"ابے دانت کیوں نکالتا ہے۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں میں سوچ رہا تھا۔ رامو دیکھنے میں تو یونہی لگتا ہے مریل سا۔ مگر بڑا مرد کا بچہ نکلا۔"

"سنا ہے سالا بڑا خوش ہے۔ سویرے سے بھنگ پیئے پڑا ہے۔"

"ہونا بھی چاہیئے، کچھ کر کے دکھایا ہے اس نے۔ ایک تو ہے۔ آج تک ایک بھی..."

"ارے تو اس میں اس نے کون سا تیر مارا ہے۔ شاباش تو اس کی بہو کو دینی چاہیئے"

"کیوں پنڈت جی ولایت میں بھی کبھی ہوا ہے ایسا۔"

"ارے وہ کیا کھا کے ہم ہندوستانیوں کا مقابلہ کریں گے۔ وہاں کے تو نہ مرد مرد ہیں نہ عورتیں عورتیں۔"

"پھر تو رامو کی بہو کا ساری دُنیا میں نام ہو جائے گا۔"

"اور کیا اور ساتھ میں ہمارے گاؤں کا۔"

اس دن پوسٹ آفس کا ہرکارہ جب یہ جاپور گاؤں میں چٹھیاں بانٹنے آیا تو اُس نے یہ خبر سُنی۔ شہر واپس جا کر اس نے اپنے پوسٹ ماسٹر کو سُنائی۔ پوسٹ ماسٹر نے اپنے پڑوس میں سول ہسپتال کے ڈاکٹر کندن لال کو جا سُنائی۔ نگر کانگریس کے چیئرمین لالہ بنسی دھر جو پُرانے بواسیر کے مریض تھے ڈاکٹر کے پاس اپنے لئے دوا لینے آئے تو انھوں نے یہ خبر سُنی۔ وہاں سے وہ سیدھے گاندھی گارڈن میں یومِ آزادی کے سلسلے میں ایک جلسے کی صدارت کرنے جا رہے تھے راستے میں انھیں منشی برج نرائن مل گئے۔ جو میونسپل اسکول میں پڑھاتے تھے۔ اور ساتھ میں "دیش دیپک" اخبار کے مقامی نمائندے بھی تھے۔ انھوں نے کہا۔ "لالہ جی آج تقریر میں جو کچھ کہنے والے ہیں وہ پہلے سے بتا دیجئے تو میں تار دیدوں۔ ورنہ جلسہ ختم ہوتے ہوتے دیر ہو جائے گی۔ پھر کل سویرے کے اخبار میں نہ چھپ سکے گی۔ لالہ جی نے فوراً جیب سے نکال کر اپنی تقریر کا لکھا ہوا خلاصہ منشی جی کو دیدیا۔ ادھر ادھر کی باتوں میں انھوں نے ڈاکٹر کی سُنی ہوئی خبر بھی منشی جی کو سُنا دی۔

"سچ لالہ جی؟ ..... مگر کیا ایسا ممکن ہے؟"

"ہاں بھائی ہو گا ہی ——— مجھے تو ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے۔"

"تب ضرور ٹھیک ہو گا۔ اتنا اسپیشل کیس ہے۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے خود کیا ہو گا۔"

"ہاں اور کیا۔"

اگلے دن "دیش دیپک" میں لالہ بنسی دھر کی تقریر کی رپورٹ تو نہ چھپی۔ مگر پہلے ہی صفحہ پہ

موٹی موٹی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی۔

"بھارت ماتا کو کسان عورت کی بھینٹ"

"پندرہ اگست کو پانچ بچوں کو جنم دیا"

"ہمارا نامہ نگار خصوصی مقیم بھیم نگر بذریعہ تار اطلاع دیتا ہے کہ قریب کے گاؤں پرجاپور میں ایک کسان عورت نے کل سویرے پورے پانچ بچوں کو جنم دیا ہے ان میں تین لڑکے ہیں، اور دو لڑکیاں ہیں۔ ماں اور بچے سب خیریت سے ہیں۔ بچوں کی پیدائش کے وقت بھیم نگر کے ڈاکٹر کندن لال موجود تھے اور ایسے مشکل "ڈیلوری کیس" کو خیریت سے سرانجام دینے کا سہرا انہی کے سر ہے۔ اس خبر سے پرجاپور میں ہی نہیں آس پاس کے سب قصبوں اور گاؤں میں خوشی اور حیرت کی لہریں دوڑ گئی ہیں۔ اور جوق در جوق لوگ ان پانچ بچوں اور ان کی ماں کو دیکھنے چلے جا رہے ہیں۔ بھیم پور شہر میں بھی اس خبر پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں اور بہت سے ایسے بھی ہیں جو سُنی سنائی باتوں پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں جب تک اس بات کی کسی سے تصدیق نہ کرالیں۔ اس سلسلے میں معزز شہریوں کا ایک وفد لالہ بنسی دھر صدر نگر کانگریس کمیٹی کی سرکردگی میں بہت جلد وہاں جا رہا ہے۔

بعض مذہبی حلقوں میں اس عجیب واقعہ کو کافی اہمیت دی جا رہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ پانچ جڑواں بچوں کا اکٹھا پیدا ہونا ایک معجزہ ہی ہو سکتا ہے۔ مگر قوم پرست اس "معجزے" کو خالص سیاسی رنگ میں دیکھ رہے ہیں۔ اور کل شام یوم آزادی کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے لالہ بنسی دھر نے فرمایا کہ "پرجاپور کے ہمارے ایک کسان بھائی رامو کی بہو نے پندرہ اگست کے مبارک دن پر پانچ بچوں کی انوکھی بھینٹ بھارت ماتا کے چرنوں میں رکھی ہے۔

"دیش دیپک" سے یہ خبر پریس ٹرسٹ اور دوسری خبر رساں ایجنسیوں کے ذریعے ہندوستان کے ساڑھے سات سو اخباروں میں چھپی۔ غیر ملکی نامہ نگاروں نے بھی فوراً تار کھڑکھڑائے اور چند گھنٹوں میں یہ خبر ساری دنیا میں پھیل گئی۔ ایک سو چھبیس ہندوستانی اخباروں اور پچپن غیر ملکی اخباروں

نے اس واقعہ پر ایڈیٹوریل لکھے ۔مشہور قوم پرست اخبار" کانگرس ٹائمز" نے لکھا ہے کہ ایک دیش بھگت کسان عورت نے ان جڑواں بچوں کو عین پندرہ اگست کے دن جنم دیکر بھارت ماتا کی سنتان میں پانچ جانوں کا اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ ثابت کر دیا کہ بھارت کے سب کسان آزادی کی قدر کرتے ہیں ۔ اور دل وجان سے اپنی قومی حکومت کے ساتھ ہیں ۔ ہم اپنے کسان بھائی راموا اور اس کی دھرم پتنی لاجو کو مبارک باد دیتے ہیں اور ان کی شاندار مثال کو کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں جو باتیں تو بڑی بڑی بناتے ہیں۔ مگر عمل کے میدان میں ایک چوہیا کا بچہ بھی پیدا نہیں کر سکتے ۔

ہفتہ وار " دیش سینک " نے ایک پُرجوش ایڈیٹوریل میں لکھا کہ " پانچ جڑواں بچے پیدا کر کے ہماری بہن لاجو نے ہماری لاج رکھ لی ہے ۔ ورنہ آج تک کینیڈا کے سامنے ہماری گردن شرم سے جھکی ہوئی تھی ۔ کینیڈا سے ایک ایجنسی نے اطلاع دی کہ کینیڈا کے ڈیون خاندان کی پانچوں جڑواں لڑکیوں نے پرجاپور کے جڑواں بچّوں کو مبارکباد کا تار بھیجا ہے ۔" بھارت بھیشم " نے لکھا ہے کہ کینیڈا والے یہ نہ سمجھیں کہ وہ ہم بھارت واسیوں کی برابری کر سکتے ہیں۔ پانچ جڑواں بچوں کو جنم دینا کوئی کمال کی بات نہیں ہے ۔ وہ یہ نہ بھولیں کہ ہماری ایک بہن نے جن پانچ بچوں کو جنم دیا ہے ان میں ایک نہ دو پورے تین لڑکے ہیں ۔ ایک اور اخبار " راشٹریہ سیوک " نے لکھا کہ " اگر سب بھارت کے رہنے والے راموا اور لاجو کے نقشِ قدم پر چلیں تو بہت جلد ہم بھارت واسیوں کی تعداد اتنی ہو جائے گی کہ ہم ساری دُنیا پر چھا جائیں گے ۔ ہم گورنمنٹ کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ماہر ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی مقرر کرے جو اس معاملے کی چھان بین کر کے ایسی تجویزیں پیش کرے جن سے ہر ہندوستانی شوہر راموا ور ہر ہندوستانی عورت لاجو بن سکے ۔

اس پر سوشلسٹ اخبار " جنتا گزٹ " نے اپنے ایڈیٹوریل میں لکھا کہ " ہمارے دیش کی آبادی پہلے ہی بہت بڑھی ہوئی ہے ۔ ملک میں کھانے کو غلّہ کافی نہیں ہے ۔ کیا اکھٹا پانچ

پانچ جڑواں بچے پیدا کرکے ہم بیکاری اور بھوک کو اور خوفناک بنانا چاہتے ہیں۔ گورنمنٹ ان ڈھکوسلوں سے عوام کی توجہ خوراک اور رہائش کی بنیادی مانگوں سے نہیں ہٹا سکتی۔"

کمیونسٹ ہفتہ وار "لال سلام" نے جنتا گزٹ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ کمیونسٹ سائنسدان لینن اور سٹالن کی قیادت میں مالتھس کے مکروہ اور رجعت پسند نظریئے کو مدت ہوئی غلط ثابت کر چکے ہیں۔ اگر ملک میں خوراک کی کمی ہے تو اس کی وجہ آبادی کی زیادتی نہیں ہے بلکہ نہرو اور پٹیل کی حکومت کی عوام دشمن پالیسی ہے جس کی وجہ سے بلیک مارکیٹ کے سانپوں کو دودھ پلایا جاتا ہے اور کسان اور مزدوروں کے بچے دودھ کے لئے بلکتے ہیں۔ ہم کامریڈ رامو اور کامریڈ لاجو کو سٹھی بھینچ کر لال سلام بھیجتے ہیں۔ اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ تلنگانہ سے لے کر تاشقند تک ساری دُنیا کے امن پسند عوام ان کو مبارک باد دے رہے ہیں کہ انھوں نے بڑھتی ہوئی جنتا کی فوج میں پانچ لال سپاہیوں کا اضافہ کیا ہے۔

شنکر ویکلی نے ایک کارٹون شائع کیا جس میں ایک کسان عورت اپنے پانچ جڑواں بچوں کے لئے راشن مانگ رہی ہے۔ اور اسے دیکھ کر خوراک کے منسٹر مسٹر منشی کی گاندھی ٹوپی گھبراہٹ کے مارے اُڑ گئی۔

"ڈیلی کال" کے ظریفانہ کالم "گپ شپ" میں یہ پیراگراف شائع ہوا۔

"اس خبر کی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئی کہ گورنمنٹ "خوراک اگاؤ" اور "پیڑ لگاؤ" کی تحریکوں کی ناکامی کے بعد "پانچ بچے پیدا کرو" کی تحریک چلانے کے امکانات پر غور کر رہی ہے۔

آل انڈیا وی مین کانفرنس نے "لاجو ڈے" منانے کا اعلان کیا۔ اور پریذیڈنٹ راجندر پرشاد نے رامو کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے صدر نے ایک بیان میں کہا کہ "جب تک بھارت میں رامو جیسے پُرش اور لاجو جیسی

استریاں ہیں۔ ہندو دھرم، ہندو جاتی، ہندو سنسکرتی پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔

روٹری کلب کے ایک جلسے میں ایک مشہور ڈاکٹر نے "پرجاپور کے جڑواں بچے اور اس واقعہ کی طبی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ نیویارک سے خبر آئی ہے کہ امریکہ کے چند ڈاکٹر ہوائی جہاز سے راموا ور لاجو کا طبی معائنہ کرنے کی غرض سے ہندوستان آرہے ہیں۔ ماسکو کے ایک اخبار نے اس خبر پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ دنیا کے سارے عوام کو امریکی ڈاکٹروں کی سامراجی سازش سے خبردار رہنا چاہیئے۔

لکھنؤ، ناگپور اور بمبئی میں تین نئی زچہ گاہوں کے نام لاجو کے نام پر" لاجو میٹرنٹی ہوم" رکھے گئے۔ امرناتھ کی یاترا سے لوٹ کر ایک جوگی مہاراج نے بیان دیا۔ کہ اکیس دن کی تپسیا کے بعد انھیں ایک گیان ہوا تھا کہ ایک کسان عورت پانچ بچے اکٹھے جنے گی اور ان میں سے ایک بھگوان کرشن کا اوتار ہوگا۔ اور اس کی پہچان یہ ہوگی کہ اس کے بائیں پیر پر ایک گول نشان ہوگا۔ اس پر بہت سے جوگی اور دھرم رکھشک پرجاپور پہنچے۔ اور بچوں کے پیروں کا معائنہ کیا۔ ان میں سے ایک نے اعلان کیا کہ" ہر بچے کے پیر پر ایک گول نشان ہے۔" ایک نے کہا کہ کسی کے پیر پر بھی نہیں ہے۔ اور باقی کی رائے تھی کہ صرف ایک کے پیر پر ہے۔ مگر وہ اس پر متفق نہ ہو سکے کہ کس بچے کے پیر پر ہے۔ کسی کو کسی بچے کے پیر پر یہ نشان نظر آتا کسی کو کسی کے۔

تبت سے ایک خبر آئی ـــ کہ وہاں ایک عورت نے پورے چھ بچوں کو اکٹھا جنم دیا ہے۔ مگر بعد میں اس کی تردید ہوگئی۔ پھر روس سے اطلاع آئی کہ سائبیریا میں ایک عورت نے سات بچے اکٹھے پیدا کیئے۔ مگر امریکی اخباروں نے فوراً اس کی تردید کردی۔

ایک ہفتے کے سب اخبار راموا ور لاجو کے بچوں کے ذکر سے بھرے رہے اور ایک اخبار نویس نے اندازہ لگایا کہ دنیا کے سب اخباروں میں اسّی ہزار پانچ سو سات کالم ان کے بارے میں شائع ہوئے تھے۔ اور اس طرح ان بچوں کو ایک کروڑ روپے کی مفت پبلسٹی

ملی تھی ۔

اس عرصے میں ہندوستان میں "راموﻻجو منڈل" کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی جس کی طرف سے برجاپور ایک ڈیپوٹیشن بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ۔ اس منڈل کے خرچ کے لئے ایک لاکھ روپے کی اپیل کی گئی اور بہت جلد اس سے نوّے ہزار روپے جمع ہو گئے ۔ اس میں دس ہزار کی رقم ایک مشہور قوم پرست سیٹھ نے دی جن کی سات بیویوں نے اسے ایک بچے کی بھینٹ بھی نہ دی تھی منڈل کی صدارت کے لئے لیڈی نیل کنٹھ سپاری والا چنی گئیں ۔ جو بیس سال کی ازدواجی زندگی کے ساتھ اب تک بے اولاد رہی تھیں ۔ اور بچوں کے بجائے کتّے پالتی تھیں ۔ ڈیپوٹیشن کے سات ممبر چُنے گئے ۔ جن میں ایک ڈاکٹر تھا ، ایک وکیل ، ایک پروفیسر ، تین کارخانوں کے مالک اور سوسائٹی کی معزز خواتین ، ایک من چلے رپورٹر نے ڈیپوٹیشن کے اراکین کے ناموں کا اعلان کرتے ہوئے لکھا کہ ان ساتوں کے کل ملا کر پانچ بچے تھے اور اس لحاظ سے وہ گویا مشترکہ طور پر بے شک راموا ور لاجو کی برابری کا دعویٰ کر سکتے تھے ۔

تیرہ ہزار روپے پر اس ڈیپوٹیشن کیلئے ایک ہوائی جہاز کرائے پر لیا گیا ۔ بارہ سو روپے کے ہار گجرے گلدستے وغیرہ راموا ور لاجو کے بچوں کے لئے خریدے گئے ۔ نو ہزار ڈیپوٹیشن کے اراکین کو سفر خرچ کے سلسلے میں دیا گیا ۔ سات ہزار منڈل کے دفتر کی "پگڑی" پر خرچ ہوا ۔ باقی روپے میں سے ایک ہزار کے کھلونے راموا ور لاجو کے بچوں کے لئے خریدے گئے ۔ جو ڈیپوٹیشن کے ممبر سیٹھ جوہری چند کے کارخانے میں بنے تھے ۔ اس طرح اس کارخانے کو نہ صرف چھ سو روپے کا منافع ہوا بلکہ جب ان کھلونوں کی تصویریں اخباروں میں شائع ہوئیں تو ہزاروں روپے کا اشتہار مُفت ہوا ۔ اور اس کارخانے کے کھلونوں کی بکری پہلے سے تگنی ہو گئی ۔ دو ہزار کے کپڑے راموا ور لاجو کے بچوں کے لئے سلوائے گئے جس میں سے کچھ روپیہ کروڑی مل کلاتھ مل کو ملا اور کچھ ٹیکا چند ٹیلرنگ ہاؤس کو ۔ غرض پورے نوّے ہزار کا حساب برابر کر کے یہ ڈیپوٹیشن بذریعہ ہوائی جہاز بھیم نگر پہنچا ۔ اور وہاں سے موٹروں میں سوار ہو کر برجاپور ۔ ساتھ میں کئی درجن رپورٹر اور

پریس فوٹوگرافر بھی تھے۔

جب ان موٹروں کا جلوس راموکے جھونپڑے کے قریب پہنچا تو آواز سن کر راموجھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ وہ حسبِ معمول بھنگ کے نشے میں چور تھا۔ اس کی آنکھیں لال ہورہی تھیں۔ اس بھیڑ کو دیکھ کر وہ لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کیوں؟ ..... کیا ہے؟"

لیڈی نیل کنٹھ سپاری والا نے فوراً ایڈریس پڑھنا شروع کیا "اس مبارک موقع پر ہم بھارت ماتا کے پینتیس کروڑ سپوتوں کی طرف سے شری راموا ورشریمتی لاجو کو مبارکباد دیتے ہیں۔ انھوں نے بیشک اس دیش کی شان کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ آج ہم شریمتی لاجو کے روپ میں بھارت ماتا کا روپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ پانچ بچے راموا ور لاجو ہی کی آنکھوں کے تارے نہیں سارے دیش کے راج دلارے ہیں وہ ہمارا انمول خزانہ ہیں۔ جس کو دیکھ کر ساری دنیا کی آنکھیں چکا چوند ہوئی جارہی ہیں۔ آج سے ان بچوں کی دیکھ بھال، ان کی تعلیم و تربیت ساری قوم کی ذمہ داری ہے۔ ہم شری راموا ور شریمتی لاجو سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ وہ یہ کھلونے اور کپڑے جو ان کے ہموطنوں نے ان کے لئے بھیجے ہیں۔ قبول کریں ......"

راموا ب تک ادھ کھلی آنکھوں سے اس مجمع کی طرف کھڑا دیکھ رہا تھا اب ایک خوفناک قہقہہ مار کر چلا پڑا ... "کھلونے! کپڑے! جاؤ — پہناؤ انھیں یہ کپڑے ....". لیڈی نیل کنٹھ سپاری والا کے ہاتھ سے ریشمی فراک چھین کر چیخا ... "لاجو — اری او لاجو ..... روتی کیوں ہے! دیکھ تیرے بچّے کے لئے یہ کیا کچھ لائے ہیں ..... ان بیچاروں کو دودھ نہیں ملا تو کیا ہوا۔ دوا نہیں ملی تو کیا ہوا جھونپڑے کی چھت ٹپکنے سے انھیں نمونیہ ہوگیا تو کیا ہوا — اری انھیں کفن تو ریشمی مل رہے ہیں —"

ڈیپوٹیشن کے ممبر بھونچکا ہو کر جھونپڑے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ لاجو منہ چھپائے کونے میں بیٹھی رو رہی ہے۔ اور سیلی زمین پر پانچ ننھی ننھی لاشیں چیتھڑوں میں لپٹی پڑی ہیں .....

ادبِ لطیف

ستمبر

راجندر سنگھ بیدی

بادل

آیئے آج میں آپ کو بادلوں کی ایک کہانی سناتا ہوں۔

مجھے بچپن ہی سے بادلوں میں دلچسپی رہی ہے۔ برسات کے دنوں میں یہ کسی طرح اُمڈ گھمڈ کر آسمان کے کسی کونے سے نکل آتے ہیں۔ اور بہت بڑے بڑے پہلوانوں کی طرح آکاش کے خوبصورت صاف ستھرے اور کھلے کھلے اکھاڑے میں دنگل کرتے ہیں۔ کبھی یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے چقماق کے دو بڑے پہاڑ ہیں جو آپس میں ٹکرا گئے ہیں۔ اور ایک ایسی آگ پیدا ہو گئی ہے جس سے آسمان کی ٹھنڈی نیلی دنیا جل کر خاکستر ہو جائے گی ..... جب گرجتے ہیں تو یوں سنائی دیتا ہے جیسے بادشاہت کے زمانہ کا کوئی نقیب پُر ہول آواز میں باادب باملاحظہ ہوشیار کی آواز بلند کرتا ہے اور کسی بہت بڑے ہلاکو یا نیرو کے آنے کی خبر دیتا ہے جس کے خوف سے بچھڑے اپنی ماں بختی ہوئی ماؤں کے تھنوں کے پاس دبک جاتے ہیں اور گاؤں میں مائیں اپنے بھائیوں کو اپنے بیٹوں سے الگ کر دیتی ہیں کیونکہ جب بجلی چمک رہی ہو اور بادل گرج رہے ہوں تو ماموں اور بھانجے کا ایک جگہ بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں ...... اور یا پھر سرما کے بادل کو لیجئے، جو بہت بڑا صوفی اور بہت حلیم الطبع 'بادل' ہوتا ہے۔ آسمان کے کسی گوشے میں چپکے سے پڑا رہتا ہے۔ ہوا

اور سورج کی کرنیں اس سے گدگدی کرتی ہیں اور اس کے ہونٹ ایک سنہری مسکراہٹ میں پھیل جاتے ہیں۔ پھر وہ ذرا سا اپنی جگہ سے سرکتا ہے۔ مشرقی تصوّر کے معشوق کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہے اس کے گلابی پاؤں زمین پر یوں پڑتے ہیں، جیسے رحمتِ ایزدی گنہگاروں پہ نازل ہوتی ہے۔"

بادلوں کے بارے میں میرا سب سے پہلا تصوّر ایک غبارے کا ہے۔ میری ماں مجھے آنگن میں لٹا کر کام کاج کے لئے چلی جاتیں اور میرا بھائی جو مجھ سے دو سال ہی بڑا تھا الگ کھاٹ کے پاس بیٹھا غباروں سے کھیلا کرتا........ آپ کہیں گے ماں کے کام کاج پر چلے جانے اور بھائی کے غبارے کے ساتھ کھیلنے کا شعور کس طرح پیدا ہوا تو میں یہ کہوں گا کہ میں آج کے شعور کے ساتھ اس زمانہ کی بات کر رہا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ آپ میرے ساتھ مل کر تھوڑا تصرف اور اضافہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً میری ماں اگر کام کاج پر نہ گئی ہوگی تو تمام رات میرے نیچے پوتڑے بدلنے اور میری "ہاں ہواں" کی وجہ سے جاگتے رہنے کے باعث سو رہی ہوگی اور میرا بھائی کاٹھ کا انجن چلا رہا ہوگا ــــ گویا آج کا شعور پیدا ہونے اور پیدا ہونے سے پہلے NATAL AND PRE NATAL کی داستان بیان کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے ورنہ اُس زمانے کی بات کہنے کے لئے میں "ہوں ہواں" سے زیادہ کیا عرض کر سکتا ہوں!

بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میرا بھائی غبارے کو ٹانگ کر کہیں چلا گیا یا شاید اسے بھی ساتھ ہی لیتا گیا لیکن غبارے کی رنگین دُنیا نے میرا ذہنی افق بڑا وسیع کر دیا اور اس کی حدیں آسمان سے جا ملیں۔

کیونکہ کھٹیا میں پڑا ہوا آس پاس کی ایک دو چیزوں کے سوا میں کچھ بھی تو نہ دیکھ سکتا تھا۔ میرے بھائی دھرم سنگھ کے غبارے ہر دو صورت میں میری سمجھ سے باہر تھے۔ لیکن بادلوں کے بڑے بڑے غبارے میری آنکھوں میں کھبتے جاتے تھے۔ میں ان سے

کھیلنے لگا۔ انھیں حاصل کرنے کے لئے مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے اپنی ہی ایک خوبصورت اور سبک سی دنیا آباد کرلی تھی۔ میں اس دُنیا میں تیر رہا تھا، اُڑ رہا تھا ان غباروں کے رنگ بازار کے بنے ہوئے غباروں سے کہیں زیادہ خوبصورت، کہیں زیادہ چمکیلے تھے۔ آخر بازار والے اپنے رنگ کہاں سے لاتے ہیں؟ تصور پرست انسان نیلا رنگ آسمان سے اُتار لیتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دوپٹے یا اوڑھنی میں لگا لیتا ہے...... ایسے ہی جیسے وہ کبھی کبھی میرے بادلوں کی گزرگاہ میں بسنے والے ستاروں کو پکڑ کر کسی دلہن کی زلفوں میں ٹانک دیتا ہے۔ وہ اُڑنے والے طوطوں کی چونچ سے سُرخی اور کھیتوں اور مرغزاروں سے سرسبزی اور لہک مستعار لے کر اپنی کسی منظورِ نظر کی چولی میں ڈال دیتا ہے ــــ اور پھر خود ہی دور بیٹھ کر اس سے مزے لیتا ہوا وفورِ جوش و مسرت سے رونے لگتا ہے۔

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب میری ماں میری "ہاں ہواں......" کو خاموش کرنے کے لئے ایک گھنٹی بجا دیتی تھی۔ گویا اب میرے ذہن کے فلم کی صدا بندی بھی ہوگئی، اور انسان نے مجھ گوشت اور پوست کے لوتھڑے میں ترقی کرلی۔ ان ہی دنوں شاید پڑوس میں شادی ہوئی اور شہنائی کی آواز نے مجھے متوجہ کیا۔ اور میرے افلاک کے گنبد میں ایک غلغلہ پیدا ہوا۔ پھر مندروں، کلیساؤں میں گھنٹے بجے، مسجدوں میں اذانیں بلند ہوئیں۔ لیکن اس سب ڈھول تاشوں، مردنگ نقاروں کی آواز مجھے بادل کی گرج میں سنائی دے جاتی تھی۔ گوشت اور پوست کا لوتھڑا پورا انسان بن کر جہاں بہت سی چیزیں حاصل کر لیتا ہے وہاں کچھ چیزوں کے بارے میں اپنا تصوّر کھو بھی بیٹھتا ہے۔ مثلاً اسے بادل کی گرج میں گھنٹی کی آواز سُنائی نہیں دیتی...... لیکن ایک بچے کو بادلوں میں ہاتھی بھی نظر آتے ہیں، خرگوش بھی اور بلیاں بھی۔ بادلوں میں شیر دھاڑتے ہیں، بندر گھرکیاں دیتے ہیں۔ اور پھر رنگا رنگ بلیاں نرم و نازک سی میاؤں میاؤں کرتی ہیں......

اور بچہ اپنے نئے حاصل کئے ہوئے تجربے سے خود ہی ڈرتا ہے ...... ابھی اس کا یقین راسخ نہیں ہوتا اور بھولی مائیں سمجھتی ہیں انھوں نے میاؤں کی آواز سے بچے کو ڈرا کر خاموش کردیا ہے۔ حتیٰ کہ اس آواز سے بچے کے دل میں سچ مچ ایک بڑا ردمانی سا خوف پیدا ہونے لگتا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں انسان گھنٹے کی آواز کی طرف اس لئے متوجہ ہوتا ہے کہ اس نے ازل کے روز ایک آواز سُنی تھی جسے سُننے کا وہ زندگی بھر متمنی رہتا ہے، اور وہ موسیقی کو پسند ہی اسلئے کرتا ہے کہ اس آواز اور موسیقی میں ایک مماثلت پائی جاتی ہے۔ مولانا روم کی مثنوی میں ہم ایسی ہی نے کی آواز سنتے ہیں اور دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کی کتابوں میں ایسے ہی شبد اور ایسے ہی ایک کلمہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لیکن ازل کا روز کسے کہتے ہیں سوائے اس اولین تجربے کے جب کہ بچے کے ذہنی جسم میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ اور جب وہ پہلی بار چیزوں کو حواس کی مدد سے محسوس کرتا ہے ہر نئی چیز اس کے لئے ایک معرکہ ہوتی ہے۔ اور ایک ایجاد اور تخلیق۔ اور ایجاد اور تخلیق سے بڑھ کر کسی خوبصورتی کا تصور نہیں باندھا جاسکتا، نہ اس سے بڑی موسیقی پیدا کی جاسکتی ہے۔ زندگی کو پا لینے اور سُن لینے سے الگ خدا اور اس کی آواز کی حقیقت کیا ہے۔ اولیں تجربے کے صوتی تغزل اور دیکھنے کے عظیم تاثر پر سر پیٹنے والوں سے کہہ دو تمہارا خدا ابن انسان ترقی کی پہلی منزل پر ہے۔ وہ اپنے گھٹنوں کے بل پر چلتا ہے۔ ابھی خام ہے۔ اسے ذرا بالغ تو ہونے دو۔ پورے شباب میں آنے دو۔ اس سے تمہارا خدا ہی خوبصورت ہو جائے گا۔ کیونکہ زندگی میں نیا تجربہ ہوتا ہے۔ ایجاد اور تخلیق کا عمل جاری رہتا ہے۔ مائیں ہمیشہ بچے پیدا کرتی ہیں اور ہر بچے کی پیدائش کے ساتھ ان کے چہرہ پر ایک اَن دیکھی، اَن سُنی چمک پیدا ہوتی ہے، ہمیشہ ایک نیا خدا ایک نئی دنیا نئے ممکنات لئے وجود میں آتا ہے۔

ہاں! بادلوں کی بات تو میں بھول ہی گیا اور غباروں کی بھی .... تھوڑی دیر کے بعد میں نے آکاش پر اُڑنے والے بادلوں کے غبارے ہاتھوں میں لے لئے۔ میرے والد بڑے

بیلون لے آئے اور میں ان سے کھیلنے لگا۔ تصور اور حقیقت کے اس تجربے کے بین بین میں گھٹنوں چلنے لگا۔ اب میری ضرورتیں زیادہ ہونے لگیں۔ دودھ کی حد سے گزر کر میں روٹی کے ٹکڑے منہ میں ڈالنے لگا۔ ماں کی چھاتی سے چُسر چُسر دودھ پینے کے ذائقے نے ایک نئی شکل لے لی۔ لیکن جانے مجھے کیوں محسوس ہونے لگا جیسے میں کچھ کھو بیٹھا ہوں۔ بات یہ تھی کہ ہر تجربہ کے بعد پہلا تجربہ میرے نزدیک باسی ہو جاتا تھا اور میں یکسر نئے تجربے کی طرف رجوع کرتا البتہ کبھی کبھی اس عافیت کو جو مجھے ماں کی گود میں دودھ پیتے وقت ملتی تھی حاصل کرنے کے لئے ہمک کر ماں کی طرف چلا جاتا۔ لیکن یہ ہمیشہ اس وقت ہوتا جب ہمارا کتا ڈبو بڑی بھوکی نگاہوں سے میری روٹی کی طرف دیکھتا یا ڈھیٹ سے کوّے اپنا نہایت بھدا سا راگ الاپتے ہوئے میرے بہت ہی قریب آ بیٹھتے۔

اب بادل میرے لئے ایک نئی دلچسپی رکھتے تھے۔ میں کھاٹ پر لیٹا ایک نئے ہی انداز، ایک نئے ہی فکر سے ان کی طرف دیکھا کرتا۔ اس سے پہلے صرف بادل ہی چلتے تھے اور میں چپ چاپ لیٹا رہتا تھا۔ اب میں بھی ہلتا تھا اور بادل بھی حرکت کرتے تھے۔ اسی طرح جیسے فلموں میں کیمرے کی دوہری حرکت دکھائی جاتی ہے۔ کیمرا اپنی بھی حرکت میں ہوتی ہے اور اس کا مضمون بھی متحرک ہوتا ہے۔

اب مجھے کھلونے ملنے لگے تھے اور ماں باپ مجھے گود میں اٹھا کر بازار بھی لے جانے لگے۔ بازار پہونچتے ہی میرے سب کھلونے متحرک ہو جاتے۔ اکثر وہ میری مخالف سمت میں چلتے چلتے میری نظروں سے دور ہو جاتے۔ وہ جسم۔ رفتار۔ فہم ہر لحاظ سے غیر متناسب نظر آتے تھے اور میری قدرت سے باہر تھے۔ لیکن بادلوں کے ساتھ میرا رشتہ الگ تھا۔ گھر میں پہونچ کر جب مجھے چارپائی پر لٹا دیا جاتا تو میں دیکھتا۔ آسمان پر بھی مٹھائی کی ایک دوکان کھلی ہے بس اشارہ کرنے کی دیر ہوتی ہے کہ آکاش کے اس بازار کی سجی سجائی دوکانوں میں جس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہوں وہی میرے منہ میں چلی آتی ہے...... کبھی کبھی میری ماں پاس سے

گزرتی ہوئی میری رال پونچھ دیتی۔ جب سے میں نے بازار کی دنیا دیکھی اور میرے والد میری صحت کے خیال سے یا پیسے نہ ہونے کے باعث کوئی چیز نہ خرید سکے۔ واقعات میں دوسروں کی مرضی بھی شامل ہونے لگی۔

ان دنوں مجھ پر خسرہ کا ایک شدید حملہ ہوا۔ گرمی دانے سے باہر نکل آئے۔ یہی منقیٰ وغیرہ گھول کر پلایا گیا لیکن طبیعت یکسر ٹھیک نہ ہوئی۔ اس کے بعد اسہال کی شکایت ہو گئی جلے ہوئے کیلے کی گھٹی دی گئی اور اس کے بعد میں تندرست اور چڑچڑا ہو گیا۔ بیماری کے دنوں میں ماں مجھے کلیجے سے لگائے رہتی تھیں۔ اکثر راتیں ـــــ گویا انھیں میرے تلف ہو جانے کا شدید خطرہ تھا۔ لیکن اب جبکہ میں قریب قریب صحت پا چکا تھا، رویا تو ماں نے مجھے اٹھا کر نیچے پٹخ دیا۔ اسی لئے نا کہ وہ مجھے اب خطرے سے باہر کر چکی تھیں۔ میرے باپ کو میرا شور ناپسند تھا۔ وہ کبھی کبھی میرے ایک چانٹا رسید کر دیتے.... اور پھر ماں اور باپ میں لڑائی ہوتی۔ وہ تو سبھی کچھ کہہ لیتیں اور کسی کو کچھ نہ کہنے دیتیں۔ لیکن جس دن سے ماں نے نیچے پھینکا، مجھے ایک عجیب ہی خطرے کا احساس ہوا۔ اس رات مجھے خواب آیا، بہت سے چوہے اکٹھے ہو کر آ گئے ہیں اور طاق پر جتنی شکر پڑی تھی اسے اُٹھائے لئے جا رہے ہیں۔ میں بہت کچھ ان کا راستہ روکنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن وہ نہیں رُک پاتے ہیں .... دوپہر کو کھانے کے بعد لیٹا تو بادلوں میں وہی ہاتھی نظر آیا جو میں نے چڑیا گھر میں دیکھا تھا لیکن اب اس کے اردگرد وہ پنجرا غائب تھا۔ اور وہ سیدھا میری طرف لپکا آ رہا تھا ــــ میں نے کہا "گج راج! پیچھے ہٹ جاؤ!" لیکن وہ نہ ہٹا ــــ میں نے گھبرا کر چیخ ماری۔ اس کے بعد میں ماں کی گود میں تھا۔

لیکن صحت پاتے ہی بادل بدستور پہلے کی طرح میرے مطیع ہو گئے۔ میں لیٹ کر انھیں چاروں کونوں سے اکٹھا کر لیتا۔ اور میں بے ڈر سے ہاتھی اور شیروں کو لڑا دیتا۔ اور پھر سمجھاتا لڑتے کیوں ہو۔ بسکٹ کھاؤ۔ اور وہ بسکٹ کھانے لگتے۔ اور کھلکھلا کر ہنس بھی دیتے۔ گویا کہہ رہے ہوں

ہم تو لڑتے اسی لیے تھے کہ تم ہمیں بسکٹ دے دو۔

کچھ دیر بعد ان پیاری پیاری شکلوں اور پیارے پیارے خیالوں میں تبدیلی ہوگئی۔ جب بھی میرا بھائی دھرم سنگھ مجھ سے کوئی چیز چھین لیتا تو میں زور زور سے رونے لگتا۔ میں نسبتاً ایک بڑی طاقت سے ٹکر نہ لے سکتا تھا اور رونا ہی واحد ایک طریقہ تھا جس سے میں ماں اور باپ ایسی برتر طاقتوں کی مدد مانگ سکتا تھا۔ کئی بار تو ماں میرے بھائی کو ڈانٹ دیتیں لیکن اکثر وہ کثیر بیونت میں مشغول رہتیں اور میری طرف توجہ نہ دے سکتیں۔ والد پوسٹ آفس میں کلرک تھے اور ان کی طرف سے سخت ہدایت تھی کہ دفتر میں مت آؤ۔ والد اپنے ایک بڑے افسر مسٹر کارڈیرو کے خوف کا ایک جذبے کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ گویا کارڈیرو ان ہی کا افسر نہ تھا۔ وہ میری والدہ اور ہم بچوں کا بھی افسر بن گیا تھا۔ ہم سب اس سے خائف تھے۔ اس لئے میں پہلے مسٹر کارڈیرو پوسٹ ماسٹر اور پھر اپنے والد کے خوف سے دفتر نہ جا سکتا تھا۔ حالانکہ دفتر گھر کے ساتھ متعلق تھا ـــــ چنانچہ میں اپنے بھائی، ایک بڑی طاقت سے نالاں بیٹھا آسمان پر بادل اکٹھے کرنے لگا۔ ان دنوں بہت برسات ہونے سے آسمان دُھل سا گیا تھا اور کہیں بادل کا کوئی ٹکڑا نظر نہ آتا تھا۔ میں پچھواڑے کی طرف سے باہر چلا گیا اور گھاس کے ان تختوں میں پہونچ گیا جہاں اس سے پہلے بارش کا پانی جمع رہتا تھا اور مینڈکوں کے لاتعداد انڈے ایک بہت بڑی جھلّی میں لپٹے پانی میں تیرتے رہتے تھے ـــــ یہ جگہ میرے لئے بہت رومانی تھی۔ یہیں شیشم کا وہ درخت کھڑا تھا جس کے نیچے میرے بھائی کو پیسے ملا کرتے تھے۔ میں اپنے بھائی کو بے حد خوش قسمت سمجھتا تھا ـــــ اسے اکثر پیسے پڑے مل جانے تھے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ پیسے چُراتا تھا۔ مگر مجھے ہمیشہ فریب میں رکھتا تھا۔ اس کا طریقہ بے حد دلچسپ تھا۔ وہ میری ماں کی طرح سمادھی لگا کر اس درخت کے نیچے بیٹھ جاتا اور منہ میں کسی منتر کا جاپ کرتا۔ اس کے بعد اُٹھتا اور زمین کو معمولی سا کریدتا اور پیسے نکل آتے۔ کتنی بار اس درخت کے نیچے میں نے بھی سمادھی لگائی اور اپنے بھگوان کے حضور میں اسی دولت کو

پا لینے کی پرار تھنا کی۔ اس آسان دولت کو جو صرف چوری کے ذریعہ حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اپنے بھیا کے خلاف کئی قسم کے غم و غصے میں مبتلا میں اس درخت کے پاس تقریباً کیچڑ میں بیٹھ گیا۔ جانے کہاں سے ابر اُمڈ آیا۔ اور میں نے دیکھا چھوٹا سا ایک ٹکڑا بچا بچا کنونٹ اسکول کی طرف جا رہا تھا اور ایک بڑا ٹکڑا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے بڑا ٹکڑا میرے والد کی شکل میں اور چھوٹا میرے بھائی کی صورت میں تبدیل ہو گیا اور میرے والد نے میرے آسمان پر میرے چھوٹے بھائی کو پکڑ لیا اور اس کے کان کھینچ کھینچ کے لال کر دیئے اور وہ چیز مجھے واپس دلا دی۔

ان ہی دنوں ماں نے مجھے کہانیاں سُنانا شروع کیں۔ کہانیوں میں مجھے کتنی دلچسپی تھی ۔ مجھے کیا معلوم کہ زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب انسان خود کہانی کا مضمون بن جاتا ہے۔ دوسروں کی باتیں سننا کتنا دلچسپ ہے لیکن اپنا باتوں کا مرکز بن جانا کتنا وحشت ناک ہوتا ہے۔ ایک کہانی جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مہابھارت کی کہانی کا اولین حصّہ تھا۔ اس کا ایک ٹکڑا اٹھا کر میں نے زندگی کا جزو بنا لیا۔ کیونکہ وہ حصہ میرے مکاشفوں سے زیادہ تعلق رکھتا تھا۔

وہ حصہ وہ ٹکڑا کیا تھا ـــــــــ کنس نے اپنی رعایا پہ بہت ظلم بپا کر رکھا تھا۔ ایک دن اسے پتہ چلا کہ اس کا جان لیوا اس کی اپنی بہن دیوکی کی کوکھ سے پیدا ہو گا۔ چنانچہ اس نے دیوکی کو اسی غرض سے قید کر لیا کہ اس کے بطن سے جو بھی بچہ پیدا ہو گا اسے مار ڈالے گا۔ جیل میں دیوکی اور واسدیو کے یہاں کرشن پیدا ہوئے لیکن راتوں رات کرشن کی جگہ ایک کنیا رکھ دی گئی ...... صبح پیدائش کی اطلاع پانے کے بعد کنس پہونچا۔ اس نے اس کنیا کو اٹھا کر سات بار اپنے سر کے گرد گھمایا ـــــــــ

جانے سات بار کیوں ؟ لیکن ماں اس بات پہ اصرار کیا کرتیں اور ہم بھی اسے تبدیل کرنے میں ایک بہت بڑا پاپ سمجھتے۔ چنانچہ کنس نے آٹھویں بار اس لڑکی کو زمین پر پٹخ دیا۔

لیکن وہ لڑکی مرنے کے بجائے اوپر آسمان کی طرف اُڑ گئی ...... آسمانوں سے آواز آئی آکاش وانی ہوئی ...... اے کنس تیرے ظلم و ستم کی انتہا ہو گئی۔ تو نہیں جانتا۔ تیرا جان لیوا زندہ ہے اور گوکل کی گلیوں میں پل رہا ہے ــــ وہ تجھے مارے گا اور اوشیہ مارے گا! .....

آکاش وانی ــــ! اس نے میرے ذہنی جسم میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا کر دیا یوں معلوم ہوا جیسے سمندر میں کوئی بہت بڑا پہاڑ گر گیا ہے اور اس سے بہت بڑی بڑی لہریں پیدا ہو گئی ہیں۔ آکاش وانی ــــ دیوکی کی لڑکی مہا مایا ــــ میری ماں ..... یہ سب ایک نہ بھولنے والے افسانے سے متعلق ہو گئے تھے۔ اور اس افسانے کا تعلق اسی آکاش سے تھا جہاں سے مارنے اور بچا دینے کی آوازیں آتی ہیں۔ جہاں بھگوان کہیں کسی چاند ستارے یا بہت بڑے بادل کے پیچھے بیٹھا انصاف یا بے انصافی کر رہا ہے۔

اب میرے پاس بہت بڑا ہتھیار تھا۔ آکاش وانی .... ایک بہت بڑا آسمانی بھونپو جسے سُن کر خود میرے اپنے جسم میں کپکپی پیدا ہوتی تھی۔ ہمارے گھر میں جھگڑے عجیب قسم کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً میری ماں اس وقت تک کھانا نہ کھاتیں جب تک میرے والد نہ کھا لیتے۔ میرے والد اکثر ماں کو منع کیا کرتے تھے اور کہتے تھے۔ تو ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔ کھانا تو وقت پر کھا لیا کر۔ لیکن جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ اس بات کو دل ہی دل میں پسند کرتے تھے اور ماں شوہر پرستی کے جذبے سے کم اور ایک ڈسپلن کے جذبے سے زیادہ اس چیز پر سختی سے عمل کرتی۔ ایک دن بڑا جھگڑا ہوا اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی بنا یہی تھی کہ عورت ہونے کے ناطے اس نے میرے حکم کو نہیں مانا ..... چنانچہ برتن پھینکے گئے، پلیٹیں توڑ دی گئیں۔ میرے والد ایک بادل کی طرح گرجے، ماں بجلی کی طرح کڑکیں اور روئیں ــــ اور والد نے زور سے ایک چپت میری ماں کے رسید کر دی۔ اس وقت میرا بھائی، میں ــــ اور میرے بعد میں آنے والے بہن اور بھائی ایک کونے میں دبکے

کانپ رہے تھے ..... ماں روئیں۔ انھوں نے اپنے ہی بال نوچ لیے اور اسی قسم کی منفی مدافعت نے باپ کے جسم میں بھی لرزہ سا پیدا کر دیا۔

مجھے ماں کے ساتھ کتنی ہمدردی تھی۔ میں نے پڑوس میں بھی اوورسیر گنگا رام کو اپنی بیوی کو پیٹتے دیکھا تھا۔ اور میں سوچتا تھا یہ مرد عورتوں کو کیوں مارتے ہیں ان پر کیوں ظلم کرتے ہیں۔ اور یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔ جہاں مرد جسمانی اذیت نہیں دیتے وہاں انھیں ایسے روحانی عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے سر کے بال نوچتے نوچتے پاگل ہو جاتی ہیں۔ میں اپنی ماں کو زیادہ نہ بچا سکتا تھا۔ جوں ہی والدہ کا غصہ کم ہوا۔ میں اپنے کمرے سے نکل بھاگا۔ جانے مجھے کیوں یہ احساس تھا۔ ماں کو مارنے کے بعد والد اب ہم سب بچوں کو پیٹیں گے ...... میں آنگن سے باہر نکل کر پھر شیشم کے پیڑ کے پاس پہونچ گیا اور لگا آسمان کی طرف دیکھنے ...... آکاش وانی شروع ہو گئی۔ اے مرد تیرے ظلم کے دن پورے ہو گئے ہیں ــــ اب تو زیادہ دیر ظلم وستم کا یہ کھیل جاری نہ رکھ سکے گا۔ اس دن آسمان کے ایک کونے میں سے ع۱ کارڈیرو نکل آیا۔ اور اس نے میرے بوڑھے والد کو پیٹنا شروع کیا۔ ان کی پگڑی اُچھل کر دُور جا پڑی۔ بال منتشر ہو گئے ــــ والد کی یہ حالت دیکھ کر میں بے اختیار رونے لگا۔ ترحم کے ایک سیلاب میں میں خود بھی بہہ گیا۔ کارڈیرو کی منت سماجت کرتے ہوئے میں نے کہا ــــ اب چھوڑ دو، اب یہ ماں کو نہیں ماریںگے اور مسٹر کارڈیرو نے میرے والد کو چھوڑ دیا۔

گھر لوٹا تو دیکھا والد سچ مچ ہی میری والدہ کو منا رہے تھے۔ اور وعدہ کر رہے تھے آج رات تجھے سارا ٹاڈ راجستھان پڑھ کر سنائیں گے۔ میں نے سوچا شاید میری ہی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ میں ایک فتح مندی اور نصرت کے احساس سے گھومنے لگا۔

لیکن ایک ایسا وقت آیا جب بادلوں نے میری متابعت کرنے سے انکار کر دیا۔

بچپن میں زندگی سدا بہار ایک نت نیا تجربہ ہوتی ہے اس لیے شاید بادل ہمیشہ میری مدد

کے لئے آسمان پر موجود ہوا کرتے تھے۔ سال میں چار ہی موسم تو ہوتے ہیں۔ سردی، گرمی، بہار اور خزاں ـــــ اور ان کے درمیان کبھی کبھی برسات ہو جاتی ہے۔ لیکن بیشتر اس قسم کے دن آتے ہیں۔ جب کہ ہم اپنے تخیّل کی لمبی سے لمبی لاٹھی کے ساتھ بھی بادلوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے۔

مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک آسمان ایک چٹیل اور نیلا سا میدان نظر آتا ہے۔ نظریں جس کی مسافت کرتے ہوئے تھک جاتی ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کسی نئے تجربے کے سوتے رُک جاتے ہیں۔ زندگی میں ایک ناخوشگوار سی ہمواری اور یکسانیت آ جاتی ہے۔ اس وقت کائنات کی کوئی چیز ہماری مدد کو نہیں آتی ایک عجیب طرح کا اُمس پیدا ہوتا ہے اور پسینے کی گوندسی ہر لحظہ کپڑوں کو جسم سے چپکائے رہتی ہے اور یا برعکس اس کے اتنی سردی ہوتی ہے کہ الفاظ مُنہ سے نکل کر جم جاتے ہیں اور سننے والوں کو سمجھنے کی غرض سے الفاظ کی ان منجمد ڈلیوں کو کسی فرائی پان میں پگھلانا پڑتا ہے لیکن جوں ہی نیا تجربہ ہوتا ہے، بادل نمودار ہوتے ہیں اور آپ اپنے ہاتھوں سے انھیں نئی نئی شکلیں دے سکتے ہیں۔

البتہ کبھی کبھی آپ شہزادہ سدارتھ کی طرح اپنے ہاتھی دانت کے محل سے تفریح کی غرض سے نکلتے ہیں اور دیکھتے ہیں آپ کا کپل وستو ایک ایسا شہر نہیں ہے جیسا کہ سدارتھ کے باپ نے اسے دکھانے کی کوشش کی تھی۔ اس میں بیمار، لنگڑے اور کوڑھی بھی ہیں۔ اور انسان مر بھی جاتا ہے۔ اس وقت آپ اس دنیا سے بیزار ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں ایسا کیوں ہے؟ کیوں کچھ انسان سارا دن محنت کرتے ہیں اور شام کو انھیں روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ اور کچھ تھوڑے کام سے زیادہ منافع حاصل کرتے ہیں۔ کہیں تو نرد آرٹسٹ گھومتے نظر آتے ہیں اور کہیں کیلکو مِل سے رنگا ہوا کا مگار نکلتا ہے تو وہ ایک ایسا گیدڑ معلوم ہوتا ہے جو زر حاصل کرنے کی ہوس میں رنگ کے ایک پہاڑ میں گر جاتا ہے اور جب باہر نکلتا ہے تو اس کی شکل اس قدر تبدیل ہو جاتی ہے کہ اس کے ساتھی گیدڑ نہ صرف

اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہی گوارا نہیں کرتے ــــــ بلکہ اسے کاٹ کاٹ کر اپنے حلقۂ احباب سے باہر نکال دیتے ہیں۔

میں نے یہ سب کچھ اکثر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آسمان کی طرف رجوع کیا۔ ایسے موقع پر میں نے ہمیشہ آسمان پر بادل دیکھے ــــ آپ نے بھی اکثر یہ بادل دیکھے ہیں اور اکثر یہ جملہ استعمال کیا ہے۔ فلاں فلاں آدمی پر مصیبت کی گھٹائیں ٹوٹ پڑیں ــــ یا آسمان پر جنگ کے بادل چھا گئے۔

اور میں نے اس ابر، اس بادل، اس گھٹا کو ٹوٹتے اور چھا جاتے دیکھا۔ اگرچہ میں نے اپنے تصوّر میں بارش کے ہر قطرے کو چاندی اور سکّہ کی صورت میں ٹپکتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ بارش ہی تھی ــــ پانی کے سینہ میں دبی ہوئی آگ۔ سمندر کا بڑا نل جو کہیں تو کھیتوں میں ہریالی لے آتا ہے۔ اور کہیں انھیں خس و خاشاک کر دیتا ہے اور یا پھر سیلاب کی صورت میں آ کر ہزاروں لوگوں کو گھر سے بے گھر کر ڈالتا ہے.....

ان سب کو دیکھ کر مہاتما بدھ بودھی کے درخت تلے جا بیٹھے اور میں نے محبت کر لی۔

ان دنوں کالج میں گرمی کی چھٹیاں تھیں اور ہم شہر سے گاؤں چلے گئے تھے۔ گاؤں میں جاٹ ایکھ کاٹنے کو تیار ہو رہے تھے۔ کہیں کہیں ایکھ کٹ چکی تھی اور بیلنوں میں سے رس نکل رہا تھا اور السائے ہوئے کسانوں نے کہیں کہیں کھیتوں میں شراب نکالنے کے لئے گڑ کو مٹکوں میں ڈال کر زمین میں بند کر دیا تھا اور اس پر کیکر چھال اور ہر قسم کی الا بلا ڈال دی تھی ــــ لیکن وہ شراب اپنے آپ مٹکوں سے باہر نکل آئی اور ہوا میں گھر کر گئی...... گاؤں کے کنوارے شہوت کے شعلے بھڑکاتے ہوئے راہ رووں کی طرح اِدھر اُدھر گھومنے لگے تھے۔ اور ایک اندھے کی طرح منزل کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے لگے ــــ ایسے رنگین دن بے سائے اور بن بے کیف ہو گئے کیونکہ جس لڑکی سے میں محبت کرتا تھا۔ وہ شہر میں رہتی تھی...... میں اپنے بدن کی حدت سے گھبرا کر

باہر نکلا اور بھنکارتا ہوا کسی ٹھنڈی جگہ کی تلاش میں چل نکلا۔ اور ہوتے ہوتے اپنے جدّی کنوئیں "سمادھاں والا" پہونچ گیا۔ وہاں اپنی "گڑھ" کے پاس بیٹھے مزارع لوگ کھلے بندوں پی رہے تھے اور گا رہے تھے ——

لاٹ ٹنج دا مورنی جے خُشیاں وچ آجائے
بتّی چک تے صوبے سارے میرے ناں لوا جائے
رشتے داراں آہلیاں نوں باہنوں پھڑ کے نار دیاں
بشن سنگھ ٹھیکیدار نوں پھاہے لا کے مار دیاں

لیکن مجھے ان کی باتوں میں دلچسپی دکھائی نہ دی۔ اسی کنوئیں پر میرے بزرگ نارائن سنگھ کی سمادھی تھی اور ارد گرد بڑے بڑے درختوں کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں ہونے کے کارن ہم نے اس کا نام "شملہ" رکھ دیا تھا۔ کیونکہ شملہ جانے کی توفیق نہ ہوتی تھی۔ وہاں سمادھی کی سن اور بونگ اور سونے سے بنی ہوئی منڈیر پر لیٹ کر دوسری گاؤں کی طرف دیکھا تو ایک بادل نظر آنے لگا۔ جس کی شکل بالکل میری محبوبہ کی شکل سے ملتی تھی۔ وہی مدوّر سا چہرہ —— جانے کسی نے پرکار لے کر دائرہ بنا دیا ہو۔ بڑی بڑی اور روشن آنکھیں۔ ہونٹوں کی دو کمانیں جن کے چلّے چڑھے ہوئے تھے ...... بدن پر کالی کریپ میں سے گوری سی گردن اُبھری ہوئی اس پر ایک سبک سی لاکٹ کی زنجیر نظر آنے لگی۔ اور ایک ادا کے ساتھ کمر سے لے کر پاؤں تک گرنے والی شلوار میں سے گلابی ٹخنے جھانکنے لگے —— اور اس کے بعد میں نے واویلا کر کے گھر کے سب لوگوں کو شہر جانے پر مجبور کر دیا۔

لیکن ہائے وہ گلابی سا نشہ جو دیر تک قائم نہ رہا۔ ہم نے بھی پی لیکن سستی سی جو کشید کرنے والے نے کسی سماجی خوف کی بنا پر، دنوں میں نکالنے کے بجائے، نشادر وغیرہ کی مدد سے گھنٹوں ہی میں نکال لی —— جو چھوتے ہی سر کو گئی لیکن دم بھر میں اُتر بھی گئی اور جسم کو ایک اضمحلال، ایک تھکن میں ٹوٹتے چھوڑ گئی —— ہمارا "رشتہ" ٹوٹ گیا

کیونکہ میں کھتری تھا اور وہ براہمن تھی۔ میرے والد ڈاک خانے کے کلرک تھے اور اس کا والد سول سکریٹریٹ کا سپرنٹنڈنٹ جس سے کسی وقت میں سب جج بن جانے کا خطرہ تھا...... اور اس کے بعد میرے آسمانوں سے پانی پڑنے لگا اور زمانے بھر میں مشہور ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

اب تک میں روزگار کے سلسلے میں باپ کے پیشے کو اپنا چکا تھا لیکن ساتھ ہی میں نے لکھنے لکھانے کا شغل بھی شروع کر دیا۔ میں نے اپنی محبوبہ کو، اپنے کھوئے ہوئے ماں باپ کو، اپنوں اور کامگاروں کو اپنے افسانوں میں پالیا۔ ان لُٹے نُچے لوگوں مجبور بوڑھوں، بیکس بیواؤں کے ساتھ مجھے کتنی ہمدردی ہوتی تھی۔ میں کوٹھے والیوں کے کاروبار اور حرامی بچوں کی تولید میں ان کا قصور ڈھونڈھتا۔ میں اپنے افسانوں سے کسی کو رُلاتا اور خود بھی روتا ــــ اور خود ہی ققنس کی طرح اپنی ہی راکھ سے اُٹھ کھڑا ہوتا.... اور میرے ساتھ ہی ان مظلوموں اور بیکسوں کا لشکر کھڑا ہو جاتا۔ اور میں اپنے دوستوں اور مذہبی پنڈتوں سے پوچھتا ــــ حشر کا دن کسے کہتے ہیں؟ رست وخیز کیا بلا ہے سوائے اسکے کہ انسان ظلم سہہ سہہ کر خاک ہو جاتا ہے تو اپنی ہی خاک سے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اسے آپ رست وخیز کہتے ہیں۔ میں اسے انقلاب کا نام دیتا ہوں۔ جس طرح پریوں کے لئے کہانیاں لکھنے والے بادل میں انسان کے اُڑنے کا تصور زندہ تھا یا جس طرح کیمیا گروں کی حکایتوں میں کسی سستی دھات سے سونا بنا لینے کا تصور مقید تھا۔ جسے آج کے سائنسدانوں نے ایٹم کی بمباری کے بعد ممکن بنا دیا اسی طرح انقلاب کا تصور بھی ایک مبہم سی صورت میں انسان کے دماغ میں مذہب کی "صبح ازل" سے قائم تھا...... ان لوگوں کے ساتھ مرنے اور جینے کے بعد مجھے یوں معلوم ہونے لگا اب کے جو ترتیبِ گلستاں ہوگی، اس میں میرا بھی ہاتھ ہوگا۔ اور لکھنے کے اس تجربے نے میرے سامنے ایک ایسی دنیا کے امکانات کھول دئے جو میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ میں فرصت سے بیٹھا آسمان کی طرف

دیکھا کرتا تھا اور بدستور اپنی مرضی سے آکاش پر اُڑتے ہوئے روئی کے بڑے بڑے گالوں کی تشویش کیا کرتا۔

لیکن یکایک پچھم سے ایک گھٹا اُمڈی ـــــ وہی گھٹا جسے آپ جنگ کے بادل کہتے ہیں۔ بادل کا وہ ٹکڑا جسے میری حمایت حاصل تھی جیت تو گیا لیکن جانے کتنی مخلوق تھی جو سامراجیت کی نذر کرنا پڑی۔ دُنیا بھر میں تخلیقی عمل رُک گیا تخریب نے اس کی جگہ لے لی فرصت نہ رہی کوئی لیٹ کر آسمان پر نگاہ ڈال سکے۔ سامراجیوں نے بیکاری کا علاج ڈھونڈ لیا اور اس بات کو بھول گئے کہ جنگ کے بعد جو بیکاری ہوگی اس کا وہ کوئی علاج نہ ڈھونڈھ سکیں گے تاوقتیکہ وہ ایک تیسری جنگ کا نعرہ نہ دیں۔ یا شاید وہ اس کے لئے تیار تھے۔ چیزیں بے حد مہنگی ہونا شروع ہو گئیں۔ امیر اور امیر ہو گئے اور غریب زیادہ غریب ـــــ سماجی نظام درہم برہم ہو گیا ...... اور اب کے بادل کچھ یوں چھٹ گئے کہ پھر اکٹھے نہ ہوئے۔ ایک بے ابر کا آسمان تھا جو سالہا سال تک دکھائی دیتا رہا اور یوں معلوم ہونے لگا کہ ایک نا ختم ہونے والی خزاں گرما، سرما، بہار اور برسات پر چھا گئی ہے اور ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور بچپن میں جس طرح ہم اپنی مرضی سے بادلوں کی اس فوج کو چپ راست چپ راست کروایا کرتے تھے، اب نہیں کروا سکتے۔

کئی سال میں نے کچھ نہ لکھا اپنے سیاسی اور سماجی نظام میں ہماری حالت اسی رستم کی سی ہو گئی جس نے اپنے بیٹے سے پچھاڑ کھائی تھی۔ پچھاڑ کھانے کے بعد وہ اپنے خیمے میں داخل ہوا اور بے تحاشا رو دیا اور اس نے خدا سے کہا ـــــ خدایا! کوئی وقت تھا کہ میں چلتا تھا اور زمین میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ میری وہ طاقت کیا ہوئی! اے دو جہاں کے مالک! کیا تو میری کھوئی ہوئی طاقت اور عظمت واپس نہ دے گا۔ دوسرے دن افراسیاب نے پھر رستم کو سہراب کے ساتھ لڑنے کے لئے بھیجا۔ اور رستم نے

سہراب کو گرادیا اور رستم کا اشارہ پانے پر اس کے پیٹ میں چھری گھونپ دی اور جب وہ اس کا کام تمام کر چکا تو اسے پتہ چلا —— بادشاہوں کے اس کھیل میں اس نے اپنے ہی بیٹے، اپنے ہی جگر میں چھُری گھونپ دی ہے —— رستم رو رہا تھا اور دُور کھڑا افراسیاب مسکرا رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا کہ اب یہ دو بڑے پہلوان اکٹھے نہ ہو سکیں گے اور حکومت کا تختہ نہ اُلٹ سکیں گے۔

لیکن ہم رستم کے زمانے سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اب باپ اور بیٹا ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور وہ کسی ہندوستانی، برطانوی یا امریکی افراسیاب کے اشارے پر اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی باپ کا گلا نہیں کاٹیں گے —— ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ یہ بادل جن پر ہماری قدرت نہ رہی تھی، پھر اسی طرح انسان کے مطیع ہو گئے ہیں۔ اور ایک بچے کا خواب پُورا ہوتا نظر آتا ہے...... اگر یہ بادل سائبیریا کے میدانوں کو مرغزار بنا سکتے ہیں تو ہندوستان کے ریگستانوں کو ہریالے کیوں نہیں کر سکتے؟

محاذ

یکم فروری

مریاض روفی

زندگی کی راہ پر

رات آدھی سے زیادہ نکل گئی تھی ـــــ اور وہ دونوں اس کچی سڑک پر جو گاؤں سے ندی کی طرف جاتی تھی، تیز تیز چلے جا رہے تھے۔

چاند اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ کبھی کبھی بادل کا کوئی ٹکڑا اُس کے چہرے پر ایک ہلکی سی نقاب ڈال دیتا، چاندنی وتاریکی ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو جاتے۔ روشنی مدھم پڑ جاتی۔ مگر چند لمحوں کے بعد چاند اس بے طلب ناخوشگوار نقاب کو اُتار پھینکتا۔ اور پھر دُور دُور تک نور کا سیلاب دوڑنے لگتا۔ اطراف کے کھیتوں میں کھڑی فصل انگڑائی لیتی اور ان کی پیلی بالیاں، مندر کے نقرئی کلسوں کی طرح جگمگا اُٹھتیں۔

وہ دونوں تیز تیز چلے جا رہے تھے۔ ان کے جسم دُبلے پتلے تھے اور سادہ سفید لباس میں ملبوس۔ ایک شخص دراز قامت تھا۔ اس نے آنکھوں پر عینک لگا رکھی تھی اور ہاتھ میں ایک چمڑے کا بستہ لئے ہوئے تھا۔ دوسرے شخص کا قد درمیانہ تھا۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ایک سوتی سفید گلوبند کو سر پر لپیٹ کر گلے میں باندھ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹی بید تھی۔

وہ دونوں کافی فکرمند و پریشان نظر آتے تھے۔ طویل قامت شخص کچھ زیادہ سراسیمہ

معلوم ہوتا تھا۔ وہ ہوا کی سرسراہٹ اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سے چونک اُٹھتا۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتا اور بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ دوسرا شخص متفکر ہونے کے باوجود، کچھ بے نیاز سا معلوم ہوتا تھا ـــــ وہ خاموشی سے سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔

اس طویل خاموشی اور پریشانی سے اُکتا کر طویل قامت والے نے جیب سے بیڑی نکالی اور اپنے ساتھی سے پوچھا ـــــ "بیڑی پیو گے؟"

"نہیں!" اس نے بغیر سر اُٹھائے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ پہلے شخص نے جب بیڑی سلگانا چاہی تو اس کے ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبایا ـــــ "نہیں" ـــــ اس کا لہجہ کافی سنجیدہ تھا ـــــ "نہیں! یہ وقت مناسب نہیں"۔ دوسرے شخص نے بیڑی جیب میں رکھ لی۔ اور وہ خاموش سر جھکائے تیز تیز چلتے رہے مگر پہلے شخص کی پریشانیاں بدستور قائم تھیں۔

چاند نے اپنے چہرے سے ایک دبیز نقاب اُتار پھینکی۔ ہر طرف چاندنی پھیل گئی۔ پہلا شخص کچھ زیادہ پریشان ہو گیا اور وہ اور تیز تیز چلنے لگے۔

رات کی خاموشی ان کے حواس پر ایک وزنی بوجھ بنتی جا رہی تھی۔ اس طویل خاموشی میں ہوا کی سرسراہٹ اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ بھی ان کے لئے تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی لیکن اب ہوا میں خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ اب انھیں جھینگروں کے شور کی صدائیں سُنائی دے رہی تھیں۔ جو شاید دریا کی روانی کے سترنم نغمے سے ہم آہنگ ہونے کی بے سود کوشش کر رہے تھے۔ دریا کے دوسرے کنارے سے گیدڑوں کے شور وغل کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ یہ سب آثار ظاہر کرتے تھے کہ دریا کا کنارہ قریب آ چکا ہے ـــــ لیکن یہ چوکنا خاموشی اور تیز تیز چلنا ہی اُن کے لئے کافی پریشان کن تھا۔ درمیانہ قد والے کو اس حقیقت کا احساس ہو گیا اس نے سوچا کہ اگر کوئی گفتگو کی جائے تو راستہ بھی اطمینان سے طے ہو جائے گا اور ان کی پریشانیاں جن میں اس سناٹے نے مزید اضافہ کر دیا ہے کسی حد تک

دور ہوجائیں گی۔ اس نے بغیر سر اُٹھائے مطمئن لہجے میں اپنے ساتھی سے دریافت کیا:۔

"ہاں تو تم بیڑی پینا چاہتے تھے ـــــ لاؤ! ـــ ایک مجھے بھی دو۔"

انھوں نے بیڑیاں سُلگائیں ـــــ بیڑی کا ایک کش لیکر دھواں چاند کی طرف پھینکتے ہوئے اس نے کہا:۔

"ہماری شاعری میں ـــــ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ہر ملک کی رومانی شاعری میں، چاند اور چاندنی کے متعلق کیسی کیسی حسین تشبیہات و نازک خیالات کی بھرمار ہے ـــ اور میں بھی تو گوشت پوست کا بنا ہوا ہوں۔ کبھی کبھی مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ یہ لطیف شعاعیں براہ راست ہمارے حواس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان شعاعوں میں کوئی ایسی برقی لہر ہوتی ہے جو ہمارے جذبات کو مشتعل کردیتی ہے۔ ہمارے ذہن پر ایک عجیب بیخودی کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے ـــ اور ـــ مگر آج، یہ چاندنی! ـــ اُف! ـــ یہ چاندنی کس قدر وحشتناک ہے! ـــ کسقدر سفاک!!"

"اس وقت مجھے جمیل یاد آرہا ہے" لانبے قدوالے نے کچھ سوچتے ہوئے مسکراکر کہا ـــ وہ کالج میں ہمارے ساتھ پڑھتا تھا۔ شاعر تھا بیچارہ۔ اختر شیرانی کی طرز پر نظمیں کہا کرتا تھا۔ گاؤں میں اپنی کسی رشتہ کی چچازاد بہن سے عشق بھی کر رکھا تھا اس نے، ایکمرتبہ جب وہ چھٹیوں کے بعد گھر سے کالج واپس آیا تو اس نے ہمیں ایک نئی نظم سُنائی ـــ کہنے لگا اس نظم میں میں نے جو بات پیش کی ہے اس سے پہلے کسی شاعر نے نہیں کی ـــ"

یہ کہتے کہتے وہ اچانک خاموش ہوگیا اسے کسی کے پیروں کی چاپ سُنائی دی۔ وہ چاروں طرف مُڑ مُڑ کر دیکھنے لگا۔ وہ رُکنا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا ـــ "چلتے رہو! رُکنے کی ضرورت نہیں ـــ ہاں! تو اس نے اس نظم میں کونسی ایسی جدت پیش کی تھی؟"

"اس نے وہ نظم ایک واقعہ سے متاثر ہوکر لکھی تھی۔ اس کی محبوبہ نے گاؤں سے

باہر قبرستان کے پیچھے کی نہر کے کنارے رات کے دو بجے اس سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ جون کا مہینہ تھا۔ کبھی چاند پر بادل چھا جاتے تھے۔ کبھی ہر طرف چاندنی پھیل جاتی تھی۔۔۔ وہ تین بجے رات تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ یہ وقت اس پر کیسا گذرا یہ تو کچھ وہی جانتا تھا۔ جب چاند ڈوبنے لگا تو اس کی محبوبہ دلنواز خراماں خراماں تشریف لائیں اور یہ عذر پیش کیا ــــ "یہ چاندنی! ــــ مجھے تو اپنے سایہ سے بھی خوف معلوم ہوتا تھا ــــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دن میں گھر سے باہر قدم رکھ رہی ہوں ــــ" ہاں! ــــ تو اس نظم میں چاند اور چاندنی کی سخت بُرائی کی گئی تھی ایسی چاندنی کی مثال اس نے اس ناگن سے دی تھی جو کاٹ کر پلٹ جائے ــــ اگر میرا خیال درست ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ــــ "تو شاید اس نے یہ تمثیل ایک مشہور ادیب سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اچانک ایک شخص کنارے کے کھیت کی منڈیر سے اُتر کر ان کے سامنے آ کھڑا ہوا ــــ

"بھائی ذرا ماچس دینا۔"

وہ دونوں سکتہ کے عالم میں کھڑے ہو گئے۔

درمیانہ قد والا آگے بڑھنا چاہتا تھا مگر پھر کچھ سوچ کر رُک گیا۔ بید کو بغل میں داب کر جیب سے دیا سلائی نکالی اور اس طرح جلایا کہ ساری روشنی اجنبی کے چہرے پر پڑے مگر ماچس بجھ گئی۔ وہ تیسری تیلی روشن کرنے میں کامیاب ہوا۔ اجنبی نے بیڑی سلگانے کے لئے سر نیچے جھکایا۔ ساری روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ اجنبی وضع قطع سے سیدھا سادہ دیہاتی کسان معلوم ہوتا تھا۔ لیکن دیا سلائی کی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ متجسس نظروں سے انھیں گھور رہا تھا۔

وہ دونوں شکریہ کے الفاظ سُنے بغیر آگے بڑھ گئے ــــ کچھ دُور چلنے کے بعد وہ رُک گئے ــــ مُڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا ــــ بل کھاتے ہوئے کچے راستے کے کناروں پر درختوں کے طویل چنکبرے سائے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا ــــ دُور

دُور تک کہیں کوئی بھی شخص نظر نہ آتا تھا ـــــ وہ پھر تیز تیز چلنے لگے۔

چند لمحوں کے بعد طویل قامت والے نے کہا۔" مجھے تو کچھ خطرے کا احساس ہوتا ہے۔"

"خطرہ!" ـــ بغیر گردن اُٹھائے اس کے ساتھی نے جواب دیا ـــ "خطرہ تو ہر طرف ہے میرے دوست! ـــ قدم قدم پر خطرہ ہے ـــ ہمیں اس سے مفر نہیں ـــ ہمیں تو ہر خطرے کا مقابلہ کرنا ہے ـــ اور تم نے سُنا نہیں ـــ؟" وہ مسکرایا ـــ "گاؤں کے بڑے بوڑھوں میں یہ قصّے بہت عام ہیں کہ دریا کے کنارے اکثر جن اور بھوت ملا کرتے ہیں۔ وہ راہگیروں کا راستہ روک لیتے ہیں۔ اُنھیں پریشان کرتے ہیں۔ بچپن میں میں نے اپنے گاؤں میں سُنا تھا کہ ایک کسان کو جنگل میں ایک چالیس گز لانبا بھوت ملا۔ وہ سڑک کے دونوں کناروں کے دو طویل درختوں کے اوپر کھڑا تھا۔ اس کا ایک پاؤں ایک کنارے کے درخت پر تھا دوسرا دوسرے درخت کے کنارے پر۔ بیچارہ غریب کسان وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا اور دوسرے دن گاؤں والوں نے اُسے سڑک پر مُردہ پڑا پایا ـــ کتنی عجیب بات ہے ـــ بہت دنوں سے میری بھی یہی خواہش تھی کہ کسی جن یا بھوت سے ملاقات ہو جائے۔ چلو، اچھا ہوا ہم بھی کیسے خوش قسمت ہیں ـــ زندگی میں ایک بھوت سے تو ملاقات ہو گئی ـــ بیڑی پیتا ہے ـــ بھُوت ہی ہوگا۔ جن تو ہو ہی نہیں سکتا ـــ جو خود آگ سے بنا ہو، وہ آگ کیسے پی سکتا ہے ـــ پارسی آگ کی پرستش کرتے ہیں۔ بیڑی سگرٹ نہیں پیتے ـــ اور اپنا جمشید ـــ وہ پہلے سگرٹ نہیں پیتا تھا۔ اب پینے لگا ہے ـــ وہ اب آتش پرست نہیں رہا ـــ اور ہاں! میں نے اس کی آنکھیں غور سے دیکھی تھیں ـــ شعلے نکل رہے تھے اُن سے ـــ تم نے اس کے پیر دیکھے تھے۔ کیسے تھے وہ؟ ـــ اُلٹے تو نہیں تھے؟ ـــ"

طویل قامت والے پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا ـــ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

"مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھوت ہمارا پیچھا کر رہے ہیں ۔"

اب وہ دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے ۔ لانبے قد والے سے اس کے ساتھی نے سرگوشی میں دریافت کیا ۔

"سب انتظام تو ٹھیک ہوگا ؟"

"یقیناً ! ــــ کہا گیا ہے کہ ــــ داآدا خود ہمارا منتظر ہوگا ۔ آپ بالکل مطمئن رہیں ــــ داآدا کا کہا تو پتھر کی لکیر ہے ــــ"

"داآدا !" ــــ دوسرے شخص نے عزت و احترام سے دہرایا ۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی ــــ "داآدا ! ــــ کتنی مقدس شخصیت ہے وہ ! ــــ ایک کامل انسان !! ــــ کیسی کیسی قربانیاں کی ہیں اس نے ــــ اس کی عمر دیکھو ! ــــ صحت کا یہ عالم کہ دمہ گھڑی بھر چین نہیں لینے دیتا ــــ مگر اب بھی ہر مہم میں پیش پیش !!"

دریا کے کنارے ایک نوجوان کھڑا بیڑی پی رہا تھا ــــ اس نے درمیانہ قد والے شخص کی ڈاڑھی ــــ سر پہ لپیٹا ہوا گلوبند ــــ اور ہاتھ کی بید کو دیکھ کر آہستہ سے کہا ــــ "ساتھی !"

"داآدا کہاں ہے ــــ ؟" طویل قامت والے نے دریافت کیا ۔

"وہ کشتی میں ہے ــــ چلیے ! ــــ بہت دیر ہو گئی ــــ ہم تو بہت جلدی آگئے تھے ــــ"

وہ تیز تیز آگے بڑھے ۔ کشتی میں ایک شخص بیٹھا کھانس رہا تھا ــــ وہ دونوں کود کر کشتی میں سوار ہو گئے ۔ پھر نوجوان نے بند کھول دیا اور کشتی میں سوار ہو کر پتوار ہاتھ میں لے لئے ۔

بوڑھے نے ایک کپڑا ہاتھ میں لے رکھا تھا ــــ جب کھانسی اسے زیادہ تنگ کرتی تو وہ منھ پہ کپڑا رکھ کر کھانستا تاکہ آواز گونجنے نہ پائے ۔ وہ مسلسل کھانستا تھا ۔ کھانسی

کے درمیانی وقفوں میں رُک رُک کر گفتگو کر سکتا تھا ــــ اس نے اپنے لڑکے سے کہا ــــ "کوئی سو گز تک ــــ پانی کے بہاؤ پر سیدھے چلو، بالکل سیدھے ــــ پھر بائیں ہاتھ پر ــــ مڑ کر ــــ چالیس پچاس گز تک ــــ سیدھے چلو ــــ دیر تو ہو گی ــــ پر واہ نہیں ــــ پھر دوسرے کنارے ــــ کی طرف پلٹ جانا ــــ" پھر وہ مسافروں کی طرف متوجہ ہوا ــــ "آگے کوئی سگرٹ بیڑی نہیں پیئے گا ــــ دریا کے کنارے تنگ ہو گئے ہیں ــــ کنارے کے درختوں پر ــــ شہد کے چھتے ہیں ــــ روشنی دیکھ کر ــــ مکھیاں حملہ کر دیتی ہیں ــــ"

ڈاڑھی والا مسافر اپنا گلوبند اُتار کر بوڑھے کے قریب آ بیٹھا ــــ "دادا! ــــ پہچانتے ہو مجھے۔؟"

بوڑھا مسکرایا ــــ کھانسی کے درمیانی وقفوں میں کہنے لگا ــــ "جب تم کشتی پر سوار ہوئے تھے ــــ میں نے تمھیں پہچان لیا تھا ــــ" مسافر کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ پھر بولا ــــ "یہ ڈاڑھی ــــ یہ گلوبند ــــ تمھیں میری نظروں سے نہیں چھپا سکتے ــــ کیا بتاؤں تمھیں دیکھ کر کیسی خوشی ہو رہی ہے ــــ اب نہ وہ عمر ہے ــــ نہ وہ صحت ــــ اس دمہ نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ کھانسی تو مجھے بات بھی نہیں کرنے دیتی ــــ وہ زمانہ ــــ مجھے پچھلی باتیں یاد آ رہی ہیں ــــ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے ــــ کہ میں آج بھی ــــ اس فوج کا ایک سپاہی ہوں ــــ ایک سپاہی ــــ یہ کشتی اب بھی طوفان سے ٹکر لے سکتی ہے ــــ اُنھوں نے علی کے لئے کہا تھا ــــ مگر میں خود ہی چلا آیا ــــ" اس نے دریا میں چاروں طرف نظر دوڑائی ــــ اپنے بیٹے سے کہنے لگا ــــ "ہاں! ابھی ایسے ہی ــــ ایسے ہی آگے چلنے دو ــــ" پھر وہ مسافروں سے مخاطب ہوا ــــ "علی نوجوان سہی ــــ مگر اسے میرے جیسا تجربہ نہیں ــــ"

"دادا!" ــــ لانبے قد والے نے کہا ــــ "تم نے بڑی تکلیف کی ــــ اب تو تمھیں آرام کی سخت ضرورت ہے ــــ اب تمھاری محبت ہی ہمارے لئے کافی ہے۔"

"تکلیف!" بوڑھے کو جوش آگیا ـــ "تم سمجھتے ہو میں بوڑھا ہو گیا ہوں ـ ٹھیک ہے ـــ" اس نے اپنے کُرتے کی آستینوں کو اُوپر چڑھاتے ہوئے کہا ـــ "میری عمر ـــ ہوگی پچاس ـ ساٹھ برس کی ـــ مجھے ٹھیک ٹھیک یاد بھی نہیں ـــ لیکن عبدل کے بازوؤں میں اب بھی جوانوں سے زیادہ طاقت ہے ـــ میں ایک سپاہی ہوں ـــ میں نے بہت سی جنگیں لڑی ہیں ـــ یہ بازو اب بھی بڑے بڑے طوفانوں سے لڑ سکتے ہیں ـ تم نہیں سمجھتے ـــ آج میں کس قدر خوش ہوں ۔"

"دادا!" ڈاڑھی والے مسافر نے کہا ـــ "میں بیان نہیں کر سکتا کہ ہمارے دلوں میں تمہارے لئے کس قدر محبت ہے ۔ ہم تمھیں کس عزت اور قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں تمہارا جوش وخروش ۔ تمہارے حوصلے، تمہارا ایثار اور قربانیاں ہمارے پیش نظر رہتی ہیں ہم ان سے سبق حاصل کرتے ہیں ۔ تمھاری زندگی ہمارے لئے ایک مثال ہے ۔"

بوڑھے کا سینہ جوش سے پھول گیا ۔ وہ زور زور سے کھانسنے لگا ـــ "نہیں! ـــ نہیں!! ـــ میں تو ایک سپاہی ہوں ـــ ایک سپاہی ـــ" پھر اس نے دریا میں نگاہیں دوڑانی شروع کیں ـــ "ہاں! ـــ اب ٹھیک ہے ۔ بالکل ٹھیک ـــ کشتی موڑ لو ۔ بس ـــ سیدھے دوسرے کنارے کی طرف ـ ٹھیک ہے ـــ"

"دادا"! گاؤں کی اب کیا حالت ہے؟" مسافر نے دریافت کیا ۔

"بہت اچھی حالت ہے ۔" دادا نے کھانسی روکتے ہوئے کہا ـــ "بڑا ایکا ہے ۔ بڑا جوش ہے ـــ اب کوئی بدمعاش ـــ گاؤں میں قدم بھی نہیں رکھ سکتا ـ سارا انتظام پنچایت ـــ پنچایت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے ـــ"

"دادا! سُنا ہے آج کل تم پنچائت کے صدر ہو؟"

بوڑھا ہنسا ـــ "نہیں! ـــ میں تو ایک سپاہی ہوں ـــ سپاہی ـــ"

"دادا! ـــ اگر میں کبھی تمہارے گاؤں آؤں؟"

"تو!—" بوڑھے کو جوش آگیا— "ہم تمھیں اپنے سینوں میں چھپالیں گے۔ جب تک گاؤں میں ایک آدمی بھی زندہ ہے کوئی تمھیں— ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔"

کشتی کنارے سے آلگی۔ لانبے آدمی نے اپنا بستہ اٹھایا اور دونوں کنارے پر اُتر گئے۔ گلوبند والے نے کہا— "اچھا دادا! اب ہم جا رہے ہیں۔"

"اچھا خدا حافظ!!"— اس نے کھانستے ہوئے کہا— "بس اب میرے لئے دُعا کرو— کچھ دن اور زندہ رہوں کہ— تم سب کو کامیاب ہوتا دیکھوں۔"

"دادا! اب کامیابی بہت قریب آچکی ہے۔ تمھاری دُعائیں چاہئیں۔"

"تم زندہ رہو گے دادا!—" لانبے قد والے نے کہا— "تمھاری قربانیاں تمھارا ایثار تمھارا حوصلہ— کیا یہ سب فنا ہو سکتے ہیں؟"

بوڑھے نے کھانستے ہوئے آہستہ آہستہ جواب دیا— "میں تو ایک سپاہی ہوں۔ —سپاہی—"

کشتی کا رُخ پلٹ چکا تھا— وہ آہستہ آہستہ دُور ہوتی جا رہی تھی— کنارے سے اب تک ایک آواز آرہی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا— "عوام نہیں مرتے دادا!— عوام لافانی ہیں۔ وہ امر ہیں— انھیں موت نہیں— اور کشتی لہروں کا سینہ چیرتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ کنارے کے جھینگر اپنا راگ الاپ رہے تھے— کبھی کبھی کوئی گیدڑ چلانے لگتا۔

وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ علی بخش آہستہ آہستہ پتوار چلا رہا تھا۔ بوڑھا تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھانستا اور کھانسی کے دوران میں کپڑے کا ٹکڑا منھ پر رکھ لیتا تھا۔ علی بخش بہت ہی مسرور تھا اس کے نوجوان دل میں نئی نئی اُمنگیں بیدار ہو رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ اونچی آواز میں کوئی گیت گائے— ملّاحوں کا گیت گاؤں کی کنواریوں کا گیت۔ جل پریوں کا گیت۔ مگر اسے کچھ یاد ہی نہ آتا تھا۔ اس کے

ذہن میں بار بار صرف یہی الفاظ گونجتے تھے ___ ہم لافانی ہیں ___ ہمیں موت نہیں ___ ہم کبھی نہیں مر سکتے ۔ ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے ___ اور کشتی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی ۔

جب وہ دوسرے کنارے کے نزدیک پہنچے تو علی بخش کو کنارے پر ہلکی سی روشنی نظر آئی ۔

"دادا !" علی بخش نے دوسرے کنارے پر نظریں جماتے ہوئے کہا ۔ "دیکھتے ہو؟"
عبدل نے غور سے دوسرے کنارے کی طرف دیکھا ___ کچھ سوچتے ہوئے اُس نے کہا ___ "کوئی مسافر ہوگا ___ مگر اس وقت ___ آدھی رات میں ___ انہیں کوئی کشتی نہیں مل سکتی ۔"

"مگر دادا ! ___ مجھے تو کوئی اور ہی بات ...." علی بخش کنارے کو تکتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا ___ "کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی ہے ___"

"نہیں بیٹے !!" عبدل نے کامل اطمینان سے کہا ___ "کوئی مسافر ہوگا ۔" اس کی آنکھیں کنارے پر لگی ہوئی تھیں ۔ اچانک عبدل نے مٹھیاں بھینچ لیں ___ "اور اگر ___ اور اگر ___ کوئی ایسی ویسی بات ہوئی ___" اس کے لہجے میں ایک مستحکم عزم جھلک رہا تھا ___ "تو دیکھ لیں گے ۔" اس نے کھانسی روکتے ہوئے کہا ___ "ابھی ان بازوؤں میں بہت طاقت ہے ___ یہ اب بھی بڑے بڑے طوفانوں سے لڑ سکتے ہیں ___"

علی بخش نے غور سے دیکھا ۔ وہ چار آدمی تھے ___ بیٹری کی روشنی ان کی کشتی پر صاف پڑ رہی تھی ___ وہ لوگ انہیں کا انتظار کر رہے تھے ۔

کنارے پر جمعدار کہہ رہا تھا ___ "دیکھا آپ نے ! میں نے پہلے ہی کہا تھا ۔ یہ

عبدل اور اس کا بیٹا علی ہیں۔ یہ حرامزادے ان لوگوں سے ملے ہوئے ہیں۔ اور ان لوگوں کو پناہ دیتے ہیں۔"

"ہوں!۔" انسپکٹر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اچھا دیکھو غصہ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ذرا نرمی سے بات کرنا۔"

"مگر حضور! یہ کبھی نرمی سے ماننے والے ہیں۔ بڑے ہی گھُٹے ہوئے، پکے بدمعاش ہیں یہ دونوں۔ آپ عبدل کو نہیں جانتے۔ یہ کانگرس کی ہر تحریک میں جیل کاٹ چکا ہے پکا غنڈا ہے صاحب! چھٹا ہوا"

"خیر! ذرا نرمی سے بات کرنا۔ اگر سیدھی طرح راہ پر نہ آئے تو میں نپٹ لوں گا انھیں اب تک میرے جیسے آدمیوں سے واسطہ نہ پڑا ہوگا۔ میرا ایسے لوگوں سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ میں ان کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ میں نے انھیں جانوروں کی طرح ہانک ہانک کر مارا ہے۔ گاؤں کے گاؤں جلا کر راکھ کر ڈالے ہیں۔ یہ بھی کیا یاد کریں گے، کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔"

کشتی کنارے سے آ لگی۔ وہ دونوں کامل بے نیازی سے کشتی سے اُترنے لگے۔ جمعدار اور ایک سپاہی آگے بڑھے۔

"مجھے پہچانتے ہو عبدل؟" جمعدار نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کیوں کیا بات ہے؟" بوڑھے نے کھانستے ہوئے رُک رُک کے کہا۔

"اس وقت تم کسے پہنچا کر آ رہے ہو؟"

بوڑھے پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔

"کچھ مسافر تھے۔" علی بخش نے کہا۔ "دریا پار جانا چاہتے تھے۔ چوگنا کرایہ دیا تھا انھوں نے۔"

"چوگنا کرایہ!" جمعدار نے دہرایا ـــــ پھر اس نے سپاہی سے کہا ـــــ "ان کی تلاشی لو۔"

"وہ تو کرایہ پیشگی دے چکے تھے ـــــ آج شام کو ـــــ جب انھوں نے کشتی ٹھیرائی تھی۔" علی نے کہا۔

"تم انھیں پہچانتے ہو؟" انسپکٹر نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"نہیں ـــــ!" علی نے جواب دیا۔ "آج سے پہلے میں نے اُنھیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"کیا باتیں کرتے تھے وہ لوگ؟"

"یہی اِدھر کی اُدھر کی۔ موسم کی۔ بارش کی، فصلوں کی باتیں۔"

"خیر! مجھے ان کا بھیٹ معلوم ہے۔ بدمعاش اب مجھ سے بچ کر نہیں جا سکتے جمعدار ہم ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے ـــــ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ" پھر انسپکٹر علی سے مخاطب ہوا۔ "تم ہمیں دریا کے پار لے چلو۔"

"دریا کے پار ـــــ اس وقت ـــــ او! میرے خدا!! اب تو چاند بھی ڈوب رہا ہے۔"

"جمعدار صاحب!" بوڑھا عبدل کہنے لگا ـــــ "آپ تو اسی طرف کے رہنے والے ہیں ـــــ آپ جانتے ہیں ـــــ اس وقت دریا میں سفر کرنا......"

"ٹھیک ہے!" جمعدار نے بات کاٹ کر تیزی سے جواب دیا ـــــ "اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ عبدل ہمیں اس کنارے پر پہنچا سکتا ہے۔"

علی بخش کشتی باندھتے ہوئے بڑبڑانے لگا ـــــ "اس وقت کوئی جا سکتا ہے بھلا، اب کوئی نہیں جائے گا۔ رات کے تین بجنے والے ہیں۔ چاند ڈوب رہا ہے۔ اس وقت بڑا خطرہ ہے۔ جمعدار صاحب! ـــــ اس وقت بڑا خطرہ ہے!!"

"ہاں! بڑا خطرہ ہے ـــــ میں جانتا ہوں۔ مگر تمھیں جانا ہوگا ـــــ سنتا نہیں!!۔

تجھے جانا ہوگا۔"

جمعدار نے سپاہی کو اشارہ کیا۔ علی بخش جھکا ہوا کشتی باندھ رہا تھا۔ سپاہی نے بندوق کا کندہ اس کے پٹھوں پر رسید کیا۔ علی بخش لڑکھڑا کر گر پڑا۔ جمعدار اپنا دستی ڈنڈا اہلا رہا تھا۔ انسپکٹر صاحب کمر میں لگے ہوئے پستول پر ہاتھ رکھے ہوئے اطمینان سے کھڑے تھے۔

"دیکھو بڑے میاں!۔۔" انسپکٹر نے عبدل سے مشفقانہ انداز میں کہا۔۔"ہمیں دریا کے اس پار جانا ہے۔۔ ادر ابھی۔۔ فوراً۔۔ تم بوڑھے آدمی ہو۔ان باتوں کو خوب سمجھتے ہو۔۔سرکاری کام ہے۔ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود کشتی لیجا سکتے تھے۔ مگر ہم جانتے ہیں اس وقت دریا میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ تم ادر صرف تم ہمیں اس پار پہنچا سکتے ہو۔ یہ بڑا اہم۔۔ سرکاری کام ہے۔۔ بتاؤ کیا تم ہمیں اس پار لے چلو گے؟"

"اس پار"۔۔ بوڑھے نے آہستہ سے دہرایا۔۔"اس پار۔۔بڑی ہمت کا کام ہے۔ بڑا خطرہ ہے۔۔ انسپکٹر صاحب! بڑا خطرہ ہے۔۔!!"

"یہ سرکاری کام ہے! سمجھے؟" انسپکٹر نے الفاظ پر زور دے کر کہا۔"سرکاری کام۔۔ تمھیں ہمیں لیجانا ہوگا۔"

"آپ نہیں سمجھتے!" بوڑھے نے رُک رُک کر کہا۔۔"یہ بہت مشکل۔ بڑا خطرہ ہے۔ سرکاری کام سہی۔۔ مگر جان کسے پیاری نہیں۔۔ آپ ہی سوچئے! یہ بڑے خطرے کی بات ہے۔"

"سُن بے بڈھے!" انسپکٹر نے غصے سے کہا۔۔"تجھے جانا ہوگا۔۔ سرکاری کام دام کچھ نہیں۔ یہ میرا حکم ہے۔ میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔۔ بڑا خطرہ ہے۔ بڑا خطرہ ہے بکے جا رہا ہے۔ جانتا نہیں تو کس سے بات کر رہا ہے۔ میرا حکم ٹالنا دریا میں جانے سے

زیادہ خطرناک ہے۔ تجھے جانا ہوگا۔"

"اُس پار ۔۔۔ اس پار"۔ بوڑھے نے کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا۔ "اچھا! اچھا!! خطرہ ہے ۔۔۔ مشکل ہے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ مگر میں تمہیں اس پار پہنچا دوں گا۔"

"دادا!" علی بخش زور سے چلّایا۔

"کوئی بات نہیں اجّو!" بوڑھے نے اطمینان سے کہا ۔۔۔ "سرکاری کام ہے ۔۔۔ مجھے جانا ہی ہوگا۔ کشتی کھول دو علی بخش! میں کئی بار اندھیری راتوں میں ۔۔۔ مسافروں کو اُس پار لے گیا ہوں۔"

"مگر دادا!" علی بخش نے ان دونوں لفظوں میں سب کچھ کہہ دیا ۔۔۔ "نہیں دادا۔ تم نہیں جاؤ گے۔"

"کوئی بات نہیں اجّو! ۔۔۔ تم کیوں ڈرتے ہو!! تم ابھی بچے ہو ۔۔۔ یہ سرکاری کام ہے ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے وہ کشتی کی طرف بڑھا ۔۔۔ "آیئے جمعدار صاحب!"

علی بخش نے بڑھ کر عبدل کا ہاتھ پکڑ لیا ۔۔۔ "نہیں دادا! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا ۔۔۔"

جمعدار نے علی بخش کی گردن پکڑ کر پیچھے ڈھکیل دیا ۔۔۔ "حرامزادے! اگر ایک قدم بھی آگے بڑھا یا تو گولی مار دوں گا۔"

"اسے چھوڑ دیجیے جمعدار صاحب!" عبدل نے کہا ۔۔۔ "وہ بچہ ہے ۔۔۔ تجربہ نہیں۔ سرکاری کام کو بھلا وہ کیا سمجھے گا۔"

"عبدل!" انسپکٹر نے کشتی میں بیٹھ کر کہا ۔۔۔ "علی بخش کو بھی ساتھ لے لو ۔۔۔ وہ تمہیں مدد دے گا۔"

"وہ کیا مدد دے گا! ۔۔۔ وہ ابھی لونڈا ہے ۔۔۔ انسپکٹر صاحب! عبدل کے بازوؤں میں ابھی بہت طاقت ہے۔ میری کھانسی کی پرواہ نہ کیجیے۔ ادھر چند دنوں سے

سب مجھے دمہ ہوگیا ہے۔ ہم پانچ آدمی اس میں سوار ہیں۔ اس سے زیادہ آدمی اس کشتی میں سوار نہیں ہو سکتے۔ کشتی زیادہ بوجھ نہیں سہ سکے گی۔"

جب علی بخش کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوا تو کشتی کنارہ چھوڑ چکی تھی ــــ وہ زور سے چلّایا ــــ "دادا! یہ تم کیا کر رہے ہو ــــ یہ تم کیا کر رہے ہو دادا؟"

عبدل دادا اطمینان سے کھانستا رہا۔ جب کھانسی سے چھٹکارا ملا تو اس نے زور سے کہا ــــ "اجّو! تم اب گھر چلے جاؤ ــــ پریشان نہ ہو ــــ میں سویرے واپس آؤں گا ــــ"

کشتی آگے بڑھتی رہی۔

علی بخش گھر نہیں گیا۔ وہ گھر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے کشتی کو گھور رہا تھا جو پانی کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اور وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"دادا! ــــ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ــــ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ــــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم ایک سپاہی ہو ــــ تم نے زندگی بھر جنگ کی ہے ــــ بڑی بڑی قربانیاں دیں ــــ اور ــــ آج ــــ دادا! ــــ ایسا نہیں ہوگا ــــ" اس کے دماغ میں عجیب عجیب متضاد خیالات گردش کر رہے تھے بڑھاپے میں حواس کے ساتھ ساتھ عقل بھی جواب دے دیتی ہے ــــ میرا باپ پاگل تو نہیں ــــ کیا بڑھاپے نے اس کے جوش و خروش کو، اس کی جنگ کرنے کی طاقت کو ختم کر ڈالا ہے ــــ وہ کسی فیصلہ کن نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے دماغ میں مختلف خیالات کش مکش کر رہے تھے۔ کبھی باپ کا سارا ماضی اس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا اور وہ سوچتا کہ اس کا باپ کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ لیکن فوراً ہی اس کی نظریں لہروں سے الجھتی ہوئی کشتی سے جا ٹکراتیں اور وہ چیخ اٹھتا ــــ "دادا! تم یہ کیا کر رہے ہو ــــ پاگل! ــــ نہیں! نہیں! ! ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک سپاہی ہے ــــ پاگل ــــ غداری ــــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ــــ وہ کئی مرتبہ جیل

گیا ہے ـــ اس نے لاٹھیاں کھائی ہیں ـــ گولیوں کا مقابلہ کیا ہے ـــ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"

اور کشتی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

جوں جوں کشتی آگے بڑھ رہی تھی۔ علی بخش کا ذہن بھی اُلجھتا جاتا تھا۔

"دادا ـــ اور پولیس سے مل جائے ـــ غداری ـــ نہیں! ـــ دادا! پاگل ـــ نہیں۔ کبھی نہیں ـــ مگر دادا تم یہ کیا کر رہے ہو؟ ـــ تم جیل میں کیوں نہ مر گئے ـــ گولیاں کھا کر کیوں زندہ رہے ـــ" اور پھر ایک لفظ اس کے ذہن میں چمک اُٹھتا ـــ "غدّاری ـــ غداری ـــ کاش کہ تم میرے باپ نہ ہوتے"۔

علی بخش کی نظریں آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی کشتی پر لگی ہوئی تھیں ـــ کشتی نے بائیں طرف مڑنا شروع کیا ـــ وہ غصے سے کانپنے لگا۔ بار بار زمین پر پیر ٹپکتا اور بڑبڑاتا ـــ اب کیا ہوگا ـــ اگر یہ لوگ وہاں پہنچ گئے ـــ عبدل! تم دریا میں ڈوب گئے ہوتے کھانستے کھانستے تمہارا دم نکل گیا ہوتا۔ اب کیا ہوگا؟

علی بخش گھر نہیں گیا۔ وہ گھر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ کنارے کے سب سے اونچے حصہ پر چڑھ گیا ـــ وہ گھور گھور کر تیرتی ہوئی کشتی کو دیکھ رہا تھا جو دریا کی سطح پر چاند کی مدھم روشنی میں ایک ہلتے ہوئے نقطے کی مانند معلوم ہوتی تھی۔

"اب کیا ہوگا ـــ دادا! تم نے یہ آج کیا کیا؟ ـــ عبدل ـــ غدّار ـــ میں کسی کو صورت نہ دکھا سکوں گا ـــ میرے ساتھی مجھ سے نفرت کریں گے۔ یہ عبدل کا بیٹا ہے جس کے باپ نے آخری عمر میں غدّاری کی ـــ غداری ـــ غداری ـــ دادا! ـــ یہ تم نے کیا کیا ـــ اب کیا ہوگا ـــ عبدل! تم پہلے ہی مر گئے ہوتے ـــ کاش کہ تم میرے باپ نہ ہوتے ـــ"

کشتی نے آہستہ آہستہ پلٹنا شروع کیا ـــ علی بخش کشتی کا رُخ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ اس دریا کے کونے کونے سے واقف تھا۔ اس کی ساری زندگی ان دو کناروں

کے درمیان گذری تھی ـــــ وہ زور سے چلاّنا چاہتا تھا ـــــ "دادا! دادا! کشتی تو بھنور کی طرف جا رہی ہے ـــــ مگر اسے سکتہ ہو گیا۔ ایک لفظ بھی اس کے منھ سے نہ نکل سکا۔

کشتی میں انسپکٹر سپاہیوں کو اپنے آندھرا کے کارنامے سُنا رہا تھا........
ایک گولی سے سولہ آدمی مر سکتے ہیں۔ میں نے اس کا تجربہ کیا ہے۔ میں نے ایک قطار میں ایک کے پیچھے دوسرا، بیس آدمی کھڑے کئے اور سامنے والے کے سینے پر نال رکھ کر گولی چلا دی سولہویں آدمی کی پیٹھ سے گولی نہ نکل سکی ـــــ وہاں کی عورتیں بھی بڑی حرامزادی ہیں ـــــ اور میں نے تو ان عورتوں کو.......

اچانک جمعدار کی نظر جو دریا پر پڑی تو وہ چیخ اُٹھا ـــــ "ابے حرامزادے! یہ کشتی کہاں جا رہی ہے ـــــ؟" بوڑھا اپنی پوری طاقت کے ساتھ کشتی کھیتا رہا۔ جمعدار نے بندوق سپاہی کے ہاتھ سے چھین لی اور عبدل کی طرف بڑھا۔ وہ سب گھبرا کر کشتی میں کھڑے ہو گئے۔

"یہ کیا کر رہا ہے بے بڈھے؟ ـــــ میں تجھے مار ڈالوں گا ـــــ" پھر وہ انسپکٹر سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ اس کے لہجے سے انتہائی خوف و حراس کا اظہار ہوتا تھا۔ "حضور کشتی تو بھنور کی طرف جا رہی ہے ـــــ میں اس بڈھے کو دریا میں ڈھکیل دیتا ہوں ـــــ" مگر مارے خوف کے اس کے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔

کشتی نے چکّر کاٹنا شروع کیا۔

بوڑھا جو اَب تک زور زور سے کشتی کھے رہا تھا، پتوار ندی میں پھینک کر تن کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کافی تھک چکا تھا۔ اور تیز تیز سانس لے رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس نے ایک انگلی سے پسینہ اتار کر اپنے کرتے سے پونچھ لیا۔ اس کے چہرے سے کامل اطمینان و سکون جھلک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں

مسرت سے چمک رہی تھیں۔ جیسے وہ ہنس رہی ہوں ۔ اُن کا مذاق اُڑا رہی ہوں ۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں مجھے کوئی نہیں مار سکتا۔ میں امر ہوں ۔ اور تمہاری موت آچکی ہے۔ اب تمھیں کوئی نہیں بچا سکتا تم مر چکے ہو۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا — مگر اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ زور زور سے کھانستے ہوئے تختے پر بیٹھ گیا۔

وہ سب سکتہ کے عالم میں کھڑے تھے۔ کشتی کے چکر چھوٹے اور تیز تر ہوتے جا رہے تھے جمعدار ہاتھ مل مل کر کہہ رہا تھا "اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب موت یقینی ہے۔" بوڑھا زور زور سے کھانس رہا تھا۔ یہ آوازیں دریا کے کناروں سے ٹکرا کر ایسی گونج پیدا کر رہی تھیں جیسے کوئی قہقہہ مار کر ہنس رہا ہو — اور ان آوازوں کو — ان قہقہوں کو دریا کی روانی اپنے دامن میں سمیٹ کر سینہ سے چمٹائے ہوئے تیز رفتاری سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

علی بخش گھومتی ہوئی کشتی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ بار بار اس کی زبان سے نکلتا تھا — "دادا! — دادا!!"

پھر کشتی بھنور میں تیز تیز چکر کھاتی ہوئی غائب ہو گئی۔ علی بخش زور سے چلایا — "دادا! — دادا!!"

ایک لمحہ تک وہ خاموش کھڑا ان لہروں کو دیکھتا رہا جو کبھی کبھی ڈوبتے چاند کی روشنی میں چکر کھاتی ہوئی چمک اُٹھتی تھیں — دفعتہً وہ خاموشی سے چیخ اُٹھا — "دادا۔ دادا" اور وہ تیزی سے گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ صرف ایک بات کہ وہ فوراً گاؤں میں پہنچ کر اپنے سب ساتھیوں کو یہ خوشخبری سنائے کہ اس کا باپ زندہ ہے — اس کا باپ ہمیشہ زندہ رہے گا۔

شاہراہ
مئی ۵۰ء

سنتوکھ سنگھ دھیر

تائی نہالی

چھت کی منڈیر پر کوا بولا

"تیر...... کانے......" تائی نہالی نے ٹھپکارتے ہوئے ہاتھ سے کوّے کو اڑا دیا۔

کوا اُڑ گیا مگر تائی کے کلیجے میں ہول اُٹھنے لگا اور اس کا کمزور جسم کانپنے لگا۔ اور تائی کی نظروں میں پانچ برس پہلے کا سماں کسی بھیانک چیل کی طرح اپنے پر پھڑپھڑانے لگا پر —— جنھوں نے تائی کے گھر پر اندھیرا کر دیا تھا۔

پانچ برس پہلے، ایک شام تائی کو چٹھی رساں ایک بند لفافہ دے گیا تھا۔ کتنے شدید انتظار کے بعد تائی کو وہ خط ملا تھا۔ جو اس کے خیال میں اس کے دراز عمر بیٹے کی طرف سے خیریت کا تھا۔ مگر وہ خط کمان افسر کی طرف سے آیا تھا جو میدان جنگ میں سے اُس کے بیٹے کی موت کی منحوس خبر لے کر آیا تھا۔ اس روز بھی تائی کی چھت کی منڈیر پر کوّا اچلایا تھا۔

تائی نہالی چھوٹی چھوٹی سی باتوں کا بھی وہم کیا کرتی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت اگر سامنے پانی کا گھڑا یا بھنگی مل جاتا تو وہ سدھ مناتی۔ اور اگر اُپلے، لکڑیاں، برہمن، نمبر دار یا کوئی سر پر خالی ٹوکرا اٹھائے مل جاتا تو وہ جھٹ واپس لوٹ جاتی۔

پہلے تو وہ کوّے کے بولنے کا اتنا بُرا نہ مناتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ بہت ہوگا تو کوئی

مہمان آجائے گا۔ جس کا بار وہ کسی نہ کسی طرح اٹھا ہی لے گی۔ مگر اب وہ کتے کو ایک یمدوت خیال کرتی تھی جس کے گلے میں اس کی موت چلاتی تھی۔

کرتارے کی موت نے تائی کی کمر توڑ ڈالی۔ پہلوٹھی کا ایسا جوان اور کماؤ بیٹا گھر بھر کو روتا چھوڑ کر چل بسا تھا۔ تائی کے سینے میں ایک گڑھا بن گیا تھا۔ جس گڑھے میں اس کا چھوٹا لڑکا بلونت بھی دھنسا ہوا تھا اور وہ گڑھا کسی طرح پُر نہ ہوتا تھا۔

ہاں۔ تائی کو اتنا پچھتاوا ضرور تھا کہ اس کا لٹھ ایسا مضبوط بیٹا جوانی کی موت کبھی نہ مرتا اگر وہ فوج میں بھرتی ہو کر میدان جنگ میں نہ جاتا۔ نئے لہو کی طرف جھانکنے کی جرأت موت میں کہاں۔ یہ خیال اس کے دل میں ہوک بن کر اٹھتا۔ جب کبھی وہ اپنے الجھے ہوئے بالوں میں کانپتی ہوئی انگلیاں پھیرتی۔

اُسے یہ یقین تھا کہ اس کا بیٹا کبھی بھرتی نہ ہوتا اگر سرکار اسے زبردستی نہ لے جاتی۔ "نوکری سے کیا ہم پار اُتریں گے" وہ عام طور سے کہا کرتی۔ وہ سمجھتی کہ جو اُن کے پاس زمین کے چار کیارے ہیں ان میں سے ہی اس کا محنتی بیٹا اہاڑ اور ساون کی فصلوں کو بر ابر اگا اگا کر دانوں سے گھر بھر دیا کرے گا۔ اس کی مٹیار بہو صوف کا لہنگا اور چمڑے کی نوکدار سُرخ جتی پہن کر جھوم جھوم کر چلتی، چھم چھم کرتی، اسے کھیتوں میں روٹی دینے جایا کرے گی۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ سرکار نے اسے اور اس کے بیٹے کو نمبردار کی لال لال آنکھوں میں سے گھورا تھا۔ اور تھانیدار کے منہ میں سے گالیاں دی تھیں ـــــ "حرام زادی بکتی ہے ...... سور کا بچہ ......"

اور سرکار نے گاؤں کے صدر دروازے میں چوپال کے سامنے پولیس کے جنوں ایسے ہاتھوں سے اس کے نوعمر بیٹے کو گردن سے پکڑ کر آگے لگا لیا تھا۔ اور وہ کتنی دیر تک درد بھرے دل کے ساتھ دور ـــــ اوجھل ہوتے ہوئے بیٹے کو خلا میں تاکتی رہی تھی۔

ایک شام، چری کی پولیاں گرانے کے لئے تائی جب کوٹھے پر جانے لگی، تو اس نے دیکھا چھت پر آسمان کی طرف منہ اٹھائے کتے رو رو کر جسم توڑ رہے ہیں۔ تائی کو ایسا لگا جیسے دنیا کو

تڑپ کرنے کے لئے کوئی وبا اپنا جبڑا کھولے کھڑی ہے۔ اس کا اعتقاد تھا کہ وبا یا قحط نازل ہونے سے پہلے کتوں کو معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر کتے روتے ہوں تو دنیا پر ضرور کوئی قہر نازل ہونے والا ہوتا ہے۔ اور تائی نہیں چاہتی تھی کہ اس کے کان میں اب یہاں پر کسی بھی قہر کے نازل ہونے کی بھنک پڑے۔ اس نے لکڑی کی سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر سے للکارا۔

"تمہارے ہونوں سوتوں کی!"

تائی تو چاہتی تھی کہ اس کے خمیدہ دھوئیں سے سیاہ، آڑوں کے سہارے ٹکی چھت والے بوسیدہ سے گھر میں امن رہے۔ اس کے گھر میں کوئی بدشگونی نہ ہو۔ جھاڑو دیتے وقت وہ اپنی بے چاری سی بہو کو روز یاد دلاتی:

"اے کرنیل کور۔ دیکھنا بیٹی، جھاڑو کو کہیں کونے میں کھڑا نہ کر دینا۔"

معصوم شرارتی کو جو کھیت سے گھر آتے ہوئے کبھی سانپ کی کنچ، کوؤں کے انڈے موروں کے پنکھ یا کوئی اور ایسی ہی چیز اٹھا کر لے آتا تھا۔ ایک روز سیہہ کا تکلا اٹھا لانے سے نانی نے جھڑکا:

"دور ہو منحوس کہیں کے — چل پھینک کے آ دہیں، جہاں سے لایا ہے کلموہا...."

تائی کے گاؤں سے کوئی ایک ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر ایک منڈی تھی، جہاں کسی چھوٹی موٹی غرض سے وہ جایا کرتی تھی۔ منڈی کے راستہ میں جرنیلی سڑک پڑتی تھی۔

ایک روز جب وہ منڈی گئی تو سڑک پار کرنے کے لئے اسے کتنی دیر تک رکنا پڑا لمبی قطار میں مٹیالی جیپیں لاریاں چنگھاڑتی ہوئی گذر رہی تھیں۔ جن پر خاکی وردیوں والے جوان فوجی سوار تھے، کتنی آنکھوں کے تارے۔ کتنی مانگوں کے سندھور۔ کتنے بچوں کے پیارے — تائی کی جان بے تاب سی ہو گئی۔ اور اس کی انتڑیاں بھڑک اٹھیں:

"واہگورو — اب تو دنیا میں امن چین رکھنا...."

سورج کی ٹکیا کے ساتھ گھڑیال بجا — گھڑیال میں سے ٹنکاریں پھوٹ کر کرنوں

کی طرح گاؤں کی گلیوں میں بھر گئیں۔

"تیسری جنگ ......"

گاؤں کے صدر دروازے کی طرف سے تائی کے کان میں بھنک پڑی۔ لمحہ بھر کے لئے تائی بوکھلا گئی۔ جنگ جیسے اُس کے گاؤں میں گرجنے لگی تھی۔ اور اُسے ہاتھ پاؤں کی پڑ گئی۔

"اے بیٹا بنت ـــــ ارے کہیں اندر جا کر چھپ جا لال ـــــ" اُس کی پھڑ پھڑاتی ہوئی انتڑیاں جیسے چیخ اُٹھیں۔ مگر یکایک تائی کے اندر کوئی ہیولا سا لپکا۔ دوسرے ہی لمحے تائی کے ہونٹوں سے چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔

"دیکھو تو کون کلموہا ہمارے گاؤں میں جنگ چھیڑنے آیا ہے!" اس کے اندر اس کی ہستی جاگ اُٹھی۔ دھرتی ایسی عظیم اس کی ہستی۔ اور اس کی کمزوری ایک قوت میں تبدیل ہو گئی اور وہ چٹان کے سے حوصلہ کے ساتھ گلی گلی گاؤں کے دروازہ کی طرف چل دی۔

"جنگ باز ......"

پیپل، نیم اور بڑ کی تربینی کے نیچے بنے ہوئے چبوترے پر سے ایک نوعمر لڑکے نے آسمانی رنگ کے جھنڈے کو اونچا کر کے لہراتے ہوئے کہا:

"مردہ باد ......"

گاؤں کے تمام لوگ گرجے ـــــ بوڑھے، عورتیں، بچے، جوان۔ سبھی۔

حیرت سے تائی کے کان کھڑے ہو گئے۔

"امن۔ امن"

ایک مٹیار نے درانتی کو بلند کرتے ہوئے، باریک ہونٹوں میں سے کہا۔ جو بیلوں کے لئے باہر سے چارے کی پولیاں کاٹ کر لا رہی تھی اور جس نے بوجھے کو یہیں رکھ دیا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے لانبے بالوں میں گھاس کی سبز تڑھیں ابھی تک اُلجھی ہوئی تھیں۔

"ہم تیسری جنگ نہیں ہونے دیں گے!"

ایک لڑکے نے کہا۔جس کی گھنگریالی زلفوں پر راہوں کی دھول ہنس رہی تھی۔ ایک اور جس کی ابھی مسیں پھوٹ رہی تھیں۔ گندم کے دانوں ایسے پسینے کے قطرے جس کے ماتھے پر جھلک رہے تھے۔ گرجا:

"ایشیا سے نکل جاؤ"

ایک شاعر نے گیت گایا:

ساڈے چھیل چھبیلے گھبرو
ہُن کھا نہیں سکدی لام
اسیں جنگ نوں جاون والیاں
کر دیاں گے ریلاں جام

(ہمارے بانکے چھبیلے جوانوں کو اب جنگ نہیں کھا سکتی کیونکہ ہم جنگ کو جانے والی ریل گاڑیوں کے پہیئے جام کر کے رکھ دیں گے)

ترینی کے پتّے پھڑپھڑائے۔تائی کے دل کو ایک سرد جھونکا محسوس ہوا۔اس نے سوچا —— اس کے اڑھ بلونت کو کتنی جوانی چڑھ رہی ہے۔

"ہم امن کے لاکھے ہیں"

توتلی زبان میں دودھ کے دانتوں نے کہا۔ اور ننھے سے ہاتھ نے پہلی جماعت کا قاعدہ ترینی کی نرم نرم ٹہنیوں کی طرف بڑھایا۔

لوگ ساکن ہوئے بیٹھے تھے۔ ترینی کے شوخ سبز پتّے ان کی آنکھوں کے سامنے نِچ نِچ کر رہے تھے۔

تائی سب کچھ اطمینان سے دیکھتی جا رہی تھی۔اس اطمینان سے جو مٹیار ہو کے سدا سُہاگن ہونے میں ہو سکتی ہے۔ جو پتلی میں آنکھ کا تارا چمکنے سے ہو سکتی ہے جو سینے کا زخم مندمل ہونے سے ہو سکتی ہے۔ تائی بھری بیٹھی تھی۔ اُسے محسوس ہوا۔ سب اس کے اپنے

گاؤں کے ہی تو لڑکے ہیں۔ جو چبوترے پہ آ کر بول رہے ہیں۔ چوبارے والوں کا جیت۔ گنگاؤں کا جاگیر۔ اور وہ باہر والی بستی کی طرف کا شاعر لڑکا۔ سب کے سب اس کے اپنے ہاتھوں میں پلے ہوئے —— تائی پھولے نہ سماتی تھی۔

ایک جوان چبوترے پر تن کر کھڑا ہو گیا۔ دنیا کی امن کمیٹی کی طرف سے اس نے اٹیم بم پہ پابندی لگانے کی اپیل پڑھ کر سُنائی۔ سادہ دیہاتی زبان میں اس اپیل کا مطلب کھول کھول کر سمجھایا اور لہلہاتی مٹیار فصلوں، خوش باش گھروں، بچّوں کی مہکتی ہوئی مُسکراہٹ اور رنگ رنگیلی ہماری اس دنیا کا واسطہ دے کر تمام نیک ارادہ لوگوں سے اپیل پر دستخط کرنے اور انگوٹھے لگانے کے لئے کہا۔

جنگ کا نام سُن کر لمحہ بھر کے لئے تائی کے تخیل میں کرتار کی موت کا بھیانک منظر اُبھرنے لگا۔ دور دراز ملکوں میں —— سات سمندر پار —— جنگ کا خونی مورچہ ..... ٹھائیں ...... کرتی ہوئی ظالم گولی .... اور اس کا جگر کا ٹکڑا اچھلا کر زمین پر لوٹنے لگا ..... اور تائی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے گھر کی چھت پر سورج غروب ہو چکا تھا۔

دوسری جنگ نے کرتار کو کھا لیا۔ تیسری جنگ اب پھر مُنہ کھولے کھڑی ہے۔ اس خیال سے تائی کے سکڑے ہوئے کمزور جسم پہ ہول کی جھرّیاں سی رینگنے لگیں۔ اب بلونت ہی اس کے گھر کا چراغ تھا اور تائی تو چاہتی تھی روزِ آخر تک اس کے گھر میں چراغ جلتا رہے۔

تائی نے اپنے انگوٹھے کی طرف گمبھیر اور فیصلہ کن نظروں سے دیکھا۔ تائی کی آنکھیں مسکرائیں جیسے خزاں کے آخر میں بہار کا پہلا جھونکا اُٹھتا ہے۔ تائی کو اپنے انگوٹھے کی عظمت اور طاقت کا احساس ہوا۔

دور —— سوکھے لکڑوں پہ بیٹھے غنڈوں نے پولیس کی شہہ پا کر بُن بُن کرنا شروع کیا۔

"چھی ..... ہی ــــ ہٹا لیں گے بھئی یہ جنگ ــــ ان دستخطوں سے کیا بھلا جنگ کبھی رُک سکتی ہے ــــ؟ اُٹھائے پھرتے ہیں پرچیاں ــــ ایٹم بم۔ انھوں نے نہیں گرنے دینا ماں کے سورماؤں نے" نمبردار گجن سنگھ بڑبڑایا۔ جس نے دوسری جنگ میں گاؤں کے جوان بھرتی کروا کے سرکار سے صلہ کے طور پہ ایک مربع جاگیر بخشش پائی تھی۔

"بلکہ اچھا ہے۔ ہم تو چاہتے ہیں جنگ جلدی چھڑے۔ دنیا بھوکی تو نہ مرے ...." سفید پوش گنڈا سنگھ اور نکّومل ساہوکار حجت کر رہے تھے۔ جنھوں نے گردونواح کے علاقہ میں جھوٹی شہادتوں، رشوتوں اور مخبریوں سے سرانڈ پھیلا رکھی تھی۔

"مت لگاتا ہے لوگو، کوئی انگوٹھے ونگوٹھے۔ ایسے ہی ورغلا رہے ہیں تمہیں یہ روس کے ایجنٹ" حضورا کھینی مار کر ایک طرف پڑے ٹوٹتے ہوئے چھکڑے کی باہی پر سے بدبدایا۔

فضول سی ہن ہن کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔

ترمبینی کے نرم پتوں میں سے ایک تیز جھونکا پھڑپھڑا کر نکلا۔ چبوترے پہ کھڑے شاعر کے لبوں پہ سے عوام کی طاقت اعلان کرنے لگی۔

ساڈے پھلاں دا سوہا سوہا رنگ وے
جنگ بازا ــــ اوبیریا
ساتھوں دوروں دوروں دی لنگھ وے

ساڈے کھیتاں چہ نکّے نکّے ٹبڑے
چھوہ کے بھِٹ نہ دئیں
تیرے پیر لہو نال لبڑے

(ہمارے پھولوں کا رنگ سُرخ ہے۔ اے جنگ باز دشمن ہم سے دور، دور ہی رہنا۔ ہمارے کھیتوں میں چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہیں۔ اے جنگ باز! کہیں انھیں چھو کر ناپاک کر دینا۔

تیرے پاؤں خون سے لتھڑے ہوئے ہیں)

ایک سفید پوش نے جو پولیس کے سپاہیوں کے درمیان بھری ہوئی بندوقوں کی اوٹ میں چارپائی پہ جھوٹ موٹ کا اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ جلدی جلدی پنسل سے کاغذ پر کچھ لکھا۔ تائی نہالی نے اس کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ انگریز کے راج میں جب کانگرس آزادی مانگا کرتی تھی اور اسی سلسلہ میں اس گاؤں میں اسی جگہ پہ جلسہ ہوا تھا اس وقت بھی اسی خفیہ نے چغلی لکھ کر سرکار کو بھیجی تھی۔ اور اس کے گاؤں کے تین لڑکے پکڑ لئے گئے تھے۔ اب آزادی ملنے کے بعد جب راج کانگرس کا ہوگیا تو وہی خفیہ آج پھر ان کے امن کے جلسہ میں بیٹھا ڈائری لکھ رہا ہے۔

تائی نے غصّہ میں آکر سروں کی سطح سے گردن اٹھائی اور خفیہ کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتی ہوئی دانت پیس کر بولی:

"تمہیں کس نے بلایا ہے بے نمک حرام .....؟"

سارے مجمع نے پولیس کی طرف نفرت سے دیکھا۔

تھانیدار کو آگ لگ گئی۔ پستول پہ ہاتھ ڈال کر وہ چیخا:

"بند کرو اس پاکھنڈ کو ـــــ دستخط لگا رکھی ہے ـــــ لوگوں میں بدامنی پھیل رہی ہے ـــــ"

"کون ہے ہمارے جلسہ کو روکنے والا ـــــ؟" تائی گرج اٹھی۔ جلسہ میں بیٹھے ہوئے جوانوں کے بازو پھڑکنے لگے۔ اور لمبے لمبے طروں والے کئی ایک بانکے چھبیلے تہبندوں کے لڑ ٹانگ کر تن گئے۔

"ہوشیار ....."

ایک حکم اور کڑکا۔

بندوقیں ہوا میں تن گئیں۔

"کھڑے رہنا بے ذرا لفنگو ——— تمہاری ایسی کی تیسی ——— ماں مسخرے کہیں کے۔ جس دھرتی کا کھاتے ہو اسی کے ساتھ دغا......!" بجلی کی طرح کڑکتے ہوئے تائی نے باہیں پھیلا کر پولیس کے سپاہیوں کو للکارا۔

چبوترے پر سے نعرے بلند ہونے لگے۔

"سپاہی ہمارے ساتھی ہیں"

"افسر ہمارے دشمن ہیں"

تھانیدار کھسیانہ سا ہو کر رہ گیا۔ سپاہی دہل گئے ——— بندوقوں کے منہ مڑ گئے۔

تائی نے بھرے ہوئے مجمع کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا:

"آؤ ری لڑکیو ——— آؤ بے لڑکو، اے بہو کرنیل کور، ارے بلونت۔ آؤ سب جینے کا غذ پہ انگوٹھے لگاؤ......" تائی کے ریشم ایسے سفید بال کسی بھولے بھالے پرندے کے پروں کی طرح پھڑپھڑائے اور اس نے آگے بڑھ کر سب سے پہلے کاغذ پہ اپنا انگوٹھا لگا دیا۔

ترہینی کی آخری ٹہنیوں میں ایک فاختہ نے اپنے پر پھڑپھڑائے۔ اور سبز پتوں میں سے آواز آئی۔

گھگھوں گھوں ——— گھگھوں گھوں

شاہراہ
دسمبر

شوکت صدیقی

غمِ دل اگر نہ ہوتا!

شام ہی سے تیکھی ہوائیں چل رہی تھیں۔ اوپر، بلندیوں پر بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ ابھی رات زیادہ نہ گذری تھی کہ ایکا ایکی تیز بارش شروع ہوگئی اور اس سنسان سڑک پر جو سول لائن کو جاتی تھی بھیگے ہوئے اکا دکا راہگیروں کی طرح رندھیر بھی بدحواس سا چل رہا تھا۔ سردی کی شدت سے اس کا جسم ٹھٹھرنے لگا تھا۔ بارش برابر بڑھتی جا رہی تھی اور بپھری ہوئی طوفانی ہوائیں درختوں میں چیخ رہی تھیں۔ پھر ایکبارگی بجلی کی تمام روشنیاں بجھ گئیں۔ اور جھومتی ہوئی پرچھائیاں گہری تاریکی میں ڈوب گئیں۔ گھنگھور اندھیرے میں ہواؤں کا شور آسیب زدہ معلوم ہونے لگا۔ اور سول لائن کو جانے والی سڑک اچانک غائب ہوگئی۔ رندھیر کے قدم خود بخود سست پڑ گئے اس کے چاروں طرف اندھیرے کا جال پھیلا ہوا تھا۔ بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اور سردی اتنی بے تحاشہ پڑ رہی تھی کہ اب وہ کہیں نہ کہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔

اور گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی سنسان سڑک پر رندھیر کوہستانی ڈھلوان کی طرح سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا چلتا رہا۔ پھر ایک نیم کشادہ موڑ پر اندھیرے میں سے ایکا ایکی دھندلی سی روشنی جھلملانے لگی۔ اور یہ روشنی اتنی مدھم اور پُر اسرار تھی جیسے مُردے کے چہرے پر نور! وہ بلا جھجک اسی طرف مڑ گیا۔ اور پھر احاطے کی کانٹوں دار باڑھ کو پھاند کر اندر چلا گیا۔ روشنی

سامنے والی کھڑکی کے شیشوں سے اُبھر رہی تھی جس کے آگے جھکا ہوا سائبان تھا۔ وہ وہیں جاکر کھڑا ہو گیا اندر کمرے میں آہستہ آہستہ پیانو بج رہا تھا۔ اور اس طوفانی رات میں مدھم سُروں کی جھنکار دبے دبے قہقہوں کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ رندھیر دیوار کے سائے میں دبکا ہوا سردی سے کپکپاتا رہا۔ ہوا کے تیز جھونکوں میں بارش کی بوچھار برابر آتی رہی۔

رندھیر اسی طرح سائبان کے نیچے کھڑا ہوا مینہہ کی بوچھار میں بھیگتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔ اندر کمرے میں پیانو مدھم سروں میں بجتا رہا۔ دھندلی روشنی کھڑکی کے شیشوں پر لرزتی رہی۔ پھر بارش میں بھیگا ہوا ایک کتا اس کے برابر سے اپنے کانوں کو پھڑپھڑاتا ہوا گذرا۔ لمبے اُوور کوٹ میں دیوار سے سمٹا ہوا رندھیر بڑا پُر اسرار نظر آرہا تھا۔ کتا اس کو دیکھتے ہی زور زور سے بھونکنے لگا۔ رندھیر بدحواس ہو کر دیوار سے چمٹ گیا کتے کے بھونکنے کی بے ہنگم آواز سناٹے میں برابر گونجتی رہی۔ اور ایکبارگی کمرے کا دروازہ کھول کر کسی نے جھانک کر کہا۔

"کون ہے ؟"

اور رندھیر سے کچھ بھی نہ کہا گیا۔

اس دفعہ کمرے کے دروازے سے جھانکنے والے نے چیخ کر کہا "یہ کھڑکی کے پاس اندھیرے میں کون کھڑا ہے۔ بولتے کیوں نہیں ؟"

رندھیر بجائے کچھ کہنے کے اس کے پاس ہی چلا گیا۔ یہ کوٹھی کا کوئی ملازم تھا۔ اور دروازہ کی دہلیز پر سردی سے سُکڑا سُکڑا یا کھڑا تھا۔ اندر کمرے میں دھندلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ رندھیر ایک دم سے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کی فضا میں گرمی تھی اسکون تھا اور ادھر کھڑکی کے پاس پیانو رکھا ہوا تھا جس پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ برابر ہی ایک لڑکی خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے پیانو بجانا بند کر دیا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بیماروں کی طرح مضمحل نظر آرہا تھا۔ رندھیر نے آتش دان کے

برابر جا کر اپنا اوورکوٹ اتارا اور قریب رکھی ہوئی کرسی پر پھیلا دیا۔ اور خود ایک مٹی کرسی گھسکا کر اس پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ دروازے کے قریب کھڑے ہوئے ملازم نے اس کو حیرت سے دیکھا۔ اور پھر تیزی سے کہنے لگا۔

"آپ اندر کیوں آگئے ؟"

رندھیر نے مڑ کر اس کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھا۔ "ذرا باہر بارش میں کھڑے ہو کر دیکھو تو تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ میں یہاں کیوں آگیا؟" اور اس کو اسی طرح دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے نیازی سے مسکرا دیا۔ "بارش رکتے ہی میں چلا جاؤں گا۔ مجھے رات بھر تو یہاں رہنا نہیں ہے۔"

اور اس دفعہ پیانو کے قریب بیٹھی ہوئی لڑکی کمودنی نے آہستہ سے کہا۔ "گردھر دروازہ بند کر دو۔ بہت ہوا آ رہی ہے۔"

گردھر نے دروازہ بند کیا۔ اور کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ اور رندھیر آتش دان پر جھک کر آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "اگر مجھے یہ آگ نہ ملتی تو میں آج سردی سے اکڑ کر رہ جاتا کتنی تیز بارش ہو رہی ہے۔ پھر ہوا کے یہ جھکڑ اور اس طوفان میں بجلی کو بھی فیل ہو جانا رہ گیا تھا کتنا گہرا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ کمرے کی خاموشی میں اس کی تھرتھراتی ہوئی آواز اس طرح ابھرتی رہی جیسے کوئی خواب کے عالم میں بڑبڑا رہا ہو۔

اور اداس چہرے والی لڑکی کمودنی پیانو کے قریب اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ موم بتی کی دھندلی روشنی اس کے اداس چہرے پر لہراتی رہی۔ باہر بپھری ہوئی ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ اور بارش کے قطرے کھڑکی کے شیشوں پر مچل رہے تھے۔ رندھیر نے پاس پڑی ہوئی آہنی سلاخ اٹھائی۔ اور آتش دان کے اندر سلگتے ہوئے کوئلوں کو کریدنے لگا۔ اور انگاروں سے چنگاریاں اڑ اڑ کر بکھرنے لگیں۔

ذرا سی دیر کے بعد سردی سے کپکپاتا ہوا گردھر پھر کمرے کے اندر آگیا اور کمودنی سے

کہنے لگا۔ "کھانا کھا لیجئے۔ اب روشنی نہ جانے کب۔ آئے گی۔ رات زیادہ ہو چکی ہے۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "نہیں میں آج کھانا نہیں کھاؤں گی۔ کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔"

مگر گردھر نہ مانا۔ کہنے لگا۔ "تھوڑا بہت ہی کھا لیجئے۔ میں نے پالک آپ ہی کے لئے بنایا ہے۔ ذرا سا چکھ کر تو دیکھ لیجئے۔"

لیکن کمودنی آمادہ نہ ہوئی۔ "نہیں میں کچھ بھی نہیں کھاؤں گی۔ تم مجھے صرف ایک کپ کافی پلا دو۔ اور دیکھو دودھ کم ڈالنا۔"

اور اس کے ساتھ ہی رندھیر نے بھی کہہ دیا۔ "ایک کپ کافی اور لیتے آنا۔ میں اس قدر بھیگ گیا ہوں کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے نمونیہ نہ ہو جائے۔" کافی کے لئے اس طرح کہتے ہوئے رندھیر کو ایکبارگی خیال آ گیا کہ وہ بہت بے تکلفی برت رہا ہے۔ لیکن انگاروں پر ہاتھ پھیلا کر تاپتے ہوئے وہ خود آپ ہی مسکرا بھی دیا۔ اگر یہ بدتمیزی ہے اور کوئی برا مانتا ہے تو اس کو برا ماننے دو اسے اب یہاں دوبارہ تو آنا نہیں ہے۔ اور پھر ضرورت کے لئے جھجک کیسی۔

گردھر نے اس کی طرف بیزاری سے دیکھا۔ اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ مگر جب وہ واپس آیا تو ٹرے میں دو کپ موجود تھے اور نیم روشن کمرے کی گرم فضا میں کافی کی ہلکی ہلکی بھاپ سے اٹھنے والی تیز مہک ہر طرف بکھر رہی تھی۔

رندھیر نے کافی کے پیالے کو ختم کر کے کرسی پر پھیلے ہوئے اپنے اوورکوٹ کا رخ بدل دیا۔ اور آتش دان کے اندر سلگتے ہوئے انگاروں کو آہنی سلاخ سے آہستہ آہستہ کریدنے لگا۔ کوئلوں کے چٹخنے سے کمرے کی خاموشی چونک پڑتی اور رندھیر کا تھکا ہوا سا چہرہ تیز آنچ میں دہکنے لگا۔ کمودنی اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔ مدھم روشنی میں اس کا دھندلا سا سایہ فرش پر لہراتا رہا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ایک دوسرے سے بے نیاز۔ باہر درختوں میں ہوائیں سیٹیاں بجاتی رہیں۔ البتہ بارش رک گئی تھی۔ بکھرے ہوئے بادل تیزی سے پرواز کر رہے تھے۔ اور گہرا نیلا آسمان ستاروں کی روشنی میں نکھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔!!

پھر رندھیر نے اپنا اوورکوٹ پہنا اور دروازے کو کھول کر اس نے بغیر کمودنی کیطرف مڑے ہوئے آہستہ سے کہا۔" دروازہ بند کر لیجئے۔ اندر سرد ہوا آئے گی "۔ اور وہ باہر چلا گیا۔
اس کے ہلکے سے طنز پہ کمودنی نے کوئی توجہ نہ دی اور اسی طرح پیانو کے قریب خاموش بیٹھی رہی اور جب رندھیر کے قدموں کی آہٹ سنسان سڑک پر مدھم پڑ گئی تو اس نے اُٹھ کر دروازہ بند کیا۔ زمستانی ہواؤں سے اس کا جسم تیزی سے تھر تھرانے لگا تھا۔ اس نے کمرے میں بچھے ہوئے قالین کو دیکھا جس پر کیچڑ کے بدنما نشان بنے ہوئے تھے۔ اور پھر آتش دان کے پاس وہ کسی مجروح پرندے کی طرح تھکی ہوئی سی اس کرسی پر دراز ہوگئی جس پر ابھی کچھ دیر پہلے رندھیر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اجنبی نوجوان، جو اپنے بوسیدہ اوورکوٹ اور ڈھیلے ڈھالے لباس میں کسی کمپنی کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔ جس نے فرش پر بچھے ہوئے قالین کا ستیاناس کر دیا تھا جو آتش دان کے پاس بیٹھا بڑے ٹھاٹھ سے باتیں کر رہا تھا اور کمودنی سوچنے لگی کہ اگر وہ اس سردی میں اس طرح بھیگا ہوا نہ ہوتا تو وہ اسے کمرے کے اندر نہ آنے دیتی اس نے یہاں آکر خواہ مخواہ موڈ خراب کر دیا تھا۔ ایسی طوفانی رات میں جب تیز ہوائیں پھڑ پھڑاتی ہوئی چل رہی ہوں گرجتے ہوئے بادلوں سے لگاتار بارش ہو رہی ہو اور روشنیاں ایکبارگی بجھ جائیں تو آتش دان کے قریب کمرے کی گرم فضا میں بیٹھ کر مدھم سروں میں پیانو بجانا کتنا رومانٹک معلوم ہوتا ہے اور جب طبیعت بھی اداس ہو اور بادل روتے ہوئے معلوم ہوں اور چیختی ہوئی ہوائیں درد سے کراہتی ہوئی معلوم ہوں تو پیانو کے سروں سے اُبھرتے ہوئے اداس ننھے خوابناک نغماؤں کا جال بن دیتے ہیں۔ اور ان خوابناک جالوں سے باہر نکلنے کو کبھی دل نہیں چاہتا۔ لیکن جس طرح دیپ نے اچانک اس کی زندگی میں آکر، اس کی مسکراہٹ کو کچل ڈالا۔ اس نے اپنے چیرمین کی لڑکی انورادھا سے اس لئے کورٹ شپ کر لی کہ وہ ایگزیکیوٹیو آفیسر بننا چاہتا تھا۔ اسے بیکار گریجویٹ رہنا پسند نہ تھا۔ بالکل اسی طرح اس اجنبی نوجوان نے اس کے خوابوں کو درہم برہم کر دیا۔ اس لئے کہ وہ بارش سے بھیگا ہوا تھا۔ تیز سردی سے اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اسے گرمی کی ضرورت تھی۔ وہ بارش میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ لیکن کتنے بے رحم

ہوتے ہیں یہ لوگ جو اپنی خواہشوں کے لئے کسی کے دُکھ کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ کمودنی، کسی مجروح پرندے کی طرح کرسی پر نیم دراز اسی طرح جھنجھلاتی رہی اور آتش دان میں کوئلے چٹخنے بے باہر ہوائیں اپنے بازو پھڑپھڑاتی رہیں۔ اور موم بتی ایکبارگی زور سے بھڑک کر بجھ گئی۔ کمرے کے اندر اندھیرا چھا گیا۔ دہکتے ہوئے انگاروں کی تیز آنچ میں کمودنی کا دھندلا چہرہ اور بیمار نظر آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ اس تاریکی میں وہ پیانو پر زور سے سر کو پٹخ کر رونے لگے۔

رات آہستہ آہستہ گذر گئی۔ بادلوں کا ہجوم جس طرح تیز ہواؤں کے ساتھ آیا تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے دیس کو پرواز کر گیا۔ اور جاڑوں کی بسنتی دھوپ ہر طرف بکھر گئی۔ خوبصورت عمارتوں پر۔ جن کے ڈرائنگ روموں میں ہر موضوع پر باتیں کرنے میں لطف آتا ہے۔ جہاں طویل راتوں میں آتش دان کے پاس بیٹھنا بڑا رومانٹک معلوم ہوتا ہے۔ بھورے کارخانوں پر، جن کی فلک بوس چمنیاں دُھواں اگلتی ہیں۔ جہاں مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں مزدوروں کا شور گونجتا ہے۔ تنگ و تاریک کوچوں پر، جن میں دھوپ چوروں کی طرح جاتی ہے، جہاں غلیظ عورتیں چیخ چیخ کر باتیں کرتی ہیں اور ننگ دھڑنگ مریل بچوں کو فحش گالیاں دیتی ہیں۔ اور کمودنی اپنی کوٹھی کے لان میں چمکیلی دھوپ میں تھکی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ ادھر کچھ عرصے سے وہ بیمار تھی اور ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ سامنے سڑک پر ایک جھلکتی ہوئی کار سنسناتی ہوئی گذر رہی تھی۔ اور ایک گھبرایا ہوا راہگیر اُسے احمقوں کی طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

اور جب دھوپ کے سائے ڈھلنے لگے تو کمودنی اور مضمحل ہوگئی۔ تنہائی سے اس کا جی گھبرانے لگا۔ پھر ذرا گھومنے کے خیال سے وہ نیو مارکیٹ، شاپنگ کے لئے چلی گئی۔ جہاں سڑک کے نکڑ پر راہگیروں کا ہجوم جمع تھا۔ اور ان کے درمیان میں چند لڑکے کھڑے تھے۔ جن کے لباس بے ترتیب تھے اور چہروں پر دکھا پن چھایا ہوا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اخبار بیچ رہے تھے۔

"چین میں سُرخ فوجوں کی فتح، جنتا کی فتح ہے۔ ساری دُنیا کے محنت کشوں کی

فتح ہے۔"

"بمبئی کے پانچ ملوں میں ہڑتال، سرمایہ داروں کی حفاظت کے لئے ملوں کے پھاٹک پر مسلح پولیس کا پہرہ۔ مزدور اپنی مانگیں منوا کے رہیں گے۔ مزدوروں کی آواز کو بندوق اور لاٹھی سے نہیں روکا جاسکتا۔"

"پنڈت نہرو ڈالر کے دیس امریکہ میں۔ امریکہ کے پونجی پتیوں سے ہندوستان کے سودے کا بھاؤ تاؤ۔"

"کمیونسٹ پارٹی کا اخبار "کراس روڈز" پڑھیئے۔ جو جنتا کا اخبار ہے، جو آپ کا اخبار ہے، جو ہندوستان کے محنت کشوں کا اخبار ہے۔ جو عوام کی لڑائیوں کے حق کے لئے لڑتا ہے جو بھوک اور غلامی کے خلاف آواز اُٹھاتا ہے۔"

"کمیونسٹ پارٹی کا اخبار "کراس روڈز" پڑھیئے۔"

کمودنی نے ان آوازوں کو سُنا اور راہگیروں کی بھیڑ سے ذرا ہٹ کر ٹھہر گئی۔ ان بے ترتیب لباس والے لڑکوں میں اُسے رندھیر بھی نظر آیا۔ جو گلا پھاڑ پھاڑ کر اخبار فروخت کر رہا تھا۔ کمودنی نے اسے پہچان لیا۔ اور اس کے قریب جا کر ایک اخبار مانگا۔ اسی طرح جیسے سنیما دیکھنے کے لئے ٹکٹ خریدنا ضروری ہے۔ یا شاید وہ رندھیر کو بتا دینا چاہتی تھی کہ کامریڈ، تم جو اس رات میرے کمرے کے اندر آکر بڑے ٹھاٹھ سے باتیں کر رہے تھے۔ تمھاری حقیقت صرف اتنی ہے کہ میں صرف چار آنے خرچ کر کے تم پر احسان کر سکتی ہوں۔ اس لئے کہ مجھے اس اخبار سے کوئی دلچسپی نہیں، اس لئے کہ یہ اخبار محنت کشوں کا ہے۔ اور میرے ذرا سے حکم کے لئے درجنوں ملازم مستعد رہتے ہیں۔ لیکن رندھیر نے اخبار دیکر بلا کسی جھجک کے اس کے سامنے کئی بک لٹ اور پمفلٹ بڑھا دیئے۔

"یہ پمفلٹ نئے ہیں۔ ان کو بھی پڑھیئے۔"

کمودنی نے ان کو بھی خرید لیا۔ اور رندھیر کہنے لگا۔ "آپ پارٹی کا اور لٹریچر لینا چاہیں

تو وہیں پھر کسی وقت دے سکتا ہوں۔"

وہ بالکل کاروباری سی باتیں کر رہا تھا۔ اور کمودنی نے سوچا کہ شاید اس نے ابھی اس کو پہچانا نہیں۔ وہ کہنے لگی۔ "جی ہاں، میں آپ کا لٹریچر پڑھنا چاہتی ہوں۔ کسی دن کوٹھی پہ آیئے، میری کوٹھی تو شاید آپ نے دیکھی ہے۔"

اور رندھیر ہنسنے لگا۔ "جی ہاں اس روز رات کو بارش میں، میں آپ کے یہاں جا چکا ہوں۔ میں آپ کے یہاں ضرور آؤں گا۔"

اور اس کے بعد باتیں ختم ہو گئیں۔ رندھیر پھر چلا چلا کر اخبار بیچنے لگا۔ اور کمودنی گھر چلی آئی۔ اور اس اُداس شام کو جب کہر کا دھند لکا گہرے خوابوں کی طرح پھیلتا جا رہا تھا اور شہر کا دبا دبا شور کہیں دور سسکیوں کی طرح گونج رہا تھا۔ اور نزدیک کسی درخت پر ایک چیل اپنے پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی چیخ رہی تھی۔ کمودنی دریچے پر جھکی ہوئی سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگی بھی تو اس اداس شام کی طرح تھکی تھکی سی ہے جس میں شہر کے دبے دبے شور کی طرح سسکیاں ہیں۔ یا پھر اس پھڑپھڑاتی ہوئی چیل کی طرح ایکبارگی تیز چیخ دھڑکنے لگتی ہے آخر وہ ان اُلجھے ہوئے جالوں سے کب رہائی پائے گی۔ کس طرح اور کیسے، سچ مچ اب تو زندگی بہت بور ہو گئی ہے۔ وہ اسی طرح دریچے پہ کھڑی رہی۔ شام کے کہر بار دھند لکے اور تاریک ہو گئے۔ اور سڑک پر راہگیروں کے قدموں کی آہٹ پُراسرار معلوم ہونے لگی۔

پھر ایک روز، دن ڈھلے اس کی کوٹھی پر رندھیر آ گیا اس کے چہرے پر گرد کا غبار چھایا ہوا تھا۔ بال اُلجھے ہوئے تھے۔ اور ہاتھوں میں تھیلا دبا ہوا تھا جس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ بہت تھکا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ مگر اس نے بیٹھتے ہی کتابیں نکال کر سامنے میز پر پھیلانا شروع کر دیں۔

کمودنی کہنے لگی۔ "میں نے آپ کا اخبار پڑھا تھا۔ اور مجھے اس کی خبریں پڑھ کر بڑا تعجب ہوا۔ ہمارے یہاں کئی اخبار آتے ہیں۔ ان میں ایسی خبریں نہیں ہوتیں۔ آپ لوگ یہ

خبریں کہاں سے لے آتے ہیں؟"

رندھیر مسکرا کر بولا۔" ہم خبریں لائیں گے کہاں سے ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ یہ بات دوسری کہ نیشنلسٹ پریس میں آپ کو یہ خبریں نہیں نظر آتیں۔ یہ خبریں وہ بھی جانتے ہیں اور اگر نہیں جانتے تو جاننا نہیں چاہتے اس لئے کہ اس میں سرمایہ داروں کے نقصان کا سوال ہے آپ نے اب تک بولا اور ڈالمیا ہی کے اخبار تو دیکھے ہیں نا؟"

اور اس کے بعد رندھیر نے میز پر بکھری ہوئی کتابوں کی باتیں شروع کر دیں اور کمودنی نے کوئی بیس روپے کی کتابیں خرید لیں۔ اور جب وہ چلنے لگا تو کمودنی نے کہہ دیا۔

"آپ بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ چائے پی لیجئے تو اچھا ہے۔ میں آپ سے کچھ باتیں بھی کرنا چاہتی ہوں۔"

اور رندھیر چائے پینے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس لئے کہ وہ کوئی میل بھر پیدل چل کر آیا تھا اور اسے چائے کی ضرورت بھی محسوس ہو رہی تھی۔

پھر چائے بھی آ گئی جس کے ساتھ شام کے ناشتہ کا بھی کچھ سامان تھا۔ اور وہ دونوں چائے پینے لگے۔ کمودنی ایک بار ذرا سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔

"دیکھئے ادھر میں "بورڈم" محسوس کر رہی ہوں۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ میں بیمار ہوں لیکن میں سوچتی ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ دراصل میں اس زندگی سے کچھ اکتا گئی ہوں۔ میں زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی چاہتی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ کروں۔"

رندھیر اس کی بات کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے چائے پیتا رہا اور سوچتا رہا کہ مس کمودنی تم کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ کر سکتی ہو۔ اب کی کوئی بڑے نیتا شہر میں آئیں تو ان کے آنر میں ایک ایٹ ہوم دیدو۔ اس طرح تم کو سوسائٹی میں پاپولر ہونے کا راستہ مل جائیگا پھر تم کو جلسوں کی صدارت کے لئے بلوایا جائے گا ہو سکتا ہے کہ نئے الیکشن تک تم ایم، ایل اے بھی ہو جاؤ۔ یا پھر عورتوں کی ایک ایسوسی ایشن بنا ڈالو۔ جس میں عورتوں کے حقوق پہ زوردار

تقریریں کرو، پریس کانفرنس بلاؤ ۔ اس طرح اخباروں میں تمہارے لمبے چوڑے سٹیٹمینٹس شائع ہونے لگیں گے۔ تمہارے آٹو گراف لئے جائیں گے۔ یا پھر تم اعلیٰ نسل کے کتے پالنے شروع کر دو۔ ان کو ڈاگس شو میں ضرور لے جاؤ۔ اس طرح کم از کم آن لکر میں تمہاری بڑی شاندار سی تصویر ہی چھپ جائے گی۔ یا پھر ——— !! اور یہ سوچتے سوچتے اس کی نظر کمودنی پر پڑ گئی جو ابھی تک اپنے جواب کی منتظر تھی۔ رندھیر کہنے لگا:۔

"اگر نیشنل میگزینوں اور ڈیٹیکٹو ناولوں سے آپ کچھ وقت بچا سکیں تو ان کتابوں کو ضرور پڑھئے اور ہو سکے تو ہر ہفتہ "کراس روڈ" ضرور پڑھ لیا کیجئے۔" پھر رندھیر کو چائے کی میز کا خیال آیا جس پر ناشتہ کا سب سامان ختم ہو چکا تھا۔ اس بات پر اسے ہنسی آ گئی۔ کہنے لگا۔ "میں نے ساری پیٹیں صاف کر دیں۔ دراصل میں بہت سویرے سے ہی ٹکسٹائل مل چلا گیا تھا۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے میں سیدھا یہیں چلا آیا۔ نہیں تو آج بھی نہ آ سکتا۔"

کمودنی نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ "تو کچھ اور کھائیے۔"

رندھیر ہنسنے لگا۔ "نہیں اب کچھ نہیں۔ اور اب میں چلوں گا۔ مجھے بہت دیر ہو گئی۔" اور وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

رندھیر کے جانے کے بعد وہ اسی طرح نڈھال سی صوفہ پر پڑی رہی۔ ڈھلتی ہوئی دھوپ کے سائے سامنے وزیٹرول میں لہرا رہے تھے۔ اور دن کی روشنیاں مغرب کے غاروں میں ڈوبی جا رہی تھیں۔ اور وہ خود بہت اداس ہو رہی تھی۔ آخر کوئی اس سے ہمدردی کیوں نہیں کرتا۔ ایک ماں ہے وہ خود بیمار ہے۔ جب سے ان پر فالج گرا ہے وہ ہر وقت پڑی رہتی ہیں۔ وہ خود اس کی محتاج ہیں۔ اور ڈاکٹر کہتا ہے کہ بشاش رہو، خوب قہقہے لگاؤ۔ اور لڑکیاں ملتی ہیں تو کہتی ہیں کہ تم فلاسفر ہوتی جا رہی ہو، بالکل اسمارٹ نہیں رہی ہو اور یہ فلرٹ ٹائپ کے لڑکے تو بس اسی قدر سوچ سکتے ہیں کہ وہ ٹیسٹ کی ہیر انڈا معلوم ہوتی ہے۔ ٹینی سن کی نوٹس ایٹر ہے۔ کچھ اور زیادہ سویٹ، کچھ اور زیادہ "لولی" اور یہ کامریڈ صرف اپنے لٹریچر کی بات

کرتا ہے۔ مزدور اور کسانوں کی بات کرتا ہے۔ اُجڈ کہیں کا، اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا ہے۔ کس باپ کی بیٹی ہے؟ اس باپ کی جس کے مرنے پر سرکاری دفتروں میں آدھے دن کی چھٹی ہو گئی تھی اور یونین جیک سرنگوں کر دیا گیا تھا۔ اور اس کا بھائی کیمبرج میں پڑھتا ہے اور آج تین سال سے لندن میں مقیم ہے۔ اس کی کوٹھی اتنی خوبصورت ہے کہ اس کا فوٹوگراف "بلڈرز" میں چھپ چکا ہے۔ اس کے ڈرائنگ روم میں اپالو کا جو یونانی مجسمہ ہے وہ چار برس میں تیار ہوا تھا اور اس نے ابھی بیوک کا نیا ماڈل خریدا ہے۔ وہ اسی طرح صوفے پر نڈھال سی پڑی رہی اور ڈاکٹر کے منع کرنے کے باوجود بھی بے پناہ سوچتی رہی۔

اور جب اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ اُٹھی۔ کتابوں کو اٹھا کر خوبصورت سی الماریوں میں ترتیب سے لگا دیا۔ اور کچھ بک لٹ اور پمفلٹ پڑھنے کے خیال سے میز پر رکھ دیئے۔ حالانکہ وہ ان کو توجہ سے نہ پڑھ سکی مگر ان سے اتنا تو ضرور ہوا کہ لڑکیوں میں چرچا ہونے لگا کہ "بھئی کمودنی تو کامریڈ ہو گئی ہے۔ وہ تو آج کل کمیونزم پر یہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتی ہے۔" اور پھر پارٹیوں میں اسے باقاعدہ کامریڈ کہا جانے لگا۔ اور کمودنی نے سوچا کہ یہ تھرل برا تو نہیں۔ اس طرح اس کا خاصہ رعب پڑ رہا ہے۔ اور وہ خود کو کمیونسٹ پوز کرنے بھی لگی۔ اور شاید اسی لئے اس نے رندھیر سے خریدے ہوئے لٹریچر کو خواہش نہ ہونے کے باوجود کورس کی کتابوں کی طرح پڑھنا شروع کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد رندھیر پھر اس کے یہاں آیا۔ اس دفعہ وہ "کانفرنس" کے لئے چندہ لینے آیا تھا۔ کمودنی نے فنڈ کے لئے اس کو صرف پانچ روپے دیئے اور ان روپوں کو جیب میں رکھتے ہوئے رندھیر نے سوچا کہ اگر اس لڑکی کو یہ یقین ہوتا کہ چندہ دینے والوں کا نام اخبار میں چھپے گا تو بلاشبہ وہ سو روپے تک دے دیتی۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس نے کچھ دیا تو۔ دوسرے لوگوں کی طرح خواہ مخواہ دماغ تو نہیں چاٹا۔

کمودنی کہنے لگی۔ "دیکھئے میں نے آپ کی کتابیں بڑی باقاعدگی سے پڑھنا شروع

کر دی ہیں ۔ کچھ اور لٹریچر ہو سکے تو کبھی لیتے آئیے ۔" اور رندھیر نے وعدہ بھی کر لیا ۔

پھر ذرا دیر رک کر وہ کہنے لگی ۔" ان کتابوں سے مجھ میں کچھ تبدیلی تو ہو رہی ہے ۔ لیکن میں اپنی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی چاہتی ہوں ۔ میں سوچتی ہوں کہ ہمارا سوشل سسٹ اپ ہی غلط ہے ۔ اس سماج کو بدل ہی جانا چاہیئے ۔ جس سماج میں لوگ مہنگائی سے بھوکے مرتے ہوں اور مزدوروں کو کڑی محنت کر کے بھی آرام نہیں ملتا ۔ اور جہاں عہدوں کے لالچ میں محبتوں کو ٹھکرا دیا جائے ۔" شاید اس آخری بات ہی کے لیئے اس نے اور بھی سب کچھ کہا تھا ۔ جو اُس نے صرف پڑھا تھا ۔ محسوس نہیں کیا تھا اور پھر اس نے آہستہ سے کہہ ہی دیا

" دراصل میں کمیونسٹ بن جانا چاہتی ہوں ۔ میں پارٹی میں کچھ کام کرنا چاہتی ہوں ۔"

اور رندھیر کھل کھلا کر ہنس دیا ۔" سُنیئے مس کمودنی ، کمیونسٹ پارٹی کوئی ایسا ہسپتال تو ہے نہیں جہاں عشق کے مریضوں کا علاج ہوتا ہو ۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کی جماعت ہے ۔ مزدوروں اور کسانوں کی ۔"

وہ کہنے لگی " اگر میں کچھ کرنا چاہتی ہوں تو آپ مجھے اس طرح نا اُمید کیوں کرتے ہیں ۔ میں مزدوروں اور کسانوں کی مدد ہی تو کرنا چاہتی ہوں ۔"

رندھیر ایکبارگی سنجیدہ ہو گیا ۔" ہمارے لیئے آپ کی ہمدردی ہی بہت ہے ۔ آپ پارٹی فنڈ کے لیئے کچھ نہ کچھ دیتی رہیں ۔ یہ بھی کم مدد نہ ہوگی ۔ آپ اسے چھوٹی مدد کیوں سمجھتی ہیں "

کمودنی ایک بار دل برداشتہ ہو کر بولی ۔" یہ تو ٹھیک ہے ۔ لیکن میں اپنی زندگی میں تبدیلی چاہتی ہوں ۔ بہت بڑی تبدیلی ۔ دیکھیئے نا میں کتنی اداس اور تھکی ہوئی رہتی ہوں ۔"

رندھیر اور سنجیدہ ہو گیا ۔" آپ اُداس اس لیئے ہیں کہ آپ کے سامنے کوئی فیوچر نہیں ۔ آپ تھکی ہوئی اس لیئے ہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی جد و جہد نہیں ۔ اور جب حرکت نہ رہے تو ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے ۔ آپ اور آپ کے کلاس کے لاتعداد لوگ ایک ایسے قلعہ میں قید ہیں کہ جس میں ہزاروں سجے سجائے ایک ہی سے کمرے ہیں ۔ جب تک ان میں دل بہلتا

یہی بہتر ہے اور جہاں ان سے نکلنے کی کوشش کی تو ان بھول بھلیوں میں زندگی بھر سر پھوڑا کیجیے راستہ نظر نہ آئے گا۔ وہ پکنک ہو یا پارٹی۔ بال روم ہو یا کلب، آرٹ ہو یا لٹریچر۔ فلرٹیشن ہو یا کورٹ شپ۔ ایک کمرے کے بعد دوسرا کمرہ۔ ایک راستے کے بعد دوسرا راستہ زندگی بس انہیں راستوں میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ اور اگر واقعی آپ اپنی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی چاہتی ہیں تو اپنے کلاس سے نفرت کیجئے۔ اپنے ماحول سے نفرت کیجئے۔ اور جب نفرت انتہا کو پہنچ جائے گی۔ تو آپ سمجھ سکیں گی کہ جنتا کا دُکھ درد کیا ہے۔ اور ہمدردی کا خیال تو محض ڈھکوسلہ ہے اور کچھ نہیں۔"

بات اچانک ایک ایسے رُخ پر آگئی کہ کمودنی حواس باختہ سی ہوگئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ خاموش بیٹھی رہی اور رندھیرا ٹھ کر چلا گیا۔

کمودنی بیٹھی سوچتی رہی کہ جس بات کو وہ اس قدر آسان سمجھ رہی تھی وہ اتنی آسان نہیں ہے۔ آخر وہ یہ نفرت کا جذبہ خود میں کس طرح پیدا کر سکے گی۔ اس میں اتنی ہمت کس طرح آجائے گی۔ اور یہ غور کرتے کرتے وہ تھک سی گئی۔ اور پھر اس نے لٹریچر کو اور بھی مستعدی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور پارٹیز میں جانے سے کترانے لگی۔ اس بات پر اس کو نشانۂ استہزا بنایا جانے لگا۔ پورے محاذ کے خلاف وہ مضبوطی سے اُٹھ نہ سکتی تھی۔ اس بہاؤ میں اس کے قدم اُکھڑ جاتے۔ پھر ایک روز جب کنور بلراج کے ساتھ کچھ لڑکیاں بھی اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور چارلس بوائر کی نئی پکچر سے لے کر ملکی سیاست تک پہ باتیں ہو رہی تھیں تو یکایک رندھیر کتابوں کا تھیلا سنبھالے ہوئے وہاں آگیا ہمیشہ کی طرح اس کے بالوں میں خاک جمی ہوئی تھی۔ چہرے پر روکھا پن تھا۔ اور لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اس شاندار کمرے میں وہ بالکل غیر ضروری معلوم ہو رہا تھا۔ کمودنی نے اس کو سب سے ملایا۔ اور پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

بلراج نے باتیں کرتے کرتے اچانک اس سے پوچھ لیا۔" اچھا ایک بات بتایئے

کیا کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے آپ لوگوں کو یہ انسٹرکشنز دی جاتی ہیں کہ بال لمبے لمبے اور اُلجھے ہوئے ہوں، شیو بڑھا ہوا اور کپڑے ملگجے ہوں۔ کم از کم میں نے تو سب ہی کامریڈز کو اسی طرح دیکھا ہے۔"

رندھیر ہنسنے لگا۔ "ایسی بات تو نہیں۔ مزدوروں میں رہنا پڑتا ہے۔ ان کے ساتھ گندی جگہوں پر بیٹھ کر باتیں کرنا پڑتی ہیں۔ اس لئے کچھ جی نہیں چاہتا اور صاف بات تو یہ ہے کہ قاعدے سے رہنے کے لئے ہمیں اتنے روپے بھی نہیں ملتے" اور پھر وہ چپ ہو گیا اس لئے کہ اس موضوع پر زیادہ کہنا نہیں چاہتا تھا ورنہ وہ اس کو سمجھا سکتا تھا کہ ٹیپ ٹاپ سے رہنے کا مطلب ہے، خوبصورت ڈرائنگ روموں میں بیٹھنے کی خواہش پھر کاروں کے نئے ماڈلز میں گھومنے کی تمنا۔ پھر ڈانس ہال، کلب، تفریحات۔ اور ان سب کے لئے اسے اپنا ضمیر بیچنا پڑتا۔ اپنے ارادوں کو کچلنا پڑتا۔ ایمانداری کو فریب دینا پڑتا۔ اور اس طرح بھی وہ پورے طور پر خود نمائی نہ کر سکتا تھا تو یہ کتنا اچھا ہے کہ وہ کسی بہت بڑی شاپ پر جا کر شوروم میں کسی مجسمہ کے بجائے خود کھڑا ہو جائے اور ہر گذرنے والے سے چیخ چیخ کر کہے۔ میری طرف دیکھو۔ میں جو بہترین سوٹ پہنے کھڑا ہوں۔ میں جو اس بھڑکیلی ٹائی کو باندھے ہوئے ہوں۔ بتاؤ میں کتنا گرینڈ معلوم ہو رہا ہوں۔ کتنا اسمارٹ لگتا ہوں۔ میری تعریف کرو۔ اس لئے کہ میں اسی لئے یہاں کھڑا ہوا ہوں۔ میں اپنی تعریف چاہتا ہوں۔ میں اپنی نمائش چاہتا ہوں۔"

بلراج کو اس کی بات سے تسلی نہیں ہوئی۔ مسکرا کر کہنے لگا۔ "ہو سکتا ہے کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ لیکن میں نے تو دیکھا ہے کہ پارٹیز میں اس طرح خاصہ رعب پڑتا ہے۔ بلکہ میں تو کتنے ہی ایسے کامریڈز کو جانتا ہوں، جو ٹھاٹھ سے فلرٹ کرتے ہیں۔ مزے سے محبتیں کرتے ہیں۔"

رندھیر بڑے اطمینان سے بولا۔ "ایسا ہوتا تو نہیں ہے۔ پھر ایسا ہو بھی کیسے

سکتا ہے۔ مجھ کو ہی دیکھئے۔ میں اس ڈرائنگ روم میں کتنا عجیب لگ رہا ہوں اور
پھر محبت تو ایک نیچرل ڈیزائر ہے۔ کمیونسٹ پارٹی ہم سے برہمچاری رہنے کا تو عہد کراتی
نہیں اور نہ ہم خانقاہوں میں رہنے والے مانکس ہیں۔" لیکن رندھیر بلراج کی بات
سے کچھ جھنجھلا گیا تھا۔ اگر نئی نئی ملاقات نہ ہوتی تو وہ اس سے صاف صاف کہدیتا کہ
محبت کرنے کا حق صرف تم کو ہی کیوں ہے۔ مجھ کو کیوں نہیں۔ میرے ایسے نوجوانوں
کو کیوں نہیں۔ کیا میرے سینے میں ایک دل ہے اور تمھارے سینے میں بہت سے۔ اس
لئے کہ تم بلراج کنور ہو، اس لئے کہ تمھارے پرکھوں میں سے کسی نے ۱۸۵۷ء کے غدر
میں انگریزوں سے وفاداری کر کے جاگیر پائی تھی اور جس کے نتیجے میں تم ایک شاندار بنگلے
میں رہتے ہو۔ اپنی جاگیر میں بسنے والے محنت کش کسانوں کی کمائی پر ٹھاٹھ کرتے پھرتے ہو۔
نت نئی لڑکیوں سے فلرٹ کرتے پھرتے ہو۔

کمودنی نے اس کی جھنجھلاہٹ کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے بات کا رخ بدلنے کے
لئے تھیلے میں سے کتابیں نکال کر دیکھنا شروع کر دیں۔ کمودنی کے علاوہ اور لڑکیوں نے بھی
کتابیں خریدیں۔ اور ایک لڑکی تو کہنے لگی۔

"ہو سکے تو کبھی ہمارے یہاں آئیے۔ کچھ ڈسکس کرنے کا ارادہ ہے۔"

مگر رندھیر نے انکار کر دیا۔ "ڈسکشن کے لئے میں آپ کو وقت نہ دے سکوں گا۔ اس
لئے کہ مجھے اور جو کام کرنا پڑتے ہیں وہ زیادہ ضروری ہیں۔"

بلراج زور سے ہنس دیا۔ "کیا غلطی کرتے ہیں آپ۔ کمودنی کو تو آپ نے کامریڈ بنا ہی
دیا۔ انھوں نے کیا خطا کی ہے۔ اور اس میں تو آپ لوگوں کا فائدہ ہی ہے۔ کیا آپ اپنی
طاقت کو بڑھانا نہیں چاہتے۔"

"میں نے کسی کو کامریڈ نہیں بنایا۔ اور ان کو یا آپ کو کمیونسٹ بنانے کی کوشش
شروع کی جائے تو انقلاب صدیوں تک نہ آسکے گا۔ آپ یا آپ کے کلاس کے لوگ تو ہماری

میں رکاوٹ ہی ڈال سکتے ہیں ۔ قوت نہیں پہنچا سکتے ۔"

بلراج اس کی بات پر چڑ گیا کہنے لگا ۔" آپ تو خواہ مخواہ "سوپیریارٹی کامپلکس" کا اظہار کر رہے ہیں ۔"

رندھیر نے تیزی سے کہا ۔" میں کسی کامپلکس کا اظہار نہیں کر رہا ہوں ۔ اس لئے کہ مجھ میں کوئی کامپلکس نہیں ۔ پانی وہیں زیادہ گندہ ہوتا ہے جہاں اسے نکلنے کا راستہ نہ ملے اور بہتی دھارا تو پوتر ہوتی ۔ اور آپ تو سیرا خیال ہے کہ گنگا جل ہی پیتے ہوں گے ۔"

اس بات پر سب ہنسنے لگے ۔ بلراج کھسیانہ سا ہو گیا ۔ رندھیر نے سوچا کہ کہیں بات اور نہ تلخ ہو جائے ۔ اس لئے اس نے وہاں سے چلا آنا ہی بہتر سمجھا ۔

اور پھر رندھیر مدت تک کمودنی کی کوٹھی پر نہ جا سکا ۔ اس لئے کہ اس کے کتنے ہی ساتھی گرفتار ہو کر جیل جا چکے تھے ۔ اس کی مصروفیتیں بہت بڑھ گئی تھیں ۔ اگر کبھی فنڈ جمع کرنا ہوتا یا لٹریچر بیچنا ہوتا تو وہ کمودنی کے پاس کسی اور کامریڈ کو بھیج دیتا ۔ اور انھیں دنوں کلکتہ میں کسان عورتوں کے جلوس پر فائرنگ ہوئی اور اس فائرنگ کے احتجاج میں کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے جلوس نکالا گیا جس میں رندھیر بھی شریک تھا ۔ لیکن کلکتہ کی فائرنگ جائز تھی اس لئے یہ جلوس ناجائز تھا ۔ اس طرح امن عامہ کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ تھا ۔ فساد ہو جانے کا ڈر تھا ۔ اور یہ بات غلط بھی نہ تھی ۔ کانپور میں اسی دن فساد شروع ہوا تھا جس دن بھگت سنگھ کو پھانسی دی گئی تھی ۔ اس دن بھی احتجاج ہوا تھا اور جلوس نکالے گئے تھے ۔ حالانکہ یہ برٹش راج کی باتیں ہیں ۔ مگر جس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس فساد کو دیکھا تھا وہ آج بھی موجود تھا اس لئے وہ خطرے کا بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا اور اسی خیال سے اس نے جلوس پر لاٹھی چارج کرا دیا اور یہ لاٹھی چارج اس وقت تک ہوتا رہا جب تک جلوس منتشر نہ ہو گیا ۔ اور کلکتے کی فائرنگ کے خلاف نعرہ لگانے والے زخموں سے نڈھال ہو کر اس سڑک پر نہ گر گئے ۔ جس کا گذشتہ نام لارنس روڈ تھا

اور اب گاندھی مارگ ہوگیا تھا۔ ان زخمیوں میں رندھیر بھی تھا جسے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال پہنچا یا گیا۔

مہینہ بھر تک ہسپتال میں رہنے کے بعد جب رندھیر وہاں سے نکلا تو اس کی ایک آنکھ پھوٹ چکی تھی۔ لاٹھی چارج نے اس کے چہرے پر اپنی یادگار چھوڑ دی تھی۔ اور ہر یادگار کی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ اور اس اہمیت کے ساتھ ایک داستان بھی وابستہ ہوتی ہے۔ یوں تو ہر معزز شہری کی موت پر اس کی یادگار قائم کی جاتی ہے جہاں اس کی خوبیوں کو پتھر کے کتبہ پر کھدوا کر نصب کر دیا جاتا ہے۔ پھر یہ کتبہ دھندلا جاتا ہے۔ یادگار ویران مقبرے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ جس کی کہنہ محرابوں میں چنڈول بسیرا لینے لگتے ہیں۔ اور اسی طرح چانگ سیچنگ نے بھی اپنی ایک داشتہ کی بے وفائی کی یادگار میں ایک اہرام بنوایا تھا۔ جو زیچیون کی لاکھوں عورتوں کے کٹے ہوئے پیروں سے تعمیر ہوا تھا اس لئے کہ اس کی داشتہ کے پیر بہت خوبصورت تھے۔ زیچیون مرگیا، اس کا بنوایا ہوا اہرام مٹ گیا لیکن صدیاں گذرنے پر بھی چین کی تاریخ ایک شہنشاہ کے ظلم کی یادگار کو بھول نہ سکی۔ وہ یادگاریں بڑی مقدس ہیں جو ظلم کی داستانوں کو برابر دہراتی رہیں۔ ایسی یادگاریں کبھی فراموش نہیں ہوتیں۔

لیکن رندھیر کو اپنی آنکھ کے ضائع ہوجانے کا اتنا غم نہ تھا۔ اپنے چہرے کے بدنما ہوجانے کا اتنا دکھ نہ تھا جتنا صدمہ اسے یہ سن کر ہوا کہ اس کا باپ مرگیا ہے۔ وہ ہسپتال میں زخموں کی تکلیف سے تڑپتا رہا اور گھر پر اس کا باپ موت کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی دن دوپہر کی ٹرین سے وہ گھر پہنچ گیا۔ رات ہوچکی تھی اور تنگ کمروں والے مکان پر ایک ہولناک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ جہاں اس کا باپ مرا تھا وہاں پر ایک دھندلا سا چراغ جل رہا تھا۔ اور اس کے قریب ہی اس کی ماں مردوں کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ اور اس کی بہن اور دونوں چھوٹے بھائی بلک بلک کر رو رہے

تھے۔ چراغ کی مدھم روشنی میں ان سب کے چہرے سایوں کی طرح دھندلے نظر آ رہے تھے
اور ان دھندلے سایوں میں رندھیر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ یہ صرف ایک پتی ہی کی موت
نہیں ہے بلکہ یہ ترسیٹھ روپے مہینہ پانے والے سول کورٹ کے ایک پیشکار کی بھی موت
ہے جو اِن اُداس چہروں سے بچھڑ گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی ترسیٹھ روپے ماہوار کی
آمدنی بھی بچھڑ گئی۔

وہ ہفتہ بھر تک گھر پر رہا اور اس ہفتہ بھر میں اس نے دیکھا کہ اس کا باپ اس
کے لئے ترکہ میں بیوہ ماں اور فاقہ زدہ بہن بھائیوں کے علاوہ کچھ ایسے لوگوں کو بھی اس کا منتظر
چھوڑ گیا ہے جنھوں نے اس کے پہنچتے ہی ہمدردی کے ساتھ ساتھ اپنے حسابات بھی بتلانا
شروع کر دیئے۔ ان حسابات سے سول کورٹ کے ایک ریٹائرڈ پیشکار نے جوا کھیلا تھا
موت سے بچنے کے لئے، ترسیٹھ روپے ماہوار کی پنشن کو برقرار رکھنے کے لئے، ایک خاندان
کی سرپرستی کے لئے۔ لیکن جواری ہار گیا اور رندھیر پر ایکبارگی کتنی ہی فکریں ٹوٹ پڑیں۔
مگر ماں اس کو پریشان نہ دیکھ سکی۔ اور اس نے وہ جھومر بھی اس کے سامنے ڈال دیا۔ جو
اس کی بہن کے جہیز کے لئے رہ گیا تھا۔ اور اس کی بہن نے اسکول جانا چھوڑ دیا تھا۔
اب وہ دوسرے سال پرائیوٹیلی امتحان میں بیٹھے گی۔ ایک ہفتہ وہ اپنے گھر پر نہیں رہا
بلکہ ویدوں کے بتائے ہوئے نرک میں رہا تھا۔

اور جب وہ گھر سے چلنے لگا تو اس کی بہن نے چپ چاپ اس کے پاس آ کر سات
روپے اور کچھ ریزگاری نکال کر اس کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ رندھیر ایکبارگی حیرت
سے چونک پڑا۔ گھبرا کر بولا۔

بیلا، یہ کیا ہے؟"

بیلا نے مسکرا کر کہہ دیا "تمھیں خرچہ کے لئے ضرورت جو پڑے گی۔ اسے

اور رندھیر سوچنے لگا کہ بیلا نے اسے یہ سات روپے نہیں دیئے ہیں۔ اس نے محبت نہیں برتی ہے بلکہ اس کے منھ پر ایک طمانچہ مارا ہے۔ اس نے جلدی سے اس کا ہاتھ پیچھے ہٹا دیا اور تیزی سے کہنے لگا۔ "نہیں مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ تم اسے اپنے پاس ہی رکھ لو۔"

بیلا اس کو خاموشی سے گھورتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ اور رندھیر اس کو اس طرح روتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بھی رونے لگے۔ اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"تم اتنا بُرا کیوں مان گئیں۔ تم اس طرح مت روؤ، مجھے بڑا دکھ پہنچ رہا ہے۔"

اور بیلا نے اس کی جیب میں روپے اور ریزگاری ڈال دی اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "تم انھیں اپنے پاس رہنے دو، یہی میرا دل چاہتا ہے۔ اتنے دن بعد تو آئے ہو۔ نہ جانے کب آنا ہو۔ میری ایک ہی بات مان لو۔ میں تمھاری بہن ہی تو ہوں کوئی غیر تو نہیں۔"

رندھیر اب انکار نہ کر سکا۔ بیلا کے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔ "لیکن ایک بات تمھیں بتانا پڑے گی۔ یہی کہ روپے تم نے کس لئے اکٹھا کئے تھے۔ سچ سچ بتانا جھوٹ نہیں۔"

اور بیلا نے بتا دیا۔ "ایک ساری خریدنے کے لئے۔ لیکن ابھی تو میری پہلے کی ساریاں بالکل ٹھیک ہیں۔"

رندھیر زبردستی ہنسنے لگا۔ "اچھا بھئی ہم نے تمھارے روپے لے لئے اور یہ بھی طے رہا کہ تمھیں نئی ساری ملے گی۔" اور دونوں بہن بھائی ہنسنے لگے۔

لیکن گھر سے واپس آنے کے بعد پارٹی میں کام کرتے کرتے اُسے یہ بھی محسوس ہوتا رہتا کہ محنت کش عوام کے دُکھ درد کے ساتھ ساتھ اس سے ایک ماں کی ممتا بھی وابستہ ہے۔ ایک بہن کا پیار بھی وابستہ ہے۔ ایک بے سہارا خاندان کی پرورش

بھی وابستہ ہے۔ آخر اس نے رات کے وقت ایک معمولی سے اخبار میں کام کرنا بھی شروع کر دیا۔ جس کے لئے اسے پچاس روپیہ مہینہ ملنے لگا۔ لیکن اس شب بیداری سے اس کی تندرستی بگڑنے لگی۔ اور پھر وہ بیمار پڑ گیا۔ ان ہی دنوں ایک روز ڈاکٹر کے پاس سے لوٹتے ہوئے راستہ میں اس کی کمودنی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اس کی پھوٹی ہوئی آنکھ کو دیکھتے ہی ایک دم سے گھبرا گئیں۔ "ارے یہ آپ کی آنکھ میں کیا ہو گیا۔ کوئی اکسیڈنٹ ہو گیا کیا؟"

رندھیر ہنسنے لگا۔ "جی نہیں، پچھلے مہینہ پولیس نے جو لاٹھی چارج کیا تھا۔ اس میں یہ آنکھ جاتی رہی!" اور اس نے چاہا کہ بات کا رخ بدل دے۔ کہنے لگا "کہئے! اخبار آپ کے پاس پہنچ رہا ہے۔ اور جو ادھر نیا لٹریچر آیا ہے۔ وہ بھی آپ نے دیکھا؟"

مگر کمودنی کسی اور موضوع پر بات کرنا نہ چاہتی تھی۔ "جی ہاں مجھے اخبار بھی ملتا ہے اور لٹریچر بھی۔ مگر یہ آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ بہت برا ہوا۔"

رندھیر کہنے لگا۔ "ایسی بات نہیں ہے۔ یہ تو لاٹھی چارج کا ایک نشان ہے اور مجھے اس سے اتنا ہی پیار رہے جتنا ایک ماں کو اپنی ناجائز اولاد سے ہوتا ہے۔ یہ تو مجھے پولیس کے ظلم کو برابر یاد دلاتا رہے گا۔ مجھ میں وہ "یقین" پیدا کرے گا جو پھانسی کے سائے میں بھی جو بیس نیوچک سے جدا نہ ہوا۔ اس لئے کہ ظلم اسی وقت بڑھتا ہے۔ جب جنتا کی طاقت پورے زور شور سے ابھرتی ہے۔ اگر میری آنکھ کسی اکسیڈنٹ میں چلی جاتی تو یقیناً یہ برا ہوتا اور مجھے واقعی دکھ ہوتا۔" کمودنی خاموش کھڑی ہوئی اس کی دھنسی ہوئی آنکھ کی طرف دیکھتی رہی جس نے اس کے چہرے کو کسی قدر گھناؤنا بنا دیا تھا۔ اور رندھیر تیزی سے بولتا رہا اور وہ سوچتی رہی کہ جو شخص دوسرے کے دکھ درد کے لیے اس قدر ظلم سہنے کے باوجود بھی ہراساں نہیں ہو سکتا۔ وہ آدمی نہیں ہو سکتا۔ وہ پرلوک سے آیا ہوا کوئی دیوتا ہی ہو سکتا ہے۔

اور جب رندھیر زور زور سے کھانسنے لگا تو کمودنی نے غور کیا کہ وہ بیمار نظر آ رہا ہے

اور وہ پوچھنے لگی۔ "آپ کی طبیعت بھی تو خراب معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں خراب تو ہے۔ میں ابھی ڈاکٹر ہی کے یہاں سے آرہا ہوں۔"

پھر کمودنی نے اس سے اصرار کیا کہ وہ کچھ دن اس کی کوٹھی پر آرام کرلے۔ وہاں باقاعدہ علاج بھی ہوسکے گا اور دیکھ بھال بھی ہوسکے گی۔ رندھیر نے غور کیا کہ جلدی تندرست ہوجانے کے لئے کمودنی کی کوٹھی پر علاج ٹھیک ہوجائے گا۔ اس بیماری سے وہ جلد ہی نجات پالینا چاہتا تھا۔ یہ بیماری اس کے لئے جنجال تھی، مصیبت تھی، اس طرح اس کے کاموں میں بڑی رکاوٹ پیدا ہوگئی تھی۔ اور پھر دوسرے ہی روز وہ اس کے یہاں چلا گیا۔

کمودنی کی اس خوبصورت کوٹھی میں جس کے آراستہ کمروں میں الف لیلیٰ کے شبستانوں کی طرح سبکسار خوابیوں کا ہلکا دھندلکا چھایا رہتا تھا۔ جہاں سرسراتے ہوئے ریشمی پردوں سے ہوائیں گنگناتی ہوئی گذرتی تھیں۔ جہاں جھلکتے ہوئے دریچوں پر دھوپ کے سنہری عکس مچلتے تھے اور جہاں خانساماں اور بیرے اشاروں پر چلتے تھے۔ اس فضا میں، اس ماحول میں بیمار رندھیر نرم بستر پر پڑا ہوا سوچا کرتا تھا کہ ویدوں میں جس سورگ کا ذکر ہے وہ یہی کوٹھی ہے اور یہ سورگ ایک لڑکی کے لئے مہیا کیا گیا ہے جو اکتائی ہوئی رہتی ہے۔ تھکی ہوئی رہتی ہے۔ اور اداس رہتی ہے۔ اس لئے کہ اس کے سامنے ہر مسرت بے جان ہوچکی ہے۔ جس کے سامنے ہر خواہش دست بستہ کھڑی ہے جس کے سامنے ہر آرزو سرنگوں ہے۔ ایک انسان صرف ایک انسان کے لئے اتنا ساز وسامان۔ پھر اس کے سامنے مزدوروں کی بستیاں آجاتیں۔ سڑتی ہوئی تنگ گلیاں، جھکی ہوئی چھتوں والے بوسیدہ مکان تاریک کوٹھریاں جن میں غلیظ انسان بستے ہیں، بدصورت عورتیں رہتی ہیں۔ مریل بچے جنم لیتے ہیں۔ یہ مزدوروں کی بستیاں ہیں۔ جو محنت کو بیچتے ہیں جو محنت کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ جو خوشی کے لئے ترستے ہیں۔ زندگی کے لئے ترستے ہیں۔ اتنا بڑا فرق اتنی بڑی خلیج۔ پھر یہ سماج قابلِ نفرت کیوں نہیں۔ یہ نظام قابلِ نفرت کیوں نہیں۔ اور یہ نفرت ایک مقدس جذبہ ہے۔ جو اس نفرت کو مقدس نہیں

سمجھتے وہ غدار ہیں، جاہل ہیں، نکمے ہیں اور رندھیر کی نفرت کا یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا
اس روز کمودنی کے آئے ہوئے ایک بل پر اس کی نظر پڑ گئی ۔ جو ڈرائنگ روم کی نئی آرائش
کے لئے تھا اس لئے کہ اس کا فرنیچر ذرا ماڈرن نہیں رہا تھا اور کمرے کی آراستگی میں کوئی نادیثی
نہیں رہی تھی ۔ اور اس نئے فرنیچر پر، نئے ریشمی پردوں پر، نئی آئل پینٹنگ پر آٹھ ہزار روپے
سے زائد خرچ ہوئے تھے رندھیر کا دل چاہا کہ وہ اس بل کو پھاڑ کر مسل ڈالے ۔ فرنیچر کو توڑ
پھوڑ ڈالے اور اس کوٹھی میں آگ لگا کر بھاگ جائے ۔ نہیں تو وہ پاگل ہو جائے گا ۔ دیوانہ
ہو جائے گا ۔ اور اسی وقت اس کے پاس کمودنی آ گئی ۔ اس نے مسکراتے ہوئے اس کو
اپنے ہاتھ سے دوا پلائی ۔ ٹمریچر لیا ۔ چارٹ پر اس کو درج کیا اور ٹیلیفون اٹھا کر ڈاکٹر
کو رپورٹ بتانے لگی ۔ اور یہ سب کچھ کرنے میں صرف ایک ہیرو ورشپ کا جذبہ کارفرما تھا
اور کچھ نہیں ۔ ایک ایسی عقیدت جو ڈان ٹروان کے ہیر ڈایرل فلائنگ کا آٹو گراف لیتے ہوئے
اسے محسوس ہوئی تھی ۔ ایک ایسا فخر جو ٹینس چمپین غوث محمد کے ساتھ اُسے فوٹو کھچواتے
وقت محسوس ہوا تھا ۔ ایک ایسی خوشی جو کوی سمترا نندن پنت کو اپنی کوٹھی پر ڈنر دیتے
وقت محسوس ہوئی تھی اور رندھیر پر لوک سے اُترا ہوا دیوتا تھا جو دُکھ کے مارے ہوئے
انسان کے ظلم سہہ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا ۔

رندھیر اسی طرح نرم بستر پر لیٹا رہتا ۔ ریشمی پردوں میں ہوائیں گنگناتی رہتیں
دھوپ کے سنہری عکس دریچوں پر مچلتے رہتے ۔ کمرے میں الف لیلائی شبستانوں کی طرح
سیکسار خوابوں کا دھندلکا چھایا رہتا ۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ۔ کمودنی کو دیکھتا رہتا
جو اس کی دیکھ بھال میں عقیدت محسوس کرتی ، فخر محسوس کرتی ، خوشی محسوس کرتی اور اس
سہانی شام کو جب باہر درختوں میں ہوائیں میٹھی ہوئی چل رہی تھیں اور ریڈیو پر آہستہ آہستہ
وائلن بج رہا تھا ۔ کمودنی کسی تقریب میں جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی ۔ بہت دیر سے وہ
لباس کا انتخاب کر رہی تھی مگر اس کی پسند کو قرار نہیں مل رہا تھا ۔ آخر اس نے بہت سی

زرتار ساریاں اس کے سامنے لاکر ڈال دیں اور مسکرا کر کہنے لگی۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ آج آپ ہی سلکٹ کر دیجئے"!

اور رندھیر کو اس کے لئے لباس کا انتخاب کرنا ہی پڑا۔ پھر کمودنی لباس تبدیل کرکے ہنستی ہوئی باہر چلی گئی۔ اور رندھیر کو لیٹے ہی لیٹے خیال آگیا کہ کمودنی اپنے لباس کا انتخاب بھی نہیں کر سکتی ہے اس لئے کہ اس کے پاس اعلیٰ درجہ کی کتنی ہی ساریاں ہیں اور بیلا کی سب ساریاں پھٹ چکی ہیں وہ ساڑھے سات روپے مہینوں تک جمع کرنے کے بعد بھی نئی ساری نہ خرید سکی اور یہ مہینوں تک جمع کئے ہوئے روپے یہ نئی ساری کی خواہش اس نے بھائی کی تکلیف کے لئے سب کچھ نچھاور کر دیا اور اس کا بھائی اس کے لئے نئی ساری نہ خرید سکا۔ اور اس کے جہیز کا جو مرقرضخواہوں کی نذر ہو گیا۔ اس گھٹی ہوئی اذیت سے وہ کانپ اُٹھا۔ کیا اس کی بہن اسی طرح نئی ساری کے لئے تڑپتی رہے گی؟ کیا اس کی ماں کا چہرہ اسی طرح مرجھایا رہے گا۔ کیا اس کے دونوں بھائی اسی طرح بلکتے رہیں گے۔ ان اچانک سے سوالوں سے وہ گھبرا گیا۔ بدحواس ہو گیا۔

کیلنڈر پہ تاریخیں بدلتی رہیں، ہواؤں کے رُخ بدلتے رہے اور رندھیر نرم بستر پہ لیٹا رہتا اس کی صحت اب بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اور وہ اس خوبصورت کوٹھی سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ گنجان بیابانوں میں بسنے والے اس درندے کی طرح جو آہنی کٹہروں میں رہنے کا عادی ہو ہی جاتا ہے اور کمودنی اس کی دیکھ بھال میں اسی طرح مستعدی برتتی رہی اور ایک سہ پہر کو جب وہ نڈھال سا لیٹا ہوا تھا کمودنی نے اسے اُداس دیکھکر پیانو بجانا شروع کر دیا۔ پیانو سے نغمے پھوٹتے رہے۔ کمرہ کی فضا ان جھنکاروں میں سحر زدہ سی ہوتی گئی۔ اور ان نغموں میں رندھیر کو کمودنی کوئی مقدس دیودا سی معلوم ہونے لگی۔ اور سبکسار خوابوں سے ڈھکا ہوا کمرہ اجنتا کا کوئی غار معلوم ہونے لگا۔ اور اچانک یہ فضا، یہ سحر، یہ خواب درہم برہم ہو گئے۔ کمرے میں حسبِ معمول ہنستا ہوا کیپٹن شیام آگیا۔

اور کمودنی اس کے ساتھ گھومنے چلی گئی۔ حالانکہ زندھیر چاہتا تھا کہ وہ نہ جائے۔ وہ اسی طرح پیانوں پر نغموں کے جادو جگاتی رہے اور اس کا چہرہ مقدس دیو داسیوں کی طرح جھلکتا رہے۔ لیکن وہ کیپٹن شیام کے ساتھ چلی گئی اس لئے کہ وہ کیپٹن شیام تھا اور زندھیر صرف زندھیر تھا۔ اور زندھیر غور کرنے لگا کہ وہ گذشتہ جنگ میں آسانی سے کمیشن پا سکتا تھا۔ اور آج اس کے شانوں پر بھی سنہرے اسٹار جھلکتے ہوتے اور کمودنی اس طرح سے اُٹھ کر چلی نہ جاتی اور اُسی وقت جب وہ اس طرح جھنجلایا ہوا لیٹا تھا کہ اس کے پاس مُرلی آگیا۔ مُرلی جو ٹیکسٹائل مل میں مزدور تھا۔ جو یونین کا بڑا جوشیلا ورکر تھا۔ اور جو اس کو دیکھنے آیا تھا۔

مُرلی نے ذرا دیر تک تو کمرے کو احمقوں کی طرح گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر صوفے پر آلتی پالتی مار کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اور زندھیر سے کہنے لگا۔ "کمرہ تو بڑے ٹھاٹھ کا ہے۔ ایسا تو سالے اپنے مینیجنگ ڈائرکٹر کے پاس بھی نہیں۔"

مگر زندھیر نے اس کی بات پر توجہ نہ دی پوچھنے لگا۔ "کہو یونین کا کیا حال چال ہے؟"

مُرلی گردن ہلا کر بولا۔ "سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس آج کل وہ سالا مینیجر بہت خار کھائے ہوئے ہے۔ سالا یوں آنکھ ٹیڑھی کر کے دیکھتا ہے جیسے میں نے اس کی جورو بھگالی ہے اپنا تو جی چاہتا ہے کہ ایک دن سالے کے سامنے تان مار دوں" اور مُرلی بھونڈی آواز میں گانے لگا۔ "ہمیں مار گئی تری بھی نجریا، بانکی نجریا۔ مار گئی رے!" زندھیر نے اسے جھٹ سے خاموش کرا دیا۔ اور اتنے میں گردھر کمرے کے اندر آگیا۔ شاید وہ شور سُن کر آیا تھا۔ کہنے لگا۔

"چائے لے آؤں؟"

اور مُرلی جھٹ سے بول اُٹھا۔ "بس جھٹ سے لے آؤ۔ خوب اسٹرانگ ہو اور شکر بھی ذرا اچھی طرح ڈالنا۔" اس نے گردھر سے بالکل اسی طرح کہا تھا۔ جس طرح وہ زندھیر کے ساتھ کارخانے کے سامنے والے ٹی اسٹال میں بیٹھ کر آرڈر دیا کرتا تھا۔

رندھیر نے بھی کہہ دیا: "ہاں چائے نے آؤ" گردھر چلا گیا اور رندھیر ایکبارگی جھنجلا گیا لیکن مُرلی نے اس کی جھنجلاہٹ پر غور ہی نہیں کیا۔ جھٹ سے جیب کے اندر سے بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی سُلگا کر بنڈل رندھیر کی طرف بڑھا دیا، "لو کامریڈ! اصلی لال تاگہ ہے، ایک کش لگا لو تو طبیعت مست ہو جائے گی" مگر رندھیر نے انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ اکثر مُرلی سے بیڑی مانگ کر پی لیا کرتا تھا۔

پھر مُرلی دیر تک باتیں کرنے کے بعد چلا گیا۔ رندھیر نے غور کیا کہ مُرلی صوفہ پر جہاں بیٹھا تھا وہاں پر مُرلی کے تیل کے داغوں سے بھرے ہوئے گندے کپڑوں سے بھورے بھورے دھبے پڑ گئے تھے۔ اور صوفہ ابھی ابھی خریدا گیا تھا۔ یہ بہت بُرا ہوا تھا اور وہ دیر تک لیٹا ہوا جھنجلاتا رہا۔

اور تھوڑی دیر بعد جب وہ اس کوٹھی سے باہر آیا تو اس کو خود اپنے وجود میں تبدیلیاں سی معلوم ہوئیں۔ وہ اب بھی مزدوروں کی بستیوں میں جاتا۔ کارخانے کے پھاٹکوں پر مزدوروں کی میٹنگیں کرتا مگر گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں اس کو اپنا چہرہ جھلستا ہوا معلوم ہوتا۔ لُو کے بگولوں میں اس کا جسم پگھلنے لگتا۔ اور ان ہی دنوں میرٹھ سے اس کا ایک دوست آ گیا جو راشننگ کے محکمہ میں ملازم تھا۔ اور جس نے بلیک مارکیٹ کرنے والوں کیساتھ ملکر خوب روپیہ پیدا کیا تھا اور رندھیر اس کے ساتھ ایک رستوران میں بیٹھا باتیں کرتا رہا، قہقہے لگاتا رہا اور کارخانے کے گیٹ پر ہوتے والی میٹنگ میں نہ جا سکا۔ اس لاپرواہی پر دوسرے روز جب وہ مزدوروں میں گیا تو یونین کے ورکرز نے کہنا شروع کر دیا۔

"کامریڈ کل سارے مزدور انتظار کرتے رہے۔ مگر آپ نہیں آئے"

"آپ کے نہ آنے سے کتنے ہی مزدور ناراض ہو گئے"

"میٹنگ نہ ہونے سے ہڑتال کی بات پھر رہ گئی"

رندھیر چپ چاپ ان کی باتیں سُنتا رہا اور جب گردھاری نے تیزی سے کہا۔

"آپ تو ڈی لکس ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جھلا گیٹ پر کیسے آتے؟" تو رندھیر جھنجھلا گیا۔ حالانکہ گردھاری سے کبھی کبھار اس کا مذاق بھی ہو جاتا تھا۔ گردھاری جتنا دھاکڑ ورکر تھا اسی قدر ہنس مکھ بھی تھا اور جب وہ وہاں سے لوٹا تو اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھ گئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ ان مزدوروں کے لئے اس تیز دھوپ میں، اس جھلسی ہوئی لُو میں کئی میل پیدل چل کر آتا ہے۔ منیجر کے غنڈوں کی گالیاں سُنتا ہے اور ایک روز میٹنگ میں نہ پہنچنے پر وہ اس طرح پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ اس طرح حملہ بازی کر سکتے ہیں۔ یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے حق تلفی ہے۔

لیکن اب رندھیر اکثر کام سے گھبرانے لگا تھا۔ اس کے وجود میں جو تیز آنچ دہک رہی تھی وہ جیسے دھیمی پڑتی جا رہی تھی۔ اور اسی دوران میں اُسے سہارنپور جا کر ریلوے کے مزدوروں میں کام کرنے کے لئے پارٹی نے آرڈر دیدیا۔ اور وہ دو اور کامریڈز کے ساتھ سہارنپور چلا گیا۔ یہاں اسے ایک مزدور کے ساتھ رہنا پڑا اس لئے کہ یہاں باقاعدہ پارٹی آفس نہ تھا وہ ایک آرگنائزر کی طرح وہاں گیا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد دونوں کامریڈز کو واپس بلا لیا گیا اور وہ تنہا رہ گیا۔ وہ دن بھر تنگ تاریک کوٹھری میں پڑا رہتا اور رات کو مزدوروں میں جا کر پارٹی کا کام کرتا۔ ریلوے کے ورکرز نے اس سے تعاون کرنا شروع کر دیا تھا ایک چھوٹی سی یونین وجود میں آ چکی تھی لیکن وہ خود اکتایا ہوا سا تھا۔ دن بھر تاریک کوٹھری میں پڑے پڑے اس کا دم گھبرا جاتا۔ جو لٹریچر وہ ساتھ لے گیا تھا اس کو پڑھنے میں دل نہ لگتا۔ حالانکہ رات کو اس کی کوٹھری میں ریلوے کے مزدور آ کر اکٹھا ہو جاتے۔ پھر باتیں ہوتیں، ورکس منیجر کی، فورمین کی، مستریوں کی، خواب راشن کی الاؤنسز کی، اور ان باتوں میں کبھی کبھار مذاق بھی ہو جاتا ہنسی دل لگی بھی ہو جاتی۔ پھر زور دار قہقہے لگتے۔ لیکن رندھیر کو چراغ کی مدھم روشنی میں بیٹھے ہوئے لوگ پرچھائیوں کے جال کی طرح دھندلے دھندلے نظر آتے اور یہ کوٹھری اسے جیل خانہ معلوم ہوتی پھر ایک روز وہ اس کوٹھری سے اس جیل خانے سے چپ چاپ نکل گیا۔ اس حرکت پر پارٹی میں اس پر بڑے سخت چارج لگائے گئے اور پھر وارننگ دیکر اُسے پھر سہارنپور جانے کا آرڈر ہوا۔ مگر اس نے وہاں جانے سے صاف انکار کر دیا

اس لئے کہ وہاں وہ تنگ کوٹھڑی میں رہنا نہ چاہتا تھا۔ وہاں اس کا دل گھبراتا تھا اسے وحشت ہوتی تھی اور اس انکار پر اسے پارٹی سے اکسپل کر دیا گیا۔

اور اب رندھیر اپنے کمرے میں پڑا ہوا سوچا کرتا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ غلط ہوا ہے اس نے پارٹی کے لئے لاٹھیاں کھائی ہیں، زخم کھائے ہیں۔ اس نے پارٹی کے لئے اپنی آنکھ ضائع کی ہے۔ اپنے چہرے کو بدنما بنایا ہے جس جماعت کے ہر آرڈر کے لئے اتنا سب کچھ کیا ہے وہ ذرا سا اس کی مرضی کا بھی خیال نہ کر سکی۔ اس کو اتنا بھی حق نہ دے سکی۔ یہ ڈسپلن نہیں زبردستی ہے جبر ہے۔ اور پارٹی کو کسی دن غلطی کا ضرور احساس ہوگا۔ اس لئے کہ اس کے بغیر یونین کا کام نہ ہو سکے گا۔ مزدور پارٹی کی نہیں اس کی بات مانتے ہیں۔ اس کی عزت کرتے ہیں۔

رندھیر ہارے ہوئے جواری کی طرح سرگرداں گھومتا رہا اور اپنے کمرے میں پڑا سوچتا رہا۔ اس نے پھر اخبار میں نوکری کر لی تھی۔ اب اسے اپنی زندگی ایک چھکڑے کی طرح گھسٹتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

پھر ایک روز اس نے سنا کہ ٹکسٹائل مل کے ہڑتالی مزدوروں پر پولیس نے فائرنگ کی ہے۔ کتنے ہی مزدور گھائل ہوئے تھے اور مرلی وہیں دم توڑ چکا تھا۔ مرلی جو بڑا جوشیلا ورکر تھا۔ مرلی جس نے مِل مالک کے غنڈوں کی مار کھائی تھی۔ مرلی جو کئی بار کارخانے سے نکالے جانے کے باوجود بھی اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹا تھا۔ آج وہ مرلی پولیس کی فائرنگ کا نشانہ بن گیا تھا۔ سرمایہ داروں کی حفاظت کا [illegible] گیا تھا۔ تمام دن اس پر ایک اداسی چھائی رہی۔ آخر شام کو وہ مزدوروں کی بستی میں گیا۔ مرلی کے گھر پہ ایک پُراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جھکی ہوئی چھت کے نیچے کتنے ہی مزدور جمع تھے۔ مرلی کی لاش ابھی ہسپتال سے ملی نہ تھی۔ اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ بوڑھا باپ سر جھکائے بیٹھا تھا اور تین چھوٹے چھوٹے بچے حیرت سے ہر ایک کا منہ دیکھ رہے تھے۔ چراغ کی پھیکی روشنی میں ہر طرف سائے لہرا رہے تھے اور ان لہراتے ہوئے سایوں میں ایک بے سہارا خاندان نظر آ رہا تھا۔ مرلی کی تان ٹوٹ گئی۔ اور ایک بیوہ اور تین نادان معصوموں کے ساتھ ایک بوڑھے باپ کا بھی سہارا چھٹ گیا۔ اور رندھیر سوچنے

کہ یہ مُرلی نہیں مرا ہے باون روپے ماہوار پانے والا سرپرست نہیں مرا ہے۔ ایک تریسٹھ روپے پنشن پانے والے ریٹائرڈ ٹیچر کی طرح، اور اس دُکھ میں، اس صدمہ میں رندھیر کو اپنا غم بھی نظر آیا اپنے گھر والوں کا بھی غم نظر آیا۔

دوسرے دن شہر کے تمام ملوں میں ہڑتال ہوگئی۔ اور مُرلی کی ارتھی کا جلوس سڑکوں پر سے گزر رہا تھا۔ رندھیر مرنے والے ساتھی کا آخری نظارہ کرنے کے لئے فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر جلوس کو دیکھتا رہا جس کے ساتھ ساتھ مسلح پولیس کی لاریاں بھی چل رہی تھیں۔ مزدور فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔

"پولیس کا ظلم، بھولو مت، بھولو مت"

"کامریڈ مُرلی کا خون، سب کا خون"

"انقلاب زندہ باد، انقلاب زندہ باد"

"کامریڈ مُرلی امر ہو"

اور مُرلی سچ مچ امر ہوگیا تھا۔ اس کی ارتھی توپ کے دہانہ پر نہیں۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعروں پر جا رہی تھی۔ اس کی ارتھی کے ساتھ فوجی دستے نہیں مارچ کر رہے تھے۔ مزدور تھے صرف مزدور۔ جن کے سینے تنے ہوئے تھے۔ جن کے نعروں سے دھرتی دھڑک رہی تھی اور پولیس والوں کے چہروں پر بدحواسی چھائی جا رہی تھی۔ رندھیر سوچنے لگا کہ یہ کیسا جلوس ہے کہ مرنے والوں کی چھاتیاں اوپر کو ابھری ہوئی ہیں اور ظلم کرنے والوں کے چہرے بدحواس ہیں۔ لیکن آج پھر فائرنگ ہوگی آج پھر کتنے ہی مُرلی گولیوں کے سامنے دم توڑ دیں گے۔ ایک خاندان نہیں، کتنے ہی خاندان برباد ہوں گے۔ لیکن اس ظلم کو کچلنے کے لئے، انقلاب کو لانے کے لئے ایک نہیں کتنے ہی خاندان برباد ہو جائیں گے ان کو تباہ ہو جانے دو۔ وہ موت، وہ تباہی جو کروڑوں خاندانوں کی بہتری کے لئے ہو، جو ظلم کو کچلنے کے لئے ہو، جو انقلاب کے لئے ہو، ایسی موتیں، ایسی تباہیاں مقدس ہیں۔ قابل پرستش ہیں۔ کامریڈ مُرلی تم کبھی نہیں مر سکتے۔ تم ہمیشہ زندہ رہو گے۔ رندھیر کھڑا ہوا سوچتا رہا۔ اور نعروں کی گونج میں اس کا جسم جوش سے کپکپاتا رہا۔ پھر جلوس آہستہ آہستہ گذر گیا اور رندھیر کھڑا دیکھتا رہا پھر اس کی گردن

جھک گئی۔ اس لئے کہ وہ جلوس سے، اس انقلابی کارواں سے چھٹ چکا تھا۔ ایک بچھڑا ہوا ساتھی اور ایک بارگی وہ خود پر جھنجلا اُٹھا۔ ایسا کیوں ہوا، ایسا کیوں ہوا اور وہ وہاں سے سیدھا کمودنی کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ اس وقت بھی اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے اخبار پڑا ہوا تھا۔ اس کو پریشان دیکھ کر کہنے لگی۔

"بہت دن کے بعد آپ آئے ہیں۔ اب طبیعت کیسی ہے؟"

رندھیر نے کچھ بھی نہ کہا۔ صرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔

اس دفعہ کمودنی مسکرادی۔ "چپ کیوں ہیں آپ" اور پھر ایک بارگی کچھ سوچ کر بولی۔ "کل کی فائرنگ میں ایک مزدور مارا گیا ہے، بہت بُرا ہوا۔" اور رندھیر ایک دم سے چونک پڑا۔ "کچھ بھی بُرا نہیں ہوا۔ وہ مرا نہیں۔ وہ زندہ ہے، ایسے لوگ کبھی مرا نہیں کرتے۔ ہاں میں مر گیا ہوں۔ میں نے خودکشی کرلی ہے میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا ہوں۔ پوچھو یہ کیوں ہوا۔ یہ کیوں ہوا؟" اور پھر اس کا لہجہ اور تیز ہو گیا "اس لئے کہ میں نے تم سے نفرت کرنا چاہی، تم سے، تمھارے ماحول سے، تمھارے طبقے سے، مگر میں نفرت نہ کر سکا۔ میں اپنے مقصد سے ہٹ گیا۔ اور پھر اس نے ایکبارگی دیوانوں کی طرح اُٹھ کر کمودنی کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور اسے وحشت ناک نظروں سے دیکھنے لگا۔ کمودنی بدحواس ہو کر اس کے بازوؤں میں مچلنے لگی۔ "چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو، نہیں تو میں چیخ کر سب کو اکٹھا کر لوں گی۔"

رندھیر اسی طرح وحشت ناک نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ "اتنا چیخو کہ ساری دُنیا یہاں اکٹھی ہو جائے اور پھر لوگ دیکھیں کہ میں کتنا بزدل ہوں، کتنا نکما ہوں، کتنا فراسٹریٹڈ ہوں، چیخو، ضرور چیخو تاکہ مجھے میری سزا مل جائے۔" اس کی آواز تیزی سے کمرے کے اندر گونجتی رہی اور مُرلی کی ارتھی کا جلوس گزرتا رہا جس کے ساتھ مزدور تھے، انقلابی نعرے تھے اور یہ شور، یہ آوازیں شاہراہوں پر دھڑکتی رہیں، گرجتی رہیں۔

شاہراہ
سالنامہ

عصمت چغتائی

چوتھی کا جوڑا

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لیے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منہنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو۔ اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبری کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں۔ چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لیے گئے تھے مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑی تھی۔ کاٹ چھانٹ کے معاملے میں کبری کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ ان سوکھے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے کتنے چھٹی چھوچھک تیار کیے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلے میں

کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی۔ کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں، کلف توڑتیں، کبھی تکون بناتیں کبھی چوکھونٹا کرتیں اور دل ہی دل میں، قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا۔ گریبان کے لئے کتر میری بقچی سے لے لو۔"

اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر وہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا۔ اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی۔ جب ہی تو سب دم سادھے اُن کا منہ تاک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکن نہ تھی۔ چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اُٹھی ہو اور انھوں نے مسکرا کر قینچی اُٹھا لی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دیئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپا جھپ سوئی کے ناکوں میں ڈورے پروئے۔ نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے۔ کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ، پیر لٹکائے، ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور، کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی ماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی ہیں۔ کونڈی کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے اُن لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اُس کے

زردی مائل مٹیالے رنگ میں لپک اُٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا۔۔۔ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اُٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس شبنمی ڈوپٹے کے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاڑھے کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے۔ گنگا جمنی کرنیں ماند پڑگئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اُسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی اُمیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی محلے کی عورتیں ہاتھ میں پان دان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھن بجاتی آن پہونچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اُتر آئے گی۔ پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا، لو اور سنو۔ تو کیا نگوڑی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی۔" اور پھر سب کے چہرے فکرمند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگر کی طرح آنکھوں کے فیتہ سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھُسر پھُسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنّا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی خیالی سمدھنوں کو گالیاں سُنانے لگتی۔ بے ہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دُور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے اُبھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں۔ اللہ یہ قہقہے انھیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دُور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے

بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پہ پہونچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آجائے تو سمجھ لو یا تو مہر پہ بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پہ جھگڑا ہوگا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا۔ نہ جانے عین وقت پہ کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بھی بچی تو تیلے دانی یا پیستی کا غلاف سی کر دھنک گوکرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے۔ کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے جو برات آگئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گذرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آگئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پہ بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اسکے ننھے سے غصے پہ وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آ کر انھیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پہ دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے۔ ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اُچھو کے دباؤ سے سُرخ آنکھیں اُوپر اُٹھا کر ابا بے کسی سے مُسکراتے۔ کھانسی تو رُک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے۔ کتنی بار کہا تم سے۔"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"اے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی اوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی۔"

"دکھاؤں گا۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اُچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"

اور ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی۔ کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناونی سن کر ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اُس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں نہ اس کے سینے پر طوفان اُٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انھیں اُٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں

کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگے کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپیہ میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارا نہ تھا منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلے میں آ رہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے اک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی ہو اور انھوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے اُن کے تو چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھُسر پھُسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال لیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اُسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکرو چھ ماشے سلمہ ستارہ اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی، اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری، ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے دوسرے صبح

کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھری میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھری سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ میں دھو دوں بی آپا" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی۔ بی اماں مسکراتی رہیں اور کریپ کے دوپٹے میں لپّا ٹانکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستہ پھول پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی۔ اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو منجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے، کوفتے بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی" وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں۔ اور وہ سوچا کرتی "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی بالائی پڑے۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے اور کیوں نہ بھرے آخر کو ایک دن وہ اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اسی کی ہتھیلی پر رکھ دے گا۔ پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا۔ اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں

میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ اُس کے کپڑوں کو پیار سے تہہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں۔ بساندھی بنیان اور ناک سے لبڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ اس کے تیل میں چیچپاتے ہوئے تکئے کے غلاف پہ Sweet Dream کاڑھتیں۔ پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح سویرے انڈے پراٹھے ڈٹ کر جاتا اور شام کو آکر کوفتے کھاکر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھُسر پُھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے، کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج خدا نہ کرے جو میری لونڈیا آنکھیں لڑائے۔ اُس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔" بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے" بی آپا کے پکّے مہاسوں کو دیکھ کر انھیں بی اماں کی دور اندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ یہ میں کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔ "اری او نک چڑھی بہنوئی سے کوئی بات چیت، کوئی ہنسی مذاق۔ اونہہ۔ اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھیّا۔ ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا نا؟" بی اماں چڑھ کر بولتیں۔

"نہیں تو۔ مگر........" میں لاجواب ہوگئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار

گے بند کھلی کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں چپکے سے بولیں۔
"دیکھو ہنسنا نہیں۔ نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"
"نہیں ہنسوں گی" میں نے وعدہ کیا۔
"کھانا کھا لیجئے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جو پٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں سرپٹ بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اللہ توبہ کیا خناس آنکھیں ہیں!
"جانگوڑی ماری اری دیکھ تو سہی۔ وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ لٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا۔ اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اداسی۔ میں سر جھکائے جا کر پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے۔ میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہیئے تھا کہ مذاق اڑاؤں۔ قہقہہ لگاؤں کہ
"واہ جی واہ دولہا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو؟" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کمبخت!
"راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔
جواب ندارد۔
"بتائیے نا؟"

"ارے ٹھیک سے جا کر پوچھ" بی اماں نے ٹھو کا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے۔ مزیدار ہی ہوں گے"

"اے واہ رے جنگلی" بی اماں سے نہ رہا گیا

"ہمیں پتہ بھی نہ چلا۔ کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے!"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کاہے کے ہوتے ہیں۔ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اُتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اُوپر نہ اُٹھ سکیں۔ دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے۔

"کہئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کر اسے ہاتھی کی خوراک دیں۔ گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں۔ میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنّا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آگیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولہے میں جھکی رہتیں۔ بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا۔ کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانہ سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف کہہ دوں کہ کسی کی بکری اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ بیل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے اُلجھے ہوئے

بالوں پر چوٹھے کی اڑتی ہوئی راکھ... نہیں .... میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ناس جائے اس کمبخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"اُنھ" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو بس مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورہ لے کر میری کلائی پکڑ لی میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ۔ جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں .... اوہ ـــــ نہیں۔ .... کھا نہیں جاؤں بلکہ چوم لوں۔" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے گال سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں، پانی بھرتے ہیں، پیاز کاٹتے ہیں، بستر بچھاتے ہیں جوتے صاف کرتے ہیں۔ یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جُٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہو گی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انھیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو...... مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس

دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

اور کہہ رہے تھے "اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔

"چل جھوٹی"۔

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ ......"

"اری چپ مردار"۔ انھوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انھیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجو۔"

"نہیں بی آپا۔ انھیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے۔ چولھے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اوپر تان کر کہا:۔

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بُنا ہے؟"

"نہیں تو"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے۔ مٹی کے تھودے۔ یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بُنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں۔ یہ اُن ہاتھوں کا بُنا ہوا ہے جو ننھے پنگوڑے جھلانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان کو تھام لو گدھے کہیں کے۔ اور یہ دو تپوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گت نہ بجا سکیں گے! منی پور اور بھارت ناٹیہ کے مدرا نہ دکھا سکیں گے۔ انھیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا۔ انھیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے

جسم پر چربی چڑھانے کے لیے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں۔ چولھے کی آنچ سہتے ہیں۔ تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو۔ محنت نے ان میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انھیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کردیا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں کیسی ڈراونی موت کی باتیں۔ بھوک اور کال کی باتیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کُرتہ کتنا باریک ہے۔"

جنگلی بلّی کی طرح میں نے اس کا منہ ناک گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آبیٹھیں۔

"وہ بولے!" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں۔" میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے .. .. دیکھئے میری ساری چوڑیاں چور ہو گئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں۔" انھوں نے رومانٹک آواز میں شرما کر کہا۔

"بی آپا ..... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں" میں نے سلگ کر کہا "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جانماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیو میری چوڑیاں بی اماں!"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں"

"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں!" پھر چمکار کر بولیں "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجیو۔ وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی!" یہ کہہ کر انھوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی۔ اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تُو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے!"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انھوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو میری بہنوں کی شادی کرائی جنکی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے۔ جہاں بے چارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں شرمانے لگتے اور شرماتے شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے۔ اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجیے۔ دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے۔ جہاں سُنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں مرچیں بھر کے بھیجدیں۔ کبھی سوئیوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے۔ کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو، پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہا "کسی سے بھی کرادو" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت

تھی کہ دیکھو تو جیسے بیچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔
پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے۔ اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری
اُسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔
جدھر جھکا دو اُدھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی
نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی
آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی
پھاڑ کر اپنے کنوار پنے کی لعنت سمیت اُس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں۔ وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم
چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک اُمنگ بن کر نہیں اُبھرا بلکہ روٹی کپڑے
کا سوال بن کر اُبھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو ڈھکیلنا ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے
گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کے توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا
کی نیاز دلا ڈالی، دوپہر بھر محلہ ٹولہ کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی
مچھروں والی کوٹھری میں اپنے خون کی آخری بوندیں چوسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری
میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے
پر منزلوں کے نشان تھے۔ آج مشکل کشائی ہوگی۔ بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی
نکل جائیں گی۔ آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو
چھیڑ رہی تھیں۔ اور وہ خون کی بچی کھچی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا

بخار نہیں اُترا تھا۔ تھکے ہارے دیئے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انھوں نے مجھے اپنے پاس بُلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے ...... یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں۔ دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کی عیالوں کو چوم رہا ہے ......

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے۔ پھولوں سے لدی، شرم سے نڈھال، آہستہ آہستہ قدم تولتی ہوئی بی آپا چلی آ رہی ہیں ...... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل کر رہا ہے۔ بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے ...... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریئے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذرّوں میں قمقمے کی طرح اُلجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محبت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے ..... حمیدہ کا گلا بھر آیا ......

"جاؤ نا میری بہنو" بی آپا نے اُسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ ...... یہ ملیدہ" اُس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا ...... اس کے پیر لرز رہے تھے۔ جیسے وہ سانپ کی بانبی میں گھس آئی ہو۔ اور پھر پہاڑ کھسکا ......! اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں

بارات کی شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اُس نے راحت کے مُنہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی گھوہ میں ڈوبتا چلا گیا...... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلہ کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے۔ پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے! دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انھیں دبوچ بیٹھی اور انھوں نے چُپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلّے کی بہو بیٹیاں جڑیں۔ کفن کا سفید سفید لٹھا۔ موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمّل کے بوجھ سے اُن کا چہرہ لرز رہا تھا۔ بائیں ابرو پھڑک رہی تھی۔ گالوں کی سنسان جُھرّیاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں، جیسے ان میں لاکھوں اژدھے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انھوں نے چو پرتہ کیا اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پہ بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا۔

جیسے انھیں پکّا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا بیتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر......... سفید گزی کا نشان! اس کی سُرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر اُبھری ہے۔ اور پھر ایک دم سب خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے۔ ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انھیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سُوا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اُٹھیں گی۔

تحریک
یکم ستمبر

کرشن چندر

برہم پترا

تو مار جو بے باتی تو مار گھورے شاتھی
تمہارے ہاں چراغ جلتا ہے اور گھر میں ساتھی بھی ہے

امار تورے راتی امار تورے تارا
میرے لیئے رات ہے اور تارے

تو مار اچھے ڈانگا امار اچھے جول
تمہارے لئے زمین ہے اور میرے لئے پانی

تو مار بوشے تھاکا امار چولا چول
تمہارے لئے آرام ہے میرے لئے ہمیشہ کا چلنا

(ٹیگور کا ایک گیت)

اپنے جوڑے میں سفید گلاب کا پھول ٹکائے اور ایک گہرے بسنتی رنگ کی ساڑی پہنے جس کا لہریہ گہرا سُرخ تھا، لوتیکا سین اپنے مُنّے کی طرف مسکراتی چلی آ رہی تھی، مُنّا لکڑی کے گھوڑے پر سوار تھا، اور وہ اسے چابک مار مار کے اپنی دانست میں سرپٹ دوڑا رہا تھا، جب مُنّے نے اپنی ماں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے لکڑی کے گھوڑے کی باگ زور سے کھینچی اور گھوڑا الٹ گیا، اور مُنّا نیچے اور گھوڑا اس کے اوپر جا گرا۔

مُنّا رونے لگا۔ لوتیکا نے ہنستے ہنستے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔

مُنّا روتے روتے بولا۔ "گھوڑا بڑا شیطان ہے۔ اس نے مجھے نیچے گرا دیا۔"

لوتیکا بولی۔ "تو نے بچارے کی باگ جو زور سے کھینچ دی تھی۔"

مُنّا بولا۔ "میں نے ماں کو دیکھا تھا نا۔"

لوتیکا نے اُسے چوم کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ بولی "اچھا دیکھ میں بازار جا رہی ہوں مُنّے کے لئے کیا لاؤں؟"

مُنّا بولا۔ "میں تو باجہ لوں گا۔ گھوڑے پر چڑھ کر باجہ بجاؤں گا۔ اور اپنی فوج کے آگے آگے چلوں گا۔"

یہ کہتے کہتے مُنّے کا چہرا اُس وقت بڑا سنجیدہ ہو گیا، بالوں کی لٹیں اس کے ماتھے پر بکھر گئی تھیں۔ وہ رونا بھول گیا تھا۔ آنسو ابھی تک اس کے گالوں پر چمک رہے تھے۔ لوتیکا نے رومال سے اس کے آنسو پونچھ دیئے اور اس کی لٹوں میں انگلیاں پھیر کر انھیں پیچھے جھٹکا دیا۔

"لوتیکا تو کدھر جا رہی ہے؟"

یہ چاچی کی آواز تھی۔ چاچی ہاتھ پونچھتی ہوئی رسوئی سے باہر نکل رہی تھیں۔ چاچی کی عمر بہت بڑی تھی، ان کے سر کے بال سفید تھے، چہرے پر جھریاں تھیں، جسم سوکھا سوکھا اور پتلا تھا۔ ان کا چہرہ بہت سے غموں اور دکھوں کی کہانی کہتا تھا، لیکن اس پر بھی چاچی کے چہرے پر ایک عجیب موہنی معصومیت تھی جو جانے اس بڑھاپے میں بھی جب آدمی سب کچھ کھو بیٹھتا ہے کیسے باقی رہ گئی تھی۔ آج کل تو بچوں کے چہروں پر بھی ایسی معصومیت نہیں ملتی۔ چاچی نے کیسے اور کس جتن سے اس معصومیت کی حفاظت کی ہوگی، اس کا راز نہیں کھلتا، چاچی کی عمر ساٹھ اور آٹھ سال کی تھی۔ اس عمر میں چاچی نے اپنے گاؤں کو جو برہم پترا کے کنارے آباد تھا دو دفعہ بہتے دیکھا۔ دو دفعہ پھر بستے دیکھا۔ سات دفعہ چھوٹے چھوٹے کال آئے اور تین بڑے بڑے کال اور آخری کال میں تو چاچی کا سارا پریوار ختم ہوگیا اور چاچی اپنا گاؤں چھوڑ کر لوتیکا کے ہاں کلکتہ چلی آئیں۔ رائے بہادر موحمد ارین میں لوتیکا کا گھر تھا۔ چاچی جب پہلی بار کلکتہ آئیں تو انھیں یہ گھر بھی بڑی مشکل کے بعد ملا، اور جب وہ گھر کے اندر داخل ہوئیں تو اس وقت سامنے کے مندر میں آرتی اتاری جارہی تھی، لیکن لوتیکا کے گھر میں آرتی کے وقت بھی اندھیرا تھا۔ اور لوتیکا کا پتی سیڑھیوں پر سے دبے پاؤں اتر کر باہر جارہا تھا وہ چاچی کے لئے صرف ایک منٹ کے لئے رکا۔ اور پھر یہ کہہ کر فوراً چلا گیا۔ "چاچی میں پھر آؤں گا۔ اس وقت میں رک نہیں سکتا۔ ایک ضروری کام ہے۔ لوتیکا میری غیر حاضری میں تمھارا سب خیال رکھے گی"۔ اور پھر چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا کے پتی نے ایک لمحے کے لئے لوتیکا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر اسے چھوڑ دیا اور تاریک سیڑھیوں سے نیچے اتر کر عقب کے دروازے سے باہر جانے لگا۔ پچھواڑے کی گلی میں چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا نے بڑی احتیاط سے اس کے لئے دروازہ کھولا۔ روشنی کی ایک پتلی سی لکیر تڑپتی ہوئی اندر آئی، اور پھر دروازہ بند ہوگیا لیکن اس ایک لمحے میں چاچی نے دیکھا کہ لوتیکا ایک لانبے قد کی، سانولی صورت والی دلکش لڑکی ہے۔ اس نے سفید ساڑھی پہن رکھی ہے اور اس کی

آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں ۔ ان آنسوؤں کو دیکھ کر چاچی ایک لمحے کے لئے لرز گئی تھی ۔ لوگ دھان، کپاس اور گندم بوتے ہیں ۔ چاچی نے تو اپنی زندگی میں صرف آنسو بوئے تھے ۔ انھوں نے سوچا تھا کہ شاید یہاں کلکتے میں یہ آنسو نہیں ہوں گے ۔ یہ آنسو تو صرف برہم پُترا ندی کے کنارے ہوتے ہیں ۔ جہاں کسان چاول کے موتیوں کی فصل بوتے ہیں اور آنسو کاٹتے ہیں ۔ کیا یہ سنسار ہی ایسا دُکھ بھرا ہے ؟ ایک لمحہ کے لئے چاچی جب آرام اور سُکھ کی تلاش میں کلکتے آئی تھیں، اُسے بھُول گئیں ۔ اُنھوں نے دھیرے سے لوتیکا کا ہاتھ پکڑ کے بڑے نرم لہجے میں پوچھا تھا "کیا بات ہے بہو ؟"

لوتیکا مسکرا کر اپنے آنسوؤں کو پی گئی اس نے چاچی کا ہاتھ زور سے دبا کر بڑی مدھم آواز میں کہا تھا ۔ "کچھ نہیں چاچی ۔ آؤ، اوپر آجاؤ ۔"

لوتیکا نے چاچی کا بقچہ سنبھال لیا تھا، اور اسے اوپر لے گئی تھی ۔

اس دن سے آج تک چاچی نے لوتیکا کے پتی کو پھر کبھی نہیں دیکھا تھا، چاچی اپنا گاؤں چھوڑ کر اس لئے یہاں آئی تھیں کہ یہاں برہم پُترا نہیں ہے ۔ اب انھیں احساس ہوا جیسے برہم پُترا یہاں بھی ہے، اور جب تک لوتیکا کا پتی یہ دریا پار نہ کرے وہ واپس گھر نہیں آسکتا ۔ بس اتنا ہی انھیں اندازہ ہو سکا ۔ وہ اکثر بالکونی میں کھڑے کھڑے گیلے کپڑے ٹانگتے ہوئے سوچا کرتیں اور ان کی آنکھوں کی کانپتی ہوئی حیران پُتلیاں نیچے گلی میں بھاگتی ہوئی مخلوق کو دیکھکر آزردہ ہو جاتیں ۔ یہ سب لوگ کسی طُوفان کی پیشوائی کو بھاگے جا رہے ہیں، ابھی پانی کہاں پڑھتا ہے ؟ کہاں یہ آگ لگی ہے ؟

لیکن چاچی ان سوالوں کا جواب ٹھیک سے نہ دے سکتیں، اور اپنی کانپتی ہوئی پتلیوں سے نیچے گلی میں گزرنے والی مخلوق کو حیرانی سے دیکھتی رہتیں ۔

اس وقت چاچی کی نگاہوں میں وہی موہوم سا ڈر تھا جب انھوں نے لوتیکا کے قریب آکر پوچھا "تو کہاں جا رہی ہے لوتیکا؟"

اور پھر لوتیکا کو چپ دیکھ کر چاچی نے خود ہی لرزتی ہوئی آواز میں پھر پوچھ لیا۔ "کیا جلسے میں جا رہی ہو؟"

لوتیکا کی مسکراہٹ بڑی اچھی تھی۔ چاچی کی مسکراہٹ بھی بڑی اچھی تھی۔ لیکن چاچی کی مسکراہٹ ایسی تھی جیسے کوئی مرنے سے چند لمحے قبل زندگی کے سارے دکھ اور درد کو سمجھ لے اور سمجھ کر نیلے آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دے۔ چاچی کی مسکراہٹ میں شفق کی موہنی تھی۔ لیکن لوتیکا کی مسکراہٹ صبح کا پہلا اجالا تھی جو بہت دور سے اور شاید کہیں بہت نزدیک سے آئی تھی۔ اور ستاروں کی چلمن اٹھا کہ آہستہ آہستہ تاریکی کا نقاب الٹ رہی تھی بڑی میٹھی میٹھی، مدھم مسکراہٹ جیسے کوئی ریشم کے اوپر ریشم رکھ دے۔ لیکن یہ مسکراہٹ ایک عجیب رفاقت اور مضبوطی کا احساس بھی لئے ہوئے تھی۔ جیسے یہ ہم پترا بھی ہے اور طوفان بھی ہے، لیکن ایک کشتی بھی ہے جو پار لے جا سکتی ہے۔

چاچی کے ہونٹ کانپے۔ ایک سفید لٹ گھبرا کے مرجھائے ہوئے رخسار پر گر پڑی انھوں نے ایک عجیب ملتجیانہ انداز میں لوتیکا سے کہا "تم جلسے میں ضرور جاؤ گی؟"

لوتیکا ہنسی اس نے وہ سفید لٹ بڑی محبت سے اٹھا کر چاچی کے کان کے پیچھے گھما دی اور بڑے پیار سے بولی "میں تو آٹھ بجے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں گی چاچی۔ آتے ہی مجھے کھانا دے دینا، سچ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہوگی۔"

لوتیکا جلدی سے یہ کہہ کر تاریک سیڑھیوں سے اترنے لگی۔ چاچی سیڑھیوں کے اوپر سینے کا ہاتھ پکڑے دیر تک کھڑی رہیں۔ پھر دروازہ کھلا، روشنی کی ایک پتلی سی لکیر

تڑپی، پھر اندھیرا چھا گیا۔ مُنّے نے کہا "چاچی چلو۔ مجھے مہاکوی کے ننھے چاند کے گیت سُناؤ۔"

چاچی اب سب کچھ بھول گئیں۔ انھیں مہاکوی ٹیگور کے ننھے چاند کے گیت بہت پسند تھے آج اُنھوں نے مُنّے کو وہ گیت سُنایا جب بچہ کھو جاتا ہے اور ماں اُسے ڈھونڈتی ہے، اور اس کا نام لے کر پکارتی ہے، اور بچہ ایک جُوہی کا پھول بن کر اس کی آغوش میں آگرتا ہے۔

گیت گاتے گاتے چاچی کو یاد آیا، کتنے خوبصورت جُوہی کے پھُول تھے۔ ایک ایک کر کے وہ سب برہم پُترا کی لہروں میں کھو گئے اور آخر میں چاچی کی گود خالی رہ گئی۔ سب کچھ مٹ گیا، موتیوں ایسے بیٹے؛ اور موتیوں ایسی دھان کی فصلیں۔ آخر میں صرف برہم پُترا ندی رہی۔ اور زمیندار کی گڑھی...... چاچی گیت گاتے گاتے چپ ہو گئیں۔ اور اُنھوں نے مُنّے کو اُٹھا کر زور سے اپنی باہوں میں بھینچ لیا۔

مُنّے نے مچلتے ہوئے کہا "اوں ہوں! چاچی ایک گیت اور سُناؤ۔"

اور اب کے چاچی نے وہ گیت سُنایا جس میں چاند کی کشتی آسمان کی ندی میں ہولے ہولے بہتی ہے اور بچّہ اس میں بیٹھا ہوا اُسے ہولے ہولے کھیتا جاتا ہے۔

اور مُنّا یہ کشتی کھیتے کھیتے سو گیا۔

رائے بہادر موجد ارلین سے گذر کر لوتیکا اب گھنشام داس بازار میں چل رہی تھی چلتے چلتے لوتیکا کو دو ایک بار ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے اس نے گھوم کر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ شاید یہ اس کے دل کا واہمہ تھا۔ کوئی اس کا پیچھا نہیں کر رہا تھا پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔ لوتیکا نے سوچا شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگ چکی ہے، سنبھل کے

چلنا چاہیئے لوتیکا نے چاروں طرف دیکھا۔ بازار میں لوگ آجا رہے تھے۔ دوکانیں سجی ہوئی تھیں۔ لوگ سودا سلف بھی خرید رہے تھے۔ بسیں اور ٹرامیں بھی گزر رہی تھیں۔ پھر بھی لوتیکا کو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ سارا امن و سکون سطحی ہے، جیسے یہ فضا ایک پتلے باریک فولادی بلیڈ کی سطح کی طرح تنی ہوئی ہے۔ یوں کہ ذرا ہاتھ لگانے سے خون بہہ نکلے گا۔ لوگ باگ چل رہے تھے، کام کر رہے تھے، بوجھ اُٹھا رہے تھے اور کہیں کہیں ہنسی کی آواز بھی سُنائی دیتی تھی۔ پھر بھی لوتیکا کو ایسے جان پڑتا کہ جیسے اس کے سارے پس منظر میں غصہ کی ایک گونج ہے، جیسے کہیں دُور اُفق پر لال لال روشنی نظر آکے گم ہو جاتی ہے۔ جیسے ریت کے کنارے دھیرے دھیرے لہریں آگے بڑھ رہی ہوں اور لوتیکا چوکنی ہو کر آگے پیچھے دیکھنے لگتی۔

کھلونوں کی ایک دوکان پر کھڑے ہو کر اُس نے مُنّے کے لئے ایک باجہ خریدا اور اُسے اپنے ہونٹوں سے لگا کر بجایا۔ دوکاندار نے مسکرا کر کہا "آپ تو یہ بہت اچھا بجا لیتی ہیں" لوتیکا نے ہنس کر باجہ اپنے بٹوے میں رکھ لیا اور دوکاندار کو دام دینے لگی۔ عین اسی وقت اس نے پھر محسوس کیا جیسے کوئی اس کے بہت قریب سے گزر کر نکل گیا ہو۔ اس نے گھوم کر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا۔ سامنے دو آدمی گاندھی ٹوپی پہنے مزے میں باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ پھر بھی لوتیکا محتاط ہو گئی۔ جلسے میں جانے سے پہلے وہ آج اپنے پتی سے ملنا چاہتی تھی جو یہیں کلکتے میں چھپا ہوا تھا۔ مگر اب اس نے ایک دم فیصلہ کیا کہ آج وہ اس سے نہیں ملے گی۔ شاید پولیس پیچھا کر رہی ہو اور کہیں وہ اپنی بے وقوفی سے اپنے پتی کی رہائش کا پتہ پولیس کو دیدے! لوتیکا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے دوکان سے اُتر کر چور نگاہ سے ادھر دیکھا جدھر اس کا پتی چھپا ہوا تھا۔ پھر اس نے مُنھ موڑ لیا اور بو بازار کی بس پکڑ لی۔ فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں تھا اور وہ پیدل ہی

جانا چاہتی تھی۔ مگر اس نے سوچا کہ راستے میں کہیں اس کا دل ڈانواڈول نہ ہو جائے۔ اس نے بس پکڑنے ہی میں خیریت سمجھی۔

بس میں اسے نیلما اور پربھا مل گئیں۔ نیلما بڑی نازک مزاج، نفاست پسند لڑکی تھی۔ وہ بہت امیر نہیں تھی، بہت خوبصورت نہیں تھی۔ بہت پڑھی لکھی نہیں تھی۔ پھر بھی اسے دیکھ کر لوگ ہمیشہ اندازہ لگاتے کہ نیلما بہت خوبصورت ہے، بہت امیر ہے، بہت پڑھی لکھی ہے۔۔ دراصل اس کے مزاج میں سلیقے اور سگھڑاپے کو اتنا دخل تھا کہ وہ اپنے چھوٹے سے گھر میں، اپنی چھوٹی سی تنخواہ میں، اپنے چھوٹے سے علم میں اس طرح زندگی بسر کرتی تھی کہ زندگی اپریل کے ابر کی طرح صاف شفاف اور چمکتی ہوئی نظر آتی۔ نیلما کو اچھی خوشبوؤں کا بڑا شوق تھا کیونکہ ہسپتال میں اُسے اکثر گندی سڑی بدبوؤں سے واسطہ رہتا تھا اور نرس کا کام کرتے کرتے اسے ان بدبوؤں سے چڑ سی بھی ہو گئی تھی اس لئے وہ اکثر شام کو چھٹی کے بعد بڑی تیز خوشبو استعمال کرتی تھی لیکن جب سے اس کا اشتراکی خاوند اپنی انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے جیل میں چلا گیا تھا، نیلما کو خوشبوؤں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ وہ اب بھی اسی طرح صاف ستھری، نفاست پسند لڑکی نظر آتی تھی، اب بھی اس کا گھر آئینے کی طرح چمکتا تھا لیکن اب اس کے بالوں میں خوشبو نہیں تھی۔ اسی لئے تو آج لوتیکا اس کے بالوں کی خوشبو سونگھ کر بہت حیران ہوئی۔

لوتیکا نے پوچھا "کیوں کیا ماجرا ہے؟ پتی مہاشے سے ملنے جا رہی ہو؟"

نیلما مسکرائی۔ "نہیں پگلی، میں تو تیرے ساتھ جلسے میں جا رہی ہوں"

اور پربھا نے اپنے گول گول گال خود ہی تھپتھپاتے ہوئے کہا "رام رام! آج تو جیسے خوشبوؤں کا طوفان اُٹھ رہا ہے، چاروں طرف چنبیلی ہی چنبیلی ہے اور لوتیکا نے بھی تو آج غضب ڈھا رکھا ہے۔ بسنت گھٹائیں باندھ کے آئی ہے اور لال لال گلال چاروں طرف بکھر رہا ہے۔ سکھیو، کیا یہ سب جلسے میں جانے کی تیاری ہے؟ وہاں یہ سُندر تاگے

دکھاؤ گی؟"

اتنا کہہ کر پرتبھا زور سے ہنس پڑی۔ یہ پرتبھا کی خاص عادت تھی کہ خود ہی بات کر کے خود ہی ہنس پڑتی تھی۔ پرتبھا موٹی موٹی گل گلی سی لڑکی تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا بھی اپنی ماں کی طرح موٹا موٹا، گتھلا گتھلا، بھرا پُرا خوش مزاج نظر آتا تھا۔ لیکن پتی مہاشے بڑے تنک مزاج اور گمبھیر تھے۔ پرتبھا اور اس کے پتی کی صفات ان کے لڑکے میں جمع ہو گئی تھیں۔ یعنی لڑکا ماں کی طرح موٹا تازہ تھا اور باپ کی طرح گمبھیر! ذرا سی انگلی دکھانے پر زور زور سے چلانے لگتا۔ پرتبھا آج اپنے پتی اور اپنے بیٹے دونوں کو گھر میں چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ اب اپنی سہیلیوں سے ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی "آج گھر میں خوب لُطف رہے گا۔ یہ دونوں حضرت باری باری سے روئیں گے، اور ایک دوسرے کے اوپر برتن پھینک کر اپنا جی بہلائیں گے!"

نویتکا نے فہمائش کرتے ہوئے اس سے کہا "اس طرح اپنے گھر کو رکھو گی تو کیسے کام چلے گا؟"

پرتبھا بولی۔ "تو کیا کروں سکھی، مجھ سے تو ایک ہی بار دو دو کام نہیں ہوتے آج صبح جلسے کے لئے تقریر تیار کر رہی تھی کہ پتی مہاشے چائے مانگنے لگے۔ چائے دی تو کھانا مانگنے لگے۔ کھانا کھلایا تو ٹائی مانگنے لگے۔ کھوئی ہوئی ٹائی ڈھونڈ کے دی تو اتنے میں لڑکے نے کتے کے مُنھ میں انگلی دے کر ملہار راگ شروع کر دیا۔ میں نے کتے کو دھر کے پیٹا تو پتی مہاشے نے شام کلیان شروع کر دیا۔ اب جب وہاں سے چلی تو دونوں بھیرویں گا رہے تھے۔ اب تم ہی بتاؤ کیا کروں؟"

نیلما نے کہا "بچے کو تو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔"

پرتبھا نے چمک کر کہا "کیسے دکھاؤں؟ کلکتہ میں اچھا ڈاکٹر جتنی فیس لیتا ہے اس سے تو ہمارے گھر بھر کا مہینے کا راشن چلتا ہے۔ تو کیا بی۔ سی رائے کو بلا کے دکھلاؤں؟ تم بھی کیا بورژوا سماج کے لوگوں کی سی باتیں کرتی ہو کبھی کبھی۔ اور پھر یہ تو دیکھو کہ میں کھلاتی کیا ہوں

اپنے بیٹے کو اور اپنے ان کو۔"

اتنا کہہ کر پرتبھا زور سے ہنسی، اور پھر بولی "آج ایک حکیم نے بتایا ہے کہ انھیں مچھلی میں شلجم پکا کے کھلاؤ تو موٹے ہو جائیں گے۔ آج ہی بازار سے شلجم خرید کے لائی ہوں یہ دیکھو۔"

پرتبھا نے اپنے پلّو میں بندھے ہوئے شلجم دکھائے اور نیلما اور لوتیکا بے اختیار مسکرا دیں۔ سچ مچ پرتبھا بڑی بھولی لڑکی تھی۔ اس پر غصّہ آنا بڑا مشکل تھا۔ نیلما نے بڑی محبت سے پرتبھا کے کندھے پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔ اور لوتیکا نے بڑے پیار سے پرتبھا کو کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ لوتیکا بھی پرتبھا کو بہت چاہتی تھی کیونکہ پرتبھا مہلا سنگھ میں بہت اچھا کام کر رہی تھی۔ اور تقریر کرنے میں تو کوئی لڑکی اس سے بازی نہیں لے جا سکتی تھی اور پھر وہ کتنی خوش مزاج لڑکی تھی۔ کتنی انتھک کام کرنے والی۔ کہو تو صبح سے شام تک ایک جگہ کھڑی رہے، کہو تو صبح سے شام تک چلتی رہے۔ دُھن کی پکی۔ اور غرور تو اسے چھو تک نہیں گیا تھا۔ نہ ہی وہ اپنی ساتھی لڑکیوں سے کسی بات میں جلتی تھی۔ کیسے ہی مشکل سے مشکل کام اسے دیئے گئے اس نے ہنس کر پورے کر دیئے۔ پرتبھا کی یہ ہنسی اس کے دل سے پھوٹتی تھی، اور فوارے کے پانی کی طرح چاروں طرف فضا میں پھیل جاتی تھی۔ لوتیکا یوں مسکراتی تھی، جیسے چاند بدلی میں جھلملائے۔ پرتبھا یوں جیسے سمندر کی بہتی ہوئی لہر سارے ساحل پر پھیل جائے۔

لوتیکا نے آہستہ سے پوچھا۔ "آج تو جلسے میں کیا کہے گی؟"

پرتبھا نے بڑی خود اعتمادی سے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ "دیدی دیکھتی جاؤ۔ آج تمھارے سڑے گلے سماج کے بھُس میں وہ چنگاری لگاؤں گی کہ سارا کلکتہ جل اُٹھے گا۔ بس تم اپنی یہ خوبصورت ساری بچا لینا۔"

پرتبھا نے یہ کہہ کر زور سے ہنس کر لوتیکا کی پشت پر ہاتھ مارا۔ اور نازک اندام نیلما اس کی اس حرکت پر اپنی نازک پتلی سی ناک سُکیڑ کے اپنی ناخوشی کا اظہار کر رہی تھی کہ اتنے میں بس بو بازار کے نکڑ پر آکے رک گئی۔ اور یہاں یہ تینوں سہیلیاں اُتر کر انڈین ایسوسی ایشن

ہال کی جانب چل دیں۔ اتنے میں دوسری طرف سے ایک اور بس آکے رُکی، اور اس میں سے ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی نکلی جس کا سجا ہوا جُوڑا، ریشمی ساری کا زرتار لہریہ اور چھم چھماتا ہوا بلاؤز دیکھ کے پرتبھا چلّا اُٹھی "اری اُتپیا.... اُتپیا.... او میری جان اُتپیا! آج تو نے کیا غضب ڈھایا ہے۔ دو بچوں کی ماں ہو کے پھر سے نئی نویلی دُلہن کی طرح سجی ہے!"

اُتپیا گھوش مُسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ سامنے سے ایک موٹر آرہی تھی اس لئے رُک گئی۔ پھر موٹر گذر جانے کے بعد اس نے بڑی ادا سے اپنی زرتار ساڑھی سنبھالی اور سرسراتی ہوئی گویا ہوا کی لہروں پر اُڑتی ہوئی ٹھمکتی ہوئی، وہ سڑک پار کر کے پرتبھا، لوتیکا اور نیلما سے آن ملی۔ اُتپیا گھوش بھی مہیلا سنگھ کی کارکن تھی اور اس کا پتی سول سکریٹریٹ میں نوکر تھا اس لئے وہ ہمیشہ اپنی بیوی کو مہیلا سنگھ میں کام کرنے سے، مزدور عورتوں سے ملنے جلنے اور اشتراکیوں کے جلسے میں جانے سے روکتا تھا اور اُتپیا گھوش ہنس کر اور کبھی لڑجھگڑ کر ٹال دیتی تھی۔ پھر ایک روز مسٹر گھوش بولے "سرکار میرے دونوں بچوں کو نوکری نہیں دیگی اگر تو نہیں مانے گی تو ایک دن میری نوکری بھی اسی طرح چھن جائے گی"۔ اور جب اس پر بھی اُتپیا گھوش نہیں مانی تو اتنے خفا ہوئے اتنے خفا ہوئے.....

لوتیکا نے جب یہ سُنا تو اس کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ بولی "اور تو نے کچھ نہیں کہا! چپکے سے پٹتی رہی؟"

اُتپیا گھوش بولی۔ "میں نے کیا کہا، یہ تو جانے دے اس وقت۔ یہ تو روز روز کی بک بک، جھک جھک ہے، ہوتی رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں، میں سُنتی ہوں"۔

نیلما نے اُتپیا گھوش کی صراحی دار گردن پر ایک لمبی خراش کا نشان دیکھا، اور غصّے میں بولی۔ "جنگلی! دیکھو تو کتنے زور کا ہاتھ مارا ہے!"

اُتپیا نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں، ہاتھ تو اتنے زور کا نہیں پڑا۔ وہ ہاتھ میں سونے کی

انگوٹھی پہنے تھے، اسی سے یہ جگہ چھل گئی۔"

پرتبھا نے پوچھا۔" پھر تو آج کیسے آگئی؟"

اُمیا گھوش نے کہا" دیکھتی نہیں ہو کسی کی شادی میں شریک ہونے کے لئے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ دو روز ہوئے میں نے گھر پر ایک فرضی سہیلی کی شادی کا دعوتی رقعہ منگوا لیا تھا اب کیا پتی دیو سہیلی کی شادی میں شامل ہونے سے بھی روکیں گے؟"

پرتبھا اور اُمیا ایک دوسرے کے بازو میں باز ڈال کر زور زور سے ہنسنے لگیں۔

انڈین ایسوسی ایشن ہال عورتوں سے بھرا پڑا تھا۔ دیواروں پر بڑے بڑے بیز لگے ہوئے تھے، جن پر لکھا تھا۔

سیکورٹی ایکٹ کے قیدیوں کو رہا کر دو، یا ان پر مقدمہ چلاؤ۔

ہڑتالیوں کی مانگیں پوری کرو۔

سیاسی قیدیوں کے ساتھ انسانوں کا سلوک کرو۔

سیاسی نظر بندوں کو رہا کرو۔

بی سی رائے کا بنگال ٹیگور کا بنگال نہیں ہے۔

ہم مزدور کسان راج چاہتے ہیں، پولیس راج نہیں چاہتے۔

اُمیا گھوش بولی" اور ایک بیز یہ بھی چاہیئے۔ پولیس راج اور رام راج میں کیا فرق ہے؟ ٹھیک جواب دینے والے کو نوبل پرائز دیا جائے گا۔"

یہ بات سن کر آس پاس کی بہت سی عورتیں ہنس پڑیں۔ لوتیکا نے نظر دوڑا کے چاروں طرف دیکھا۔ آج کامگار عورتیں خاص طور پر اس جلسے میں زیادہ آئی تھیں۔ سارا ہال کھچا کھچ

بھرا ہوا تھا۔ لوتیکا نے گھڑی دیکھی۔ جلسے کی کارروائی اب تک شروع ہو جانی چاہیے تھی۔ لوتیکا اور پربھا کو آتے دیکھ کر اسٹیج پر سے ایک لانبے قد والی بوڑھی مگر پُر وقار عورت اُٹھی اور بے آواز قدموں سے چلتے ہوئے لوتیکا کے پاس آگئی اور سخت لہجے میں کہنے لگی۔

"بہت دیر کر دی!"

لوتیکا معافی مانگنے لگی۔

بوڑھی عورت نے کہا۔ "ہم لوگ تو گھر بھی نہیں گئے، بِل بند ہوتے ہی سیدھے اِدھر آ گئے۔ تمھیں کون سا ملیں جانا تھا؟"

لوتیکا اور پربھا نے پھر معافی چاہی "رضیہ بہن معاف کر دو نا"

رضیہ مسکرائی، بولی "چلو اب جلدی سے شروع کر دو۔ ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا"

رضیہ صدر چُنی گئی۔ لوتیکا نے اشتراکی نظریوں کی مانگوں کو پورا کرنے کا ریزولیوشن پیش کیا اور بڑے بچے تُلے الفاظ میں ایک چھوٹی سی تقریر کی اس کے بعد پربھا گھوش نے تجویز کی حمایت کرتے ہوئے آدھے گھنٹے تک بڑی جوشیلی تقریر کی۔ اور پرستاؤ تالیوں کی گونج میں پاس کیا گیا۔

سب عورتیں کھڑی ہو کر تالیاں بجا رہی تھیں اور نعرے لگا رہی تھیں کہ اتنے میں کسی عورت نے رضیہ کے لئے کاغذ کا ایک پرزہ بھیجا۔ رضیہ نے اس عورت کو اسی وقت اسٹیج پر بلوا لیا۔ یہ ایک زرد رو تپلی دُبلی عورت تھی جس کے گال اندر پچک گئے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور بال اُلجھ اُلجھ کر ہوا میں اُڑے جا رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی اپنے کالے دوپٹے کا پلّو سنبھالتی بھاگتی ہوئی آئی اور دھم سے اسٹیج پر آ گئی۔ کہنے لگی "بہنو، آپ نے یہ پاس کر دیا، یہ تو بڑی اچھی بات کی، پر میں آپ کو ایک بات بتانے یہاں آئی ہوں"

وہ یکایک چپ ہوگئی۔ ہال میں باتیں بند ہوگئیں۔ سب اس عورت کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ بولی، اور اب اس کے لہجے میں گھبراہٹ نہیں تھی۔ "میرا خاوند ایک کامگار ہے۔ وہ جوتے کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ وہ کئی سالوں سے سُرخ ساتھی ہے، کئی ہڑتالوں میں اس نے حصّہ لیا۔ کانگرسیوں کے ساتھ جیل بھی گیا۔ خیر جیل جانا اُس کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، جیسے بھوکے رہنا ہم غریبوں کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے"۔

وہ چپ ہوگئی، لوتیکا کو ایسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا دل پکڑ لیا ہو، سارے ہال میں سنّاٹا تھا۔

وہ عورت پھر بولی۔ "لیکن پہلے اپنے نیتا لوگ سرمایہ دار کے خلاف ہڑتال کرنے کو بُرا نہیں سمجھتے تھے، میں پوچھتی ہوں، وہ اب اسے بُرا کیوں سمجھتے ہیں؟ کچھ لوگ آج کل کہتے ہیں کہ سرمایہ دار بھی آخر ہمارے بھائی ہیں، میں کہتی ہوں تو کیا وہ پہلے ہمارے بھائی نہیں تھے اب کیا ہوا؟"

مجمع میں سے ایک عورت بول اُٹھی۔ "اب وہ ہمارے بھائی نہیں ہیں۔ اب وہ داماد ہیں داماد!"

اس پر سارا ہال ہنسنے لگا اور تالیاں بجنے لگیں۔ رضیہ نے مشکل سے چپ کرایا۔ وہ عورت بڑے غصّے میں آکر کہنے لگی۔ "بھائی ہوں یا داماد، وہ پہلے بھی کارخانے دار تھے ہم پہلے بھی مزدور تھے۔ آج بھی وہ کارخانے دار ہیں، ہم آج بھی مزدور ہیں۔ میرا خاوند پہلے بھی ہڑتال کراتا تھا، وہ آج بھی کرائے گا۔ اسے آج یہ حق کیوں نہیں ملتا ہے؟ آج اُسے جیل میں کیوں ٹھونس دیا گیا ہے؟ اور پھر اس پہ کوئی مقدمہ بھی نہیں چلایا جاتا انگریزوں کے وقت میں اسے دو تین بار سزا ہوئی تھی۔ مگر ہر بار اُسے عدالت نے سزا دی تھی۔ کچھ

موٹوں نے جھوٹے سچے بیان دیئے تھے، وکیلوں میں بحث ہوئی تھی۔ اب کیا ہے؟ نہ وکیل ہیں، نہ گواہ ہیں، نہ مقدمہ ہے، نہ دفعہ ہے، نہ قانون ہے۔ صرف جیل کی سلاخیں ہیں۔"

وہ عورت ایک لمحے کے بعد پھر بولی۔" پچھلے سات دن سے ہمارے گھر راشن نہیں تھا کیونکہ گھر میں اب کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ مجھے دو مہینے سے بار بار بخار آتا تھا اس لئے مل والوں نے مجھے نکال دیا۔ گھر میں جو کچھ تھا وہ تھوڑا تھوڑا کر کے ہم نے بیچ دیا، پھر میرے پاس تھا ہی کیا؟ کل رات کو میرا بیٹا بھوک سے بلک بلک کر مر گیا۔ گھر میں کچھ نہیں تھا۔ کئی دن سے نہیں تھا۔ میں ابھی اپنے بچے کو دفن کر کے آ رہی ہوں، سیدھی یہیں آ رہی ہوں، تاکہ اپنا کالا دوپٹہ اپنی بہنوں کے سامنے پھیلا کے ان سے پوچھ لوں کیا یہ پرستاؤ کافی ہے؟ کیا بس یہی تجویز کافی ہے؟ اگر سچ مچ یہ پرستاؤ کافی ہے تو اس کی ایک نقل مجھے دیدی جائے تاکہ میں اسے اپنے ننھے بیٹے کی قبر پہ لگا دوں!"

ہال کا سناٹا ایک دم ٹوٹ گیا، جیسے کسی نے بند توڑ دیا ہو۔ بہت سی آوازیں ایکدم گونجنے لگیں:۔

"نہیں نہیں!" "یہ کافی نہیں ہے!!" ۔ "ہرگز ہرگز یہ کافی نہیں ہے!!!"

بہت سی عورتیں کھڑے ہو کر چلا رہی تھیں، اتنے میں ایک عورت، ایک نوجوان کا ہنگار عورت، جس نے لہنگا پہن رکھا تھا اور جس کی چُٹیا غصّے کے مارے ایک بپھری ہوئی ناگن کی طرح حرکت کر رہی تھی، دھم سے اسٹیج پہ کود گئی اور بانہیں پھیلا کے بولنے لگی۔ "کافی نہیں ہے تو پھر اُٹھو، آگے بڑھو ..... کلکتے کی شیرنیوں کیا تم اپنے بھائیوں خاوندوں کو یوں جیل میں بھوکا مر جانے دو گی، اُٹھو! ابھی جلوس نکال کے چلو، جیل کی طرف۔ آج ہم ان کی مانگیں پوری کرا کے واپس آئیں گی۔"

"ہاں ہاں! یہ ٹھیک ہے!" بہت سی عورتیں ایک دم نعرہ کرنے لگیں۔ تالیاں بجنے لگیں

جلوس نکالنے کی تجویز سب کو پسند آئی تھی ۔ چاروں طرف شور اور ہنگامہ بپا ہو گیا۔
رضیہ کو بڑا غصہ آیا ۔ اس نے زور سے دو تین بار میز پر ہاتھ مار کے عورتوں کو خاموش
کیا۔

ایک عورت بولی "کامریڈ پریذیڈنٹ"

رضیہ بولی ۔ "تمھاری ایسی تیسی ! چپ رہو ، ورنہ اٹھا کر ہال سے باہر پھینک
دوں گی !"

دوسری بولی " مجھے بھی بولنے کا حق ہے ۔"

رضیہ بولی ۔ " تم کون ہو جی ، مہلا سنگھ کی ممبر ہو ؟"

" نہیں ، میں ممبر نہیں ہوں ۔" وہ عورت بول رہی تھی ۔ اور لوتیکا نے دیکھا کہ
وہ بھورے رنگ کی بڑی قیمتی ریشمی ساڑی پہنے ہوئے ہے ۔ ادھیڑ عمر کی موٹی تازی عورت
ماتھے پر قم قم سج رہا تھا ، باہنوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں ۔ اس عورت نے بڑے تیکھے
لہجے میں کہا ۔ " میں ممبر تو نہیں ہوں ، مگر عام جلسے میں بولنے کا حق مجھے بھی ہے ۔ اور خاص
طور پر اس لئے بھی مجھے اجازت دی جائے کیونکہ میں آپ کی تجویز کی مخالفت کرنا
چاہتی ہوں ۔"

رضیہ نے اٹھ کے کہا ۔ " ایک مہلا اس پرستاؤ کی مخالفت کرنا چاہتی ہیں ۔"

" ہو ! ہو !! " پھر اک دم شور مچا ۔ دوسرے لمحے میں سارا مجمع اس عورت کی
طرف متوجہ ہو گیا ۔ جو گردن بڑھائے اسٹیج کی طرف چلی آرہی تھی ۔

" کیسی مکار لومڑی کی طرح چلتی ہے ،" ایک عورت زیر لب بولی ۔

دوسری نے کہا ۔ " کیسی چکنی چپڑی نظر آتی ہے ۔"

" خاموش ، خاموش ! " رضیہ نے گرج کر کہا ۔ اور وہ دونوں عورتیں سہم
گئیں ۔ اور گردن جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگیں ۔

وہ فربہ اندام عورت اسٹیج پر آ کے کہنے لگی۔ "بہنو، مجھے سیاسی قیدیوں اور اشتراکی نظربندوں کی مانگوں سے پوری پوری ہمدردی ہے (تالیاں) میں اس پرستاؤ کی پوری پوری تائید کرتی ہوں جو اس سلسلہ میں آپ نے منظور کیا ہے (تالیاں) میں چاہتی ہوں کہ کلکتہ کی ہر عورت آج اپنے گھر میں اس پرستاؤ پر بحث کرے، لیکن میں اس جلوس کی تجویز کی مخالفت کرتی ہوں کیونکہ آپ کو معلوم نہیں کہ آج کلکتہ میں دفعہ ۱۴۴ لگی ہوئی ہے۔ قانون توڑ کر ہم قانون کی زد سے بچ نہیں سکتے۔"

"کون بچنا چاہتا ہے؟" ایک آواز ہال کے بالکل پیچھے سے آئی۔

وہ عورت بولی "دیکھئے، ہم عورتیں ہیں۔ ہمیں اپنے گھروں کو دیکھنا ہے۔ اپنے بچوں کو، اپنے رشتہ داروں کو، اپنے شوہروں کو دیکھنا......"

نیلا غصے سے کانپنے لگی۔ وہ اٹھ کے بولی۔ "میرا شوہر جیل میں بھوکا مر رہا ہے!"

ایک کامگار عورت بول اٹھی۔ "یہ سونے کی چوڑیاں اتار کے بات کرو۔"

دوسری نے پوچھا۔ "بلیک مارکیٹ کا سونا ہے کیا۔"

تیسری بولی۔ "اے بہن اس کا پتی ضرور گاندھی ٹوپی پہنتا ہوگا۔"

اس پر بہت سے قہقہے بلند ہوئے۔ اور ایک کالی بھجنگ بڑے بڑے مضبوط ہاتھ پاؤں والی عورت اٹھ کے کہنے لگی۔ "میں آپ بہنوں سے کہتی ہوں کہ میں اس عورت کے پتی مہاشے کو جانتی ہوں۔ وہ گاندھی ٹوپی نہیں، ہیٹ پہنتا ہے ہیٹ!"

"تم کیسے جانتی ہو؟" ایک لڑکی بولی۔

اس کالی عورت نے اپنے دونوں بازو اپنے کولہوں پر رکھ لئے اور آتش ریز ہو کر بولی۔ "اس کا خاوند ہمارے محلے میں رہتا ہے۔ وہ پولیس کا سب انسپکٹر ہے۔ ابھی پچھلے منگل کو اس نے میرے بیٹے کو لال جھنڈے والا سمجھ کر اندر دھر لیا۔"

"ہائیں!" پرتھبا چلائی "یہ پولیس انسپکٹر کی بیوی ہے! اور یہاں سی، آئی، ڈی کا کام

کرنے آئی ہے۔ نکل یہاں سے!" پرتبھا نے انسپکٹر کی بیوی کو گردن سے پکڑ لیا۔

منورما نے طنزاً کہا۔ "جانے دے بہن۔ اس بچاری کو تو سیاسی نظربندوں سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ یہ تو بس جلوس نکالنے کی مخالفت کرتی ہے۔"

"اے ہئے! کیا ہمدردی جتائی ہے کمبخت نے!" ایک بوڑھی عورت بولی جس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے اور جس کا سر ہمیشہ آہستہ آہستہ ہلتا رہتا تھا۔ توتیکا کو اس کے لب و لہجے سے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ شمالی ہند کی رہنے والی ہے۔

اتنے میں مجمع کی بہت سی عورتیں پولیس انسپکٹر کی بیوی کے گرد جمع ہو گئیں، اور قیاس غالب تھا کہ اس کی ٹھکائی بھی ہو جاتی، لیکن اس وقت رضیہ نے بڑی عقلمندی سے کام لیکر سب کو ٹھنڈا کیا اور بیچ بچاؤ کر کے اس عورت کو جلسے سے باہر نکالا جب وہ عورت جلسے سے باہر نکالی جا رہی تھی، تو بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں اس کی ساڑی سے ایک پستول بھی نیچے گر پڑا۔

"اوں ہوں!" امیا گھوش نے پستول اُٹھا کے کہا۔ "کمبخت پورا انتظام کر کے آئی تھی نظربندوں کی حمایت میں!"

امیا گھوش اپنے بٹوے میں پستول اس طرح رکھنے لگی جیسے وہ لپ سٹک ہو، کہ توتیکا نے پستول اس سے چھین کر جاسوس عورت کی طرف پھینک دیا۔ اور بولی "یہ بھی لیتی جا، ورنہ پھر کل کلاں کو اپنے اخباروں میں مشہور کرائے گی کہ سیاسی نظربندوں کی حمایتوں کی تلاشی پر پستول برآمد ہوئے۔"

جب توتیکا اور امیا گھوش انسپکٹر کی بیوی کو جلسے سے نکال کر دور تک پہنچا کے آئیں تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں اپنی ساڑیوں کے پلّو کس کر باندھ رہی ہیں، کچھ عورتیں بیز اُٹھا رہی ہیں۔ رضیہ کے ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ ایک جھنڈا اُس کالی بھجنگ عورت کے ہاتھ میں بھی تھا جس نے پولیس انسپکٹر کی بیوی کو پہچانا تھا۔ کچھ عورتیں ہال کے کونے میں پڑے

ہوئے مٹکے کے پانی سے اپنے پلّو بھگو رہی تھیں۔

نیلما بولی۔" یہ کس لئے؟"

رضیہ نے کہا۔"جب آنسو لانے والی گیس چلے گی تو یہ بھیگا ہوا پلّو آنکھوں پر رکھ لینے سے تکلیف کم ہوتی ہے۔ اور آنکھوں کی جلن بہت کم ہو جاتی ہے۔"

پرتبھا نے پوچھا۔"اور اگر گیس نہ چلی، گولی چلی تو....؟"

اسپا گھوش بولی۔" گولی نہیں چلے گی۔ اگر گولی چلے گی تو میں آگے ہو جاؤں گی۔ اور میرے گہنے پاتے دیکھ کے پولیس والے ضرور یہ سمجھیں گے کہ میں جلوس میں نہیں جا رہی، منورما کے بیاہ کی بارات میں جا رہی ہوں۔ کیوں منورما؟"

"ہٹ پگلی!" منورما نے کہا۔

نیلما کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ بولی "گولی چل تو سکتی ہے۔"

اُسپا بھی سنجیدہ ہو کے کہنے لگی۔"نہیں چل سکتی، یہ ٹیگور کا بنگال ہے، یہاں استریوں پر گولی چلانے کی کس میں ہمت ہے۔"

لوتیکا بولی۔"نیلما سکھی تو کیا کھڑے کھڑے سوچ رہی ہے؟"

نیلما بولی۔"شاید لوتیکا یہ ہماری آخری ملاقات ہے!"

لوتیکا بولی۔"پگلی ہوئی ہے؟ میں تو اتنی آسانی سے مرنے والی نہیں ہوں۔"

شمالی ہند کی رہنے والی بوڑھی عورت دروازے پر کھڑی ہو گئی جہاں سے عورتیں باہر گذر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی ڈبیا تھی جس میں سیندور بھرا تھا وہ رستہ روک کے کہنے لگی، اس کا سر آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔"میری بیٹیو! آؤ میں تمہارے سیندور کا ٹیکہ لگا دوں، یہ ہماری جیت کا سُرخ نشان ہے۔ آج تمہاری جیت ہو گی بیٹیو!"

لوتیکا نے سر جھکا دیا، دوسرے لمحے سُرخ ٹیکہ اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔
جبینوں پر سُرخ ٹیکے چمکنے لگے۔ ہوا میں لال پھندے کھلتے گئے، یکایک پرتبھا نے

انٹرنیشنل شروع کیا۔

انٹرنیشنل گاتی ہوئی عورتیں انڈین ایسوسی ایشن ہال سے نکل کے جلوس کی صورت میں بوؤ بازار میں آگئیں۔ اور چار چار کی قطار باندھ کے کالج سٹریٹ کی طرف بڑھنے لگیں آگے آگے رضیہ تھی، اور وہ کالی بھجنگ عورت، ان کے پیچھے لوتیکا اور نیلما اور پرتبھا اور منورما۔ گیتا سرکار اور اسپا گھوش ان کے پیچھے آرہی تھیں۔ لوتیکا نے ایک نگاہ پیچھے ڈال کے دیکھا جلوس بڑی باقاعدگی اور ترتیب سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور اس کے انقلابی نعرے ہواؤں میں گونج رہے تھے۔ لوتیکا نے دیکھا کہ بازار کی عام فضا میں جیسے بجلی سی سنسنا گئی ہو۔ کچھ لوگوں میں ہراس پھیل گیا اور وہ ادھر اُدھر بھاگنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے عورتوں کی ہمت کی داد دینی شروع کی جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر دفعہ ۱۴۴ کے ہوتے ہوئے جلوس نکال کر بھوک ہڑتالیوں سے اپنی ہمدردی ظاہر کی تھی بہت سے امیر دوکاندار اپنی دوکانیں بند کرنے لگے۔ کچھ راہگیر سڑک چھوڑ کر تنگ گلیوں میں گھستے گئے۔ کچھ جلوس کے ساتھ آتے گئے۔ بوؤ بازار کے اونچے بالاخانوں میں چند عورتیں میک اپ کئے ہنس رہی تھیں۔ ایک ٹرام بجلی کا تار رگڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ لوتیکا چلتے چلتے دیر تک اس بجلی کے تار کو دیکھتی رہی۔ یکایک چوراہے پر اس تار سے ایک شعلہ پیدا ہوگیا، اور وہ کانپ گئی فضا اس وقت بالکل نقلی سی معلوم ہو رہی تھی۔ قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ زبان پر گیت کے جوشیلے مصرعے تھے لیکن ان مصرعوں کے اندر اور باہر جیسے انھیں کاٹتے ہوئے، ان کے آگے پیچھے جھانکتے ہوئے کئی خیال آتے جاتے ایک دوسرے سے ٹکرا کر گڈمڈ ہوتے جا رہے تھے ..... چاچی کے چہرے پر ایک بھورے رنگ کا مسا کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے ...... میں آج اپنے پتی سے کیوں نہیں ملی ...... ٹرام کا تار کیسے بھاگتا جا رہا ہے .... نیلما کی ناک ...... میں آج اپنے پتی سے مل آتی تو اچھا ہوتا .... گولی چل سکتی ہے .... نہیں چل سکتی۔

.... چل سکتی ہے، نہیں چل سکتی .... وہ جیپ آرہی ہے! ـــ اور لوتیکا کے خیال جیپ سے چپک گئے۔ اب اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا۔ سامنے سے جیپ آرہی تھی۔ جیپ کے اوپر لاسلکی کا آلہ لگا ہوا تھا، اور جیپ میں، پولیس بیٹھی ہوئی تھی۔ اور جلوس آگے بڑھ رہا تھا۔ اور سامنے سے جیپ آرہی تھی، اور قریب آتی جارہی تھی اور جیپ میں پولیس کے سپاہی تھے جن کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ اور جیپ آگے بڑھ رہی تھی۔ اور مجمع آگے بڑھ رہا تھا، اور لوتیکا کے سارے خیالات اس کا ذہن، اس کا دل اور دماغ اور حواس سب اس جیپ سے چپک گئے تھے۔ یکایک جیپ مجمع سے کچھ دُور رُک گئی، اور لوتیکا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اور یکایک اسے خیال آیا کہ میں نے آج مُنّے کی نیکر دُھلنے کے لئے نہیں دی۔ اور پھر جیسے اس کے آگے لوتیکا کو کچھ یاد نہ رہا۔ جیسے ذہن پر سے کانچ کی شفاف سطح چھن سے ٹوٹ گئی۔ اور اب وہ اس ٹوٹے ہوئے کانچ کے سوراخ سے باہر دیکھ رہی تھی۔

پولیس نے جلوس کا راستہ روک لیا تھا۔ اور ایک افسر کہہ رہا تھا۔ جلوس آگے نہیں جائے گا۔

لوتیکا کے قدم آپ ہی آپ آگے بڑھ گئے۔

قدم نہیں رُکے۔ جھنڈے نہیں رُکے۔

"شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ جلوس نکالنا خلاف قانون ہے!"

بھوک ہڑتالی لوہے کی سلاخوں کے پیچھے سے جھانک رہے تھے۔ عورتوں کے قدم آگے بڑھ گئے۔

میں حکم دیتا ہوں، یہ جلوس منتشر ہو جائے!"

لوتیکا کو یہ حکم بڑا سطحی سا معلوم ہوا۔ جیسے دُور طاق پر رکھا ہوا کوئی کھلونا بول رہا ہو۔

جلوس آگے بڑھتا گیا، سُرخ سیندور کے ٹیکے قطار اندر قطار۔

منتشر ہو جاؤ! ایک دم!!

ایک دم لوتیکا کے ذہن کے دریچے میں دو آنکھیں چمکنے لگیں، اور موہوم سا چہرہ۔
یہ کس کی آنکھیں تھیں۔ یہ کس کا چہرہ تھا؟ ہاں! یہ اس کے پتی کا چہرہ تھا۔
سیڑھیوں پر منّا کھڑا تھا۔ پتلا پتلا کانچ جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا تھا۔
یکایک لوتیکا کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چنگاری اس کے پیٹ میں گھستی چلی گئی ہے ٹرام کے بجلی کے تار کی طرح، اور وہ کراہ کے نیچے گر پڑی، منّا سیڑھیوں سے نیچے گر پڑا۔
اور پھر اچانک اندھیرا چھا گیا۔ بیچ میں ایک روشنی کی کرن سی تڑپی، آدھا خیال، ایک چوتھائی خیال، دو آنکھیں، ایک چہرہ..... پھر اندھیرا۔

تڑاخ.... تڑاخ.... تڑاخ.....

گولی چل رہی تھی۔

رضیہ نے گرج کر کہا۔ "زمین پر لیٹ جاؤ۔"

گولی سنناتی ہوئی رضیہ کے پاس سے نکل گئی۔ رضیہ زمین پر لیٹ گئی۔

سارا مجمع زمین پر لیٹ گیا۔ بالاخانوں کے دریچے زور زور سے بند ہونے لگے چیخ پکار کی آوازیں آنے لگیں، پھر ایک دم سنّاٹا چھا گیا۔ ہوا میں صرف گولیوں کی آواز سنناتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

نیلما گردن جھکائے زمین کے ساتھ لگی اپنی آنکھوں، ماتھے اور کانوں کو ہاتھوں سے ڈھانپے گلی کے کونے کی طرف گھسٹ رہی تھی، اس کا ہاتھ امیا گھوش کے ہاتھ میں تھا وہ ہاتھ پہلے چل رہا تھا، پھر رک گیا، وہ ہاتھ پہلے گرم تھا، پھر سرد پڑ گیا۔ نیلما نے ہاتھ چھوڑ دیا، کسی کی بارات گذر گئی امیا، نیلما آگے گھسٹنے لگی، آگے جا کے وہ پھسل گئی اور اس کے دونوں ہاتھ کسی کے خون میں تر بتر ہو گئے، نیلما نے ہلکی سی چیخ مار کے دیکھا پر تھا مری پڑی تھی اور اس کے پلّو میں بندھے ہوئے شلجم نکل کر لہو میں بھیگے ہوئے تھے۔ شلجم اور مچھلی کا شوربہ،

پرنبھا تو آج اپنے پتی مہاشے کو کیا کھلائے گی؟ نیلما آگے گھسٹنے لگی۔ ایک گولی زن سے آئی اور کوئی اس کے پیچھے زور سے چیخا، ایک لمحے کی چیخ جہاں زندگی ختم ہوتی ہے اور موت شروع ہوتی ہے۔ یہ گیتا سرکار تھی۔ گولی اس کے بھیجے کو چیر کر پار ہو گئی تھی۔ قریب ہی ایک نوجوان لڑکا مرا پڑا تھا۔ پالش کی ڈبیہ اور بُرش اس کے ہاتھ میں تھا۔ یکایک نیلما کے دانت بجنے لگے اور اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ رضیہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ "کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "تمھیں کہاں چوٹ آئی ہے؟"

نیلما گھبرا کے اُٹھی۔ مجمع چھٹ گیا تھا۔ کچھ لاشیں زمین پر پڑی تھیں، کچھ لوگ کراہ رہے تھے، کئیوں نے نالیوں کے قریب یا دکانوں کے زینوں کے نیچے پناہ لی تھی۔

پولیس والے اب ہٹ کے ذرا دور کھڑے تھے۔ سارے بازار میں سناٹا تھا۔

نیلما نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

رضیہ بولی "اب سب کچھ ہو چکا۔ چلو لوتیکا کے پاس۔"

نیلما نے اپنے آپ کو دیکھا۔ اسے کہیں چوٹ نہیں آئی اس پر وہ بڑی حیران سی ہو گئی۔ رضیہ کی بانہہ سے ایک گولی چھیلتی ہوئی گذر گئی تھی۔

رضیہ اور نیلما لوتیکا کے پاس پہنچیں جو دھیمے دھیمے لہجے میں پڑی کراہ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی منورما اوندھے منہ پڑی تھی۔ اپنے ہاتھ کانوں میں دیئے۔

نیلما نے کہا "اُٹھو منورما، اُٹھو۔ دیکھو لوتیکا کراہ رہی ہے۔ آؤ اسے اُٹھا کے لے چلیں!

رضیہ نے کہا۔ "کسے اُٹھاتی ہو، منورما تو اب نہیں اُٹھے گی، اب تو وہ کسی کی نہیں سُنے گی۔"

نیلما نے آہستہ سے منورما کے ہاتھ اس کے کانوں سے الگ کئے۔ ایک کرن پھول اس کے کان سے الگ ہو کے نیلما کے ہاتھ میں آگیا۔ منورما سچ مچ سو رہی تھی اس کے

سینے میں ایک گہرا شگاف تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں، اس کے ہونٹ خاموش تھے اور
اس کی کنواری چھاتیوں میں کسی نے مامتا کے سوتے خشک کردیئے تھے۔
"ہائے! ہائے!!" لوتیکا آہستہ سے کراہی۔
رضیہ اور نیلما نے چاروں طرف دیکھا، سنّاٹا۔جمود...... اور ہیبتناک خاموشی،
جیسے کائنات نے اپنا سانس روک لیا ہو، اور زمین نے اپنے محور کا طواف چھوڑ دیا ہو۔
جوتوں کی ایک دوکان کے اوپر بالاخانے میں سے ایک بڈھا چینی نیچے جھانک رہا
تھا رضیہ نے اسے نیچے آنے کے لئے اشارہ کیا۔ بڈھے چینی نے غور سے نیچے دیکھا
اس کی دوکان تو بند تھی، وہ اندر سے ہو کے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ بالاخانے سے
سڑک تک آنے کے لئے ایک زینہ ضرور تھا، لیکن یہ زینہ باہر دیوار سے لگا تھا، اور
دیوار ننگی تھی اور پولیس والوں کی زد میں تھی۔ کہیں کوئی پناہ نہ تھی۔
بڈھا چینی زینے سے گھسٹتا گھسٹتا مکڑی کی طرح لگا لگا دیوار ٹٹولتا ٹٹولتا نیچے
اُتر آیا۔ نیچے اُتر کر اس نے جلدی سے دوکان کھولی، اور پھر نیلما اور رضیہ کی مدد سے
وہ لوتیکا کو اُٹھا کر دوکان کے اندر لے آیا۔
سپاہی دُور کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔
بوؤ بازار کے بالاخانوں کے اونچے دریچوں میں عورتیں کھڑکی کھولنے لگیں
مجمع آہستہ آہستہ پھر بیدار ہونے لگا۔ عورتیں فرش خاک سے اُٹھ کے زخمیوں
کی دیکھ بھال کرنے لگیں اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھنے لگیں۔

گیتا سرکار

میں گیتا سرکار ہوں۔ میری عمر اٹھارہ برس کی ہے۔ میرے ماں باپ بہت غریب

ہیں اس لئے مجھے معلوم ہے غریبی کیا ہوتی ہے۔ میں آر جی کار مائیکل کالج میں ایک نرس ہوں۔ مجھے ایک لڑکے سے محبت ہے۔ اس کا نام اجیت بوس ہے۔ وہ اگلے سال ڈاکٹری کا امتحان پاس کرلے گا۔ پھر ہم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔

تڑاخ!

اُمیّا گھوش

میں ہنسنے والی رنگیلی چڑیا ہوں، جو ساون کے بادلوں میں اُڑتی ہے اور آکاش کی نیلی جھیل کے سپنے دیکھتی ہے۔ اور رات کو اپنے چھوٹے سے گھونسلے میں بیٹھ کر اپنے دونوں بچّوں کو دائیں بائیں سُلا کر اپنی باہیں پھیلا کے سو جاتی ہے۔ بچّے کتنے پیارے ہوتے ہیں۔ گھونسلا کتنا آرام دہ ہوتا ہے۔ آج میں اپنے دونوں بچّوں کو ایک عمدہ سی کہانی سناؤں گی اور وہ میرے نرم گرم سینے سے لگے کس طرح اپنی معصوم آنکھیں کھولے میری کہانی سنیں گے اور کہانی سُنتے سُنتے سو جائیں گے۔

تڑاخ!

منورما

میں جلسے سے فارغ ہو کر تمھیں چھ بجے اوڈین سینما کے باہر ملوں گی۔ نہیں، ہم تیرنے والی ننگی عورتوں کی رنگین فلم نہیں دیکھیں گے۔ ہم چارلی چپلن کی فلم دیکھیں گے جو رحم

اور تم رس اور نیکی کا فرشتہ ہے۔ اور اگلے ہفتے جب ہماری شادی ہو جائے گی تو پھر ہم یہی فلم دیکھیں گے، اور اسے دیکھ کر پردوان جائیں گے جہاں تمہارا گھر ہے، جس کے آنگن میں تلسی کا پودا ہے اور سینجارے کا پیڑ ہے۔ وہاں ہم چاندنی راتوں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے گھنٹوں چپ چاپ بیٹھے رہیں گے اور اس آنے والے بچے کا تصور کریں گے جس کی خوشبو میں تلسی کا پودا چمکتا ہے۔ میں جلسے سے فارغ ہو کے چھ بجے تک ضرور اوڈین سینما کے دروازے پر پہنچ جاؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

تڑاخ!

پرتبھا گنگولی

گذر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے۔

یہ ہم دونوں کا بیٹا ہے۔ ہم دونوں غریب ہیں۔ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکے۔ لیکن اس بیٹے کا مستقبل بڑا امیر ہے کیونکہ یہ اس زمانے کا بیٹا ہے جو ہماری امید دل کی کرن ہے۔ وہ لرزتی ہوئی خوشی کی کرن سامنے سے آرہی ہے... گذر بھی جا کہ تیرا انتظار کب سے ہے۔

تڑاخ!

پالش والا

میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میرے باپ کا کوئی نام نہیں ہے۔ میری ماں کا کوئی نام

نہیں ہے میں کلکتہ کی تاریک گلیوں کی پیداوار ہوں۔ میں غریبی اور سرمایہ داری کے آتشک کی اولاد ہوں۔ یہ آتشک آج بھی کلکتہ کی روح کو ایک جونک کی طرح چوس رہی ہے۔ میں بوٹ پالش کرتا ہوں، لوگ چہرے چمکاتے ہیں، میں بوٹ چمکاتا ہوں۔ لوگ چہرے پڑھتے ہیں میں بوٹ پڑھتا ہوں۔ میں ٹھوکروں میں رہتا ہوں۔ فٹ پاتھ پر سوتا ہوں اور ہوٹلوں کا جھوٹا کھانا کھاتا ہوں۔

میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں دراصل یونہی ان لڑکیوں کو بچانے آگیا تھا۔ ورنہ مجھے اس جلوس کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ کیا ہے، کدھر جا رہا ہے، میں بس اتنا جانتا ہوں کہ جب عورت پر گولی چلتی ہے تو مرد سامنے آجاتا ہے، کیونکہ عورت مرد کی ماں ہے، اور ماں کو بچانا ہر بیٹے کا فرض ہے چاہے اس بیٹے کو کوئی ماں اپنا بیٹا کہہ کے نہ پکارے۔

میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں شاید وہ معمولی بے نام شاعر ہوں جو ہر صدی میں ظلم کے خلاف لڑتے ہوئے مارا گیا ہے میں شاید وہ گمنام سپاہی ہوں جو ہر محاذ پر، ہر مورچے پر، ہر میدانِ جنگ میں شہید ہوا ہے۔ میں شاید وہ علمبردار ہوں جس کے فرشتوں کی طرح نیک اور محنتی ہاتھوں میں انقلاب کا پرچم لہراتا ہے۔

میرا کوئی نام نہیں ہے۔ میں شاید یہاں اپنی ماں کو ڈھونڈھنے آیا تھا۔

تڑاخ!

چینی بڈھے کی دوکان میں نیلما نے لوتیکا کا سر اپنی گود میں لیکر پوچھا۔ "اب کیسی ہو لوتیکا؟"

لوتیکا کے چہرے پر چاچی ایسی مسکراہٹ آئی۔ بولی "اچھی ہوں۔ پیٹ میں معمولی سا درد ہے۔"

رضیہ نے کہا۔" ابھی ایمبولنس آتی ہو گی۔ بڈھے چینی نے، خدا اس کا بھلا کرے

ابھی ایمبولنس کے لئے ٹیلیفون کیا ہے۔"

بڈھا چینی اتنے میں دوکان کے اندر سے تھوڑی سی روئی لے آیا۔ بولا" اس

روئی کو پیٹ پر رکھ دو۔"

رضیہ بولی۔" اس سے کیا ہو گا؟"

بڈھا ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔" اس سے کچھ نہیں ہو گا، مگر کیا کروں۔ کیا کروں۔

..... کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

رضیہ بولی۔" چپکے بیٹھے رہو، ایمبولنس آتی ہو گی۔

بڈھا تھوڑی دیر کے لئے چپ رہا۔ پھر کہنے لگا" یہ چیانگ ..... یہ سب اسی

چیانگ کی بدمعاشی ہے۔ میں سب جانتا ہوں۔"

رضیہ نے کہا۔" کیسے باؤلوں کی سی باتیں کر رہے ہو، یہاں کہاں تمہارا چیانگ آ گیا؟"

بڈھا چینی ہاتھ ملتے ہوئے بولا" وہی ہو گا، وہی ہو گا! تم نہیں جانتیں، میں ساری

دنیا میں گھوما ہوں۔ ہر ملک میں چیانگ ہے، چھوٹا چیانگ، پھر اس سے بڑا چیانگ، پھر

اس سے بھی بہت بڑا چیانگ .....، چینی بڈھے نے ہاتھ پھیلا کے بہت بڑے چیانگ

کی جسامت بیان کرتے ہوئے کہا۔" اور یہ سب چیانگ مل کے ہم کو لوٹتے ہیں، ہم پر

گولی چلاتے ہیں۔"

بڈھا چپ ہو گیا۔ لوتیکا ہولے ہولے کراہتی رہی...... کان میں کلاک ٹک

ٹک کرتا رہا۔

بڈھا پھر بولا" ان تمام چیانگوں کو ختم کرنا ہو گا۔ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے

صرف پی پنگ کا راستہ ہے جہاں ہماری فوجیں خوشی کے شادیانے بجاتی ہوئی داخل

ہوئی ہیں۔" یہ کہتے کہتے بڈھے کے مغموم چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پی پنگ کا نام

سن کے لوتیکا کے چہرے پہ ایک عجیب مسکراہٹ سی آئی ۔ بولی "اب کتنی دیر ہے ؟"

رضیہ بولی "آ رہی ہے .... لو وہ آ گئی !"

ایک ایمبولنس دوکان کے سامنے آ کے رُکی ۔ رضیہ نے کہا "لوتیکا تم گھبراؤ نہیں ۔ اب تم بچ جاؤ گی ۔"

لوتیکا نے بڑے اطمینان سے کہا "ہاں، میں جانتی ہوں، میں نہیں مرونگی ۔"

ایمبولنس لوتیکا کو لے کے چلدی ۔

رضیہ نے گرا ہوا جھنڈا اُٹھا لیا ۔ یہ جھنڈا اتنا لال کس لئے تھا، کیوں چمک رہا تھا ۔ اس چمک میں اتنا بھرپور غصہ کیوں تھا ؟ اس کالی بھجنگ عورت نے اُپیا گھوش کی لاش کو اپنے کندھے پہ اُٹھا لیا چار مزدور عورتوں نے اس نوجوان لڑکے کی لاش کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا ۔ باقی لاشیں بھی مجمع نے اٹھا لیں ۔ آہستہ آہستہ جلوس پھر آگے بڑھنے لگا ۔ دوکانیں کھلتی گئیں، لوگ غصے میں باتیں کرنے لگے، جلوس بڑھتا گیا، اور بڑا ہوتا گیا ۔ جھنڈا ہوا میں کھلتا گیا ۔ جیسے کلکتے کی زندانی روح اپنی بیڑیاں کاٹ کے اس جلوس میں شامل ہو رہی ہو ۔ لوگ باگ، دس، بارہ، پندرہ، بیس، سو، ہزار ہزار کی گنتی میں آ کے اس جلوس میں ملتے گئے ۔ اور جوشیلے نعرے، نفرت اور غصے کے بھرے ہوئے نعرے لگاتے گئے ۔ اب کسی کو گولی کا، دفعہ ۱۴۴ کا ڈر نہیں رہا ۔ عورتوں نے شہیدوں کا لہو اپنے ماتھے پہ لگا لیا اور سینہ تان کے آگے بڑھنے لگیں اور پولیس کے سپاہی پیچھے ہٹنے لگے ۔ جلوس آگے بڑھتا گیا ۔ کلکتے کے بازاروں میں، کلکتے کی گلیوں میں، کلکتے کے کوچوں میں ۔ لوگ سینما گھروں سے نکل آئے، کارخانوں میں سے نکل آئے، کلرک طالب علم، دوکاندار، تماشائی، مزدوروں کی رہنمائی میں آگے بڑھتے گئے جلوس آگے بڑھتا گیا

جیل خانے کی طرف۔ اب جنتا باہر نکل آئی تھی، اور ظالم زمین کے نیچے خندقوں میں چھپ گئے تھے

ایمبولنس بھاگی جا رہی تھی۔ اس کا بھونپو زور سے بار بار جھلاہٹ سے چلاتا اور ہر بار لوتیکا کو اس آواز سے اذیت ناک تکلیف ہوتی، یہ شور کس لئے ہے؟ یہ میرے پیٹ میں یکایک ہزاروں گولیاں سی کیوں چلنے لگی ہیں یہ شعلے کیوں رگ، رگ اور نس نس میں بھڑک رہے ہیں یہ کربناک نشتر زنی کیوں ہے، جیسے کوئی جسم کا ہر حصہ گودے ڈالتا ہو، درد کی لہریں پیٹ میں اُٹھتی ہیں، گھومتی ہیں، بھنور، دائرے، آگ کے شعلے، بھونچال، جلتا ہوا لاوا، میرے رام، کیا موت اسی کو کہتے ہیں، جیسے جسم کے ذرّے ذرّے میں چھالے اُبل آئیں۔

ایمبولنس بھاگی جا رہی تھی، اس کی آہنی جالیوں کے باہر زندگی تھی۔ لوتیکا نے حسرت بھری نگاہوں سے باہر جھانکا۔ ایمبولنس ایک پانچ منزلہ عمارت کے سامنے سے گذر رہی تھی لوتیکا نے دیکھا کھڑکیوں میں رنگین پردے لہرا رہے تھے۔ دو لڑکے سگرٹ پیتے ہوئے بالکونی پر جھکے ہوئے ہنس رہے تھے..... ایک درزی گلابی ساٹن کا بلاؤز سی رہا ہے... بوڑھی مائی تھیلے میں راشن لئے جا رہی ہے..... ایک آدمی کوئلے کی بوری اُٹھا رہا ہے..... ماں بچے کو لئے کھڑکی میں کھڑی ہے۔ بچہ ہمکتا ہے اور مسکرا دیتا ہے..... اوپر آسمان گہرا نیلا ہے ـــــ لوتیکا نے آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے اس کے مرتے ہوئے جسم اور روح کو قرار آ گیا اور اس کے دل میں امن اور سکون اور شانتی کے گھنٹے بجنے لگے۔ موت کچھ نہیں ہے، زندگی ہی سب کچھ ہے۔ موت کچھ نہیں ہے۔ بچے کی مسکراہٹ ہی سب کچھ ہے۔ اس ایک لمحے میں لوتیکا نے دُور کھڑکی میں کھڑی ہوئی ماں کی گود سے جیسے بچے کو اپنی گود میں لیا اور اُسے چوم کر اسی لمحے میں اس کی ماں کے حوالے کر دیا۔ زندگی سے موت اور موت سے پھر زندگی کی طرف.....

لوتیکا سین اپنی زندگی کے آخری لمحے میں بھی صبح کے پہلے اُجالے کی طرح مسکرائی۔

مورگ۔

مورگ میں چھ لاشیں پڑی تھیں۔

۱۔ لوتیکا سین

۲۔ اُمیا گھوش

۳۔ پرتبھا گنگولی۔

۴۔ گیتا سرکار۔

۵۔ منورما

۶۔ ایک بے نام لڑکا۔

یہ چھ کی چھ لاشیں مورگ میں ننگی پڑی تھیں، ان کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ اور مورگ کے ملازم، انسان نما چیل اور گدھ جو سڑے ہوئے سماج کے اندر سڑے ہوئے گوشت اور پوست کی تجارت کرتے ہیں، ان لاشوں کے متعلق اپنے مخصوص گندے گھناؤنے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ مذاق کر رہے تھے۔ انھیں اپنی غلیظ تضحیک کا نشانہ بنا رہے تھے۔

"سالی اچھی ہے!"

Discovery of India

"کیسی گول گول اور گل گلی ہے!"

Bardoli

"ذرا اس کا جسم تو دیکھو، ہائے کیا ماسٹر پیس لونڈیا ہے!"

My experiments with Truth

"اس کا گوشت ابھی تک گرم اور نرم ہے!"

Satya Mave Jayate

نیلما نے جواب اپنی نرس کی ڈیوٹی پر واپس آگئی تھی، نگاہ اُوپر اُٹھا کے دیکھا۔ آسمان ننگا تھا، دھرتی ننگی تھی، آفتاب کی کرنیں ننگی تھیں اور سیتا اور ساوتری کے جسم ننگے تھے اور مورگ سے بہت دور کہیں ہزاروں میل پر والڈروف اسٹوریا ہوٹل کے شاندار لاؤنج میں مسز وجے لکشمی پنڈت کہہ رہی تھیں "ہندوستان میں کمیونزم کبھی نہیں آسکتا۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہندوستان کی مرکزی کونسل میں اشتراکیوں کا ایک بھی نمائندہ نہیں ہے" اشتراکیوں کے نمائندے بیشک مرکزی کونسل میں نہیں ہیں، لیکن وہ یہاں کلکتے کی مورگ میں ضرور موجود ہیں، کلکتے کی جیلوں میں قید ہیں، پھانسی کے تختے پر لٹک رہے ہیں۔ والڈروف اسٹوریا ہوٹل کا امریکی فوائر بہت خوبصورت ہے لیکن ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ اب یہ ہوٹل اور یہ کوٹھیاں نہیں کریں گی۔ نیلما نے سوچا آج ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کلکتے کی مورگ میں ہو رہا ہے، کلکتے کی جیلوں میں ہو رہا ہے۔ کلکتے کی سڑکوں پر ہو رہا ہے۔ اس وقت نیلما کا جی چاہا کہ وہ ہزاروں میل دُور بیٹھی ہوئی مسز پنڈت کو پکار پکار کر کہے، آؤ اور دیکھو کہ ہندوستان کی اس کھلی مرکزی اسمبلی میں جو ہندوستان کی سڑکوں، ملوں، چالوں اور آنگنوں میں منعقد ہو رہی ہے اشتراکیوں کا کوئی نمائندہ موجود ہے کہ نہیں!"

نیلما نے ان پانچوں لاشوں کی طرف پھر دیکھا۔

مقدس اور ننگی لاشیں، جیسے اجول جوالا، بھڑکتا ہوا ننگا شعلہ، تخلیق کی تڑپتی ہوئی بجلی! جیسے انقلاب اپنے خون سے ہنس دے اور جلتے ہوئے، سُلگتے ہوئے انگارے پھول بن جائیں!!

بہت دیر تک یہ لاشیں ننگی پڑی رہیں۔

بہت دیر تک مورگ کے بے حس ملازم مذاق کرتے رہے۔

بہت دیر تک نیلما، نیلما عورت اور نیلما اس ہسپتال کی نرس مورگ کے ملازمین سے ان لاشوں کو ڈھک دینے کے لئے کہتی رہی۔

بہت دیر تک وہ لوگ مذاق اُڑاتے رہے، اور مذاق ہی مذاق میں بات کو ٹالتے رہے۔

نیلما، نازک مزاج، نفاست پسند نیلما کا چہرہ یکایک غصّے سے سُرخ ہوگیا۔ اس کی مٹھیاں تن گئیں اور اس نے بے دھڑک دونوں ہاتھوں سے اپنی ساڑی کھول ڈالی، اور اسے ان لاشوں پر ڈال دیا۔

اب وہ سب کے سامنے ننگی کھڑی تھی، لیکن کس میں ہمت تھی جو اس وقت اس سے آنکھ ملا سکے۔ وہ اس وقت شوجی کی تیسری آنکھ تھی۔ جسے دیکھتی بھسم کر ڈالتی ایک ایک کرکے مورگ کے سارے ملازم وہاں سے کھسک گئے۔ پولیس کے سپاہی بھی شرمندہ ہو کے وہاں سے چلے گئے۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف نیلما شہیدوں کی لاشوں پر پہرہ دے رہی تھی۔

اتنے میں کچھ لوگ سفید چادریں لے آئے۔

رات بہت گہری ہو چکی تھی، لیکن آج کلکتہ سویا نہ تھا۔ لوگ گلیوں اور بازاروں میں غصّے اور رنج سے مغلوب ہو کے گھوم رہے تھے۔ کہیں قرار نہ تھا۔ کوئی اس شدید غصّے اور نفرت کے جذبے سے بھاگ کر کہیں پناہ نہ لے سکتا تھا۔ سرمایہ داری کے بڑھتے ہوئے تضاد نے دھوکے اور خود فریبی کے سارے راستے مسدود کر دیئے تھے۔ نیلما تیز تیز قدموں سے گذرتے ہوئے یہ سب کچھ سوچ رہی تھی، اور دیکھ رہی تھی کہ آج کلکتے کے لوگ پاگل ہو کے اپنی بے چین مٹھیوں کو بار بار بھینچتے ہیں، اور انقلابی گیت گاتے ہوئے گلی کوچوں میں عوام کے دشمنوں کو ڈھونڈ رہے ہیں!

چاچی کتنے عرصے سے بالکونی پہ کھڑی برہم پُترا کے چڑھتے ہوئے پانی کو دیکھ رہی تھیں۔

منّا ابھی تک سویا نہ تھا۔ وہ بھی آج بے قرار تھا، بے چین تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ کون سی چیز ہے جو اسے یوں بے چین کر رہی ہے۔ گلیوں اور کوچوں اور بازاروں میں نعرے گونج رہے تھے۔ کبھی کہیں کوئی دھماکا ہوتا اور کبھی کہیں زور کی چیخیں سُنائی دیتیں۔ تیز تیز قدموں سے بھاگنے کی آواز سُنائی دیتی۔ اور پھر نعروں کے طوفان کے بعد یکلخت سنّاٹا سا چھا جاتا۔

ایک ایسے ہی سنّاٹے کے وقفے میں نیلما لوتیکا کے گھر میں داخل ہوئی، چاچی نے سیڑھیوں کی بتّی روشن کی اور نیلما کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کو پڑھ لیا، کیونکہ چاچی نے زندگی میں آنسو ہی بوئے تھے۔ اور آنسو ہی کاٹے تھے۔ اور وہ اس فصل کو اچھی طرح پہچانتی تھیں۔

نیلما چاچی کو الگ لیجا کر کچھ بات کرنے لگی۔ چاچی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ کہنے لگیں "کچھ نہ کہو۔ تمھارے چہرے نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بتاؤ وہ اس وقت ہے کہاں؟"

نیلما نے رندھے ہوئے گلے سے کہا "شہر سے آٹھ دس میل دُور، ایک پُرانے گھاٹ کی چتا میں"

چاچی کی آنکھوں کی مغموم پُتلیاں ایک لحظہ کے لئے زور سے کانپیں، پھر ایک دم ساکت ہوگئیں۔ اُنھوں نے سیڑھیوں کے جنگلے کو زور سے پکڑ لیا۔

مُنّے نے پوچھا۔ "ماں کہاں ہے؟"

نیلما نے کہا۔ "ماں نہیں آئے گی"

منّے نے پوچھا۔ "ماں کیوں نہیں آئے گی؟"

نیلما نے بڑی مشکل سے کہا۔ "ماں بہت دُور چلی گئی ہے"

چاچی روتے روتے بولیں، "کہاں ہو تم دہا کوئی ٹھاکر؟ تم نے ننھا چاند لکھا تھا۔ جس میں بچے کھو جاتے ہیں اور مائیں اُنھیں جوہی کے پھولوں میں تلاش کرتی ہیں۔ آج کلکتے میں مائیں جوہی کے پھول بن گئی ہیں اور ننھے ننھے بچے اُنھیں کلکتے کی گلیوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ کہاں ہو تم دہا کوئی ٹھاکر؟"

مُنّا آہستہ سے چاچی کے پاس چلا گیا۔ "بولا، چاچی تو روتی کیوں ہے، میں جانتا ہوں، ماں کہاں گئی ہیں۔"

"کہاں؟"

"وہ یوجی ہو گئی ہیں۔ جیسے میرے پتاجی یوجی ہو گئے ہیں۔ پھر ایک دن میں بھی بڑا ہو کے یوجی ہو جاؤں گا۔ اور ظلم کے خلاف لڑوں گا۔ رو نہیں چاچی" نیلما نے اپنے بہتے ہوئے آنسو پونچھے بغیر منّے کے ہاتھ میں نوتیکا کا خریدا ہوا باجہ تھما دیا۔

باجے کو دیکھ کے منّے کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اپنی ماں کے مسکراتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا ہو۔ اور جب اس نے باجے کو ہونٹوں سے لگایا تو نیلما کو ایسا معلوم ہوا کہ نوتیکا اپنے ممتا بھرے ہونٹوں سے اپنے پیارے بچے کو چوم رہی ہے۔

باہر طوفان گرج رہا ہے۔

اندر مُنّا باجہ بجا رہا ہے۔

کنھیالال کپور

آزادی کی قسم

میں قسم کھاتا ہوں کہ ——

'باپو' کی قربانی کو کبھی نہیں بھولوں گا لیکن 'باپو' کے بتائے ہوئے اصولوں پر کبھی عمل نہیں کروں گا۔ میں بات بات میں گاندھی جی کی دہائی دوں گا۔ لیکن جب مجھے گاندھی جی کی دُہائی دی جائے گی تو میں اُس کی بالکل پرواہ نہیں کروں گا۔ ایک سچے دیش بھگت کی طرح دیش کا روپیہ اس وقت تک برباد کرتا رہوں گا جب تک کہ دیش کا دیوالہ نہیں پٹ جاتا بوڑھا اندھا یا بہرہ ہو جانے کے بعد چاہے مجھے لاٹھی کے سہارے یا سٹریچر پر سوار ہو کر آنا پڑے میں ریٹائر ہونا پسند نہیں کروں گا اور تب تک گدی سے چمٹا رہوں گا جب تک کہ میرا جنازہ دفتر سے نہیں نکلتا۔ میں تقریروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع کروں گا جو کبھی ختم ہونے کا نام نہ لے گا۔ اپنی ہر تقریر میں وہی بات کہوں گا جو میں نے اُس سے پہلی تقریر میں کہی ہوگی۔ نتیجہ کے طور پر لوگ تنگ آکر میری تقریر سُننا چھوڑ دیں گے۔ جب تک دم میں دم ہے میں کسی نوجوان کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں دوں گا جب تک کہ وہ میرا ترد یکی رشتہ دار نہ ہو۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ——

میں بھول کر بھی ایسا کوئی کام نہیں کروں گا جس سے جنتا کو فائدہ پہنچنے کی امید یا امکان

ہو سکتا ہو۔ مانا کہ اب جنتا کافی سمجھ دار ہو گئی ہے اور اُسے بے وقوف بنانا آسان نہیں۔ پھر بھی میں اُسے بے وقوف بنانے کی کوشش کروں گا۔ جو لوگ میری باتوں میں آنے سے انکار کریں گے انھیں عمر بھر کے لئے جیل خانہ میں بھجوا دوں گا اور قیامت تک یہ نہیں بتاؤں گا کہ انھوں نے کون سا قصور کیا ہے۔ جتنے اسٹاف کی مجھے ضرورت ہوگی اس سے چوگنا رکھوں گا لیکن پھر بھی یہ شکایت کرتا رہوں گا کہ آدمیوں کی کمی کے باعث کوئی کام وقت پر نہیں ہو رہا۔ جنتا کی ہر شکایت کو بڑے غور سے سنوں گا اور سننے کے بعد بھول جاؤں گا کہ وہ شکایت کیا تھی کھانے پینے کی تمام اشیاء پر کنٹرول لگاؤں گا اور اس کے بعد جب وہ چیز بازار سے غائب ہو جائے گی تو اس کا سبب یہ بتاؤں گا کہ راتوں رات ملک کی آبادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ جنتا کو وہ چیز پوری مقدار میں نہیں دلائی جا سکتی۔ خوراک کی کمی پوری کرنے کے لئے ہر شخص سے درخواست کروں گا کہ وہ ہفتہ میں صرف ایک دن کھانا کھایا کرے اور باقی چھ دن پیٹ پر پتھر باندھ کر سو جایا کرے۔ کپڑے کا توڑا اس طرح پورا کروں گا کہ کپڑے کے دام حد سے زیادہ بڑھا دوں گا تاکہ کوئی شخص کپڑا خرید ہی نہ سکے۔ بڑے بڑے پوسٹر لگوا کر جنتا کو سمجھاؤں گا کہ فاقہ کرنا یا ننگا رہنا صحت کے لئے کس قدر ضروری ہے سب سے بڑا کام یہ کروں گا کہ ملک میں تیس کروڑ نئے درخت لگواؤں گا۔ ان سے یہ فائدہ ہو گا کہ اتنی بارش ہوگی کہ نوح کے طوفان کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ فصلیں ——— اگر بیج طوفان میں بہنے سے بچ گئے ——— بوئی جائیں گی اور اتنا اناج پیدا ہو گا کہ جنتا کھا کھا کر بدحواس ہو جائے گی۔

دیش کی دولت بڑھانے کے لئے اپنے ہر ایک دوست کو امپورٹ لائسنس دلاؤں گا جس سے وہ امریکہ سے سستی کتابیں اور مہنگا سامان منگوا کر غیر مناسب داموں پر فروخت کرے۔ اس طرح میرے دوستوں کے پاس بہت سارو پیہ جمع ہو جائے گا اور ملک بہت جلد مالا مال ہو جائے گا۔ غریبوں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر خوش رکھنے

کی کوشش کرتا رہوں گا۔ اگر وہ بغاوت کریں گے تو مذہبی کتابوں کے حوالے دے دے کر سمجھاؤں گا کہ جو غریب اپنا حق مانگتا ہے وہ سیدھا نرک میں جاتا ہے۔ جاگیرداری ختم کر دوں گا مگر جاگیرداروں کو کسانوں سے اتنا روپیہ دلواؤں گا جس سے وہ نئی جاگیریں خرید سکیں۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ـــــــــــ

آزادئ تحریر و تقریر کو بالکل ختم کر کے چھوڑوں گا۔ چاہے مجھے سارا PENAL CODE تبدیل کرنا پڑے یا ORDINANCES کا سہارا لینا پڑے۔ اس نیک کام کے لئے نئے آئین میں تین نئی مدوں کا اضافہ کروں گا۔

(۱) ہر مرد یا عورت کو سمن، وارنٹ اور جرم کے بغیر کسی بھی وقت گرفتار کیا جا سکتا ہے۔

(۲) مجرم کو عدالت میں پیش نہیں کیا جائے گا تاکہ وہ اپنا بے قصور ہونا ثابت ہی نہ کر سکے۔

(۳) مجرم کو ایک بار رہا کر کے پھر گرفتار کیا جائے گا۔ یہ گرفتاری جیل کے دروازے پر عمل میں لائی جائے گی۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ـــــــــــ

اپنی غلطیوں کے لئے میں کبھی خود کو قصوروار نہیں ٹھہراؤں گا۔ زور زور سے چلا کر کہوں گا کہ گاڑیاں اس لئے دیر سے آتی ہیں کیونکہ انجن بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کھانڈ اس لئے نہیں ملتی کہ گنّوں نے زمین سے اُگنا بند کر دیا ہے۔ رشوت بڑھ رہی ہے کیونکہ لوگوں کو رشوت دینے کا چسکا پڑ گیا ہے۔ اناج کا توڑا اس لئے ہے کہ سارا اناج چوہے کھا گئے ہیں۔ اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے لئے چاہے مجھے کتنا ہی جھوٹ بولنا پڑے میں بولوں گا کیونکہ فتح آخر جھوٹ

کی ہوتی ہے۔ اہنسا کے اصول پر اس حد تک عمل کروں گا کہ بجٹ کا صرف ساٹھ فی صدی حصہ جنگ کا سامان خریدنے پر صرف کروں گا۔ سچ مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے مگر سچی بات نہ کبھی خود کہوں گا نہ کسی اور کو کہنے دوں گا۔

شراب نہیں پیوں گا۔ شراب کے بجائے غریبوں کا خون پی پی کر گذارہ کر لوں گا۔

میں قسم کھاتا ہوں کہ ــــــــ

میں یہ سب دلچسپ حرکتیں کروں گا اور ان سے بھی زیادہ دلچسپ حرکتیں کرنے کو تیار رہوں گا۔ اگر سورگ لوک 'باپو' مجھے بُرا بھلا کہیں گے یا میری بے شرمی پر آنسو بہائیں گے تو میں جان بوجھ کر بہرا اور اندھا بن جاؤں گا۔

آزادی کے دن میں عزم کرتا ہوں کہ ــــــــ

میں دیش کو تباہ کر کے دم لوں گا۔ پر ماتما مجھے ہمت اور توفیق دے کہ میں اپنے عزم کو پورا کرسکوں۔

شاھراہ
اکتوبر ۱۹۵۰ء

مهندر ناتھ

منوہر کا بنگلہ ایسی خوبصورت جگہ پر واقع تھا کہ ہر شخص کا جی چاہتا تھا کہ ایسی جگہ پر بنگلہ خرید لیا جائے۔ اونچے سے ٹیلے پر یہ بنگلہ کھڑا تھا اور اس کے چاروں طرف ناریل کے درخت اپنے بازو پھیلائے جھانک رہے تھے۔ بنگلے کے چاروں طرف سے راستہ ٹیلے سے گزرتا ہوا نیچے ساحل تک جاتا تھا اور ساحل کے آگے پھیلا ہوا سمندر تھا جس کی لہروں کی گونج سے ایک عجیب نشاط اور نکھار کا احساس ہوتا تھا۔ صبح ہوتے ہی منوہر اپنے بنگلے سے نکل کر نیچے سڑک پر دوڑتا ہوا ساحل کے قریب پہونچ جاتا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لیٹ جاتا۔ اکثر سورج نکلتے ہی لڑکیاں اور لڑکے جوان اور ادھیڑ قسم کے اور خوبصورت نہانے والیاں لباسِ غسل پہن کر سمندر میں نہانے لگتے۔ اور منوہر ان سب کو دیکھ کر سمندر میں کود جاتا۔ منوہر کو اپنا گھر پسند تھا۔ اپنی بیوی پسند تھی اور اپنی چھوٹی بچی سے تو اسے انتہائی محبت تھی۔ اور پھر یہ ساحل لانبے لانبے ناریل کے درخت اور پھیلا ہوا سمندر ـــــ زندگی کو اور خوبصورت اور حسین تر بنا دیتا تھا۔ دراصل اسے رہنے سہنے کا طریقہ آگیا تھا۔ اس کا باپ امیر تھا جس کی وجہ سے اسے روپیوں کی کمی کبھی محسوس نہ ہوتی زندگی میں جونہی اس نے ہوش سنبھالا۔ اس نے آگے بڑھنے کی تمنا کی

اسکول اور کالج میں وہ ہمیشہ لڑکوں کا لیڈر بن کر رہتا۔ اس نے ہمیشہ اس بات کا خیال کیا کہ اس کے دوست اس کا چرچا کریں۔ لڑکے اس کی ذہانت کا لوہا مانیں۔ اور لڑکیاں اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے تاکیں۔ ذہین ہونے کے علاوہ وہ خوبصورت بھی تھا۔ گورا چٹا رنگ۔ خدوخال تیکھے۔ لانبا قد اور آواز میں ایک بھاری پن۔ ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے اس کی شخصیت میں ایک جاذبیت سی آ گئی تھی جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ جب باپ امیر ہو، تو بیٹے کو تعلیم حاصل کرنے میں یا یورپ کی سیر کرنے میں زیادہ مغز پچی نہیں کرنا پڑتی۔ زندگی اپنی تمام تر آسائشوں، رس چاؤ کے ساتھ گذر جاتی ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں منوہر نے ایک کامیاب عشق کیا۔ شادی کی اور یورپ کی سیر کر ڈالی۔ جب ہندوستان واپس لوٹا تو زندگی میں قدرے سکون آ گیا تھا۔ یورپ کی ہنگامی زندگی نے ذہن میں ایک توازن سا قائم کر دیا تھا۔ اور جب یہاں آکر منوہر نے اپنی زندگی کا آغاز کیا تو وہ زندگی کی خوشیوں سے آشنا ہو چکا تھا۔ تھوڑی بہت زندگی دیکھ لی تھی۔ عشق کر لیا تھا۔ شراب پی لی تھی۔ بال روم میں ڈانس کر لئے تھے۔ عشق کے نشیب و فراز سے کافی واقفیت حاصل ہو گئی تھی۔ زندگی کے پینتیس سالوں میں بہت کچھ دیکھ لیا تھا۔ لیکن آگے بڑھنے کی تمنا ابھی تک سینے میں سلگ رہی تھی۔ دنیا میں غربت کیوں ہے؟ "دنیا میں غربت کیوں ہے؟" ایشیا کیوں غلام ہے؟ اینگلو امریکی طاقتیں کس طرح اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے چالیں چلتی ہیں؟ زندگی کا نیا راستہ کون سا ہے؟ ترقی پسند طاقتیں کیا ہوتی ہیں؟ جدلیاتی مادیت کسے کہتے ہیں؟ اور اس قسم کی تمام باتوں کو وہ سن چکا تھا۔ پڑھ چکا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ لوگ اس کے متعلق باتیں کرتے رہیں۔ اس کا چرچا ہوتا رہے۔ اس کا نام اخباروں میں چھپتا رہے۔ روپے وہ کما لیتا تھا۔ روزی کی اتنی فکر نہ تھی۔ چونکہ شروع ہی سے ذہانت کا لیبل دماغ پر چسپاں تھا۔ اس لئے اس کا بوجھ ابھی تک دماغ پر موجود تھا۔ اس شہر میں آتے ہی اس نے مزدوروں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ جس زندگی کو وہ دیکھ کر آیا تھا اس سے اگر

وہ بیزار نہ تھا تو کم از کم اُسے وہ زندگی پسند بھی نہ تھی۔ اسے اب محسوس ہو رہا تھا جیسے اس زندگی میں کچھ نہ رہا تھا۔ اب کسی اور چیز کی ضرورت تھی۔ اور منوہر ابھی تک جوان تھا۔ ابھی تک آگے بڑھنے کی تمنا تھی اور دل میں زندگی سنوارنے کی آرزو تھی۔

وہ اکثر گھر سے چلا آتا اور مزدوروں کے ساتھ مل کر باتیں کرتا۔ گو اس دوران میں اُس نے اپنے کپڑوں اور رہنے سہنے میں کافی تبدیلیاں کر لی تھیں۔ مثلاً اس کی قمیص کا کالر اکثر پھٹا رہتا تھا۔ اکثر ڈھیلی ڈھالی پتلون پہنتا تھا۔ بالوں میں زیادہ تیل نہ لگاتا تھا اور جہاں کوئی مزدور مل جاتا اس کے ساتھ بیٹھ کر دہ باتیں کرنے لگتا چنے کھاتا۔ ایرانی کی دوکان پر جا کر سنگل چائے پیتا۔ پیسے اگر جیب میں ہوں بھی جب بھی وہ تھرڈ میں سفر کرتا۔ گو گاڑی سے اُتر کر اکثر اسے ٹیکسی پر جانا پڑتا لیکن لوگوں کے سامنے وہ ہمیشہ ان کا ہی ہو کر رہتا۔ اسے قیمتی اور اچھے سگریٹ پینے کا شوق تھا لیکن اس شوق کو بھی اس نے ترک کر دیا تھا۔ جس قسم کا سگریٹ ملتا وہ پی لیتا۔ حتیٰ کہ وہ بیڑی پینے سے بھی گریز نہ کرتا۔ ان ہی باتوں کی وجہ سے وہ کافی پاپولر سا ہو گیا تھا۔ اکثر وہ اپنا وقت گندی اور بدبودار چالوں میں گذارتا۔ ایک کمرے میں بیس آدمیوں کو سوتے دیکھتا۔ غربت، بے کاری اور بیماری، یہ چیزیں تو چالوں میں عام نظر آتی تھیں۔ اور جب ان چالوں سے گذرتا ہوا وہ گھر واپس جاتا تو اُسے ایک عجیب قسم کا احساس ہوتا۔ اسے یہ آسمان عجیب سا لگتا۔ یہ درخت، یہ ریت، یہ سمندر اور یہ ساحل، ان سب میں ایک کشش سی محسوس ہوتی اور کبھی کبھی وہ سوچتا کہ اگر سب انسانوں کو یہ چیزیں مل جائیں تو زندگی کتنی خوشگوار اور خوبصورت ہو جائے۔ اس لئے وہ دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ اپنے من کو مار کر، اپنی آسائشوں کو چھوڑ کر وہ انقلابی پرچم بلند کر رہا تھا۔ اس کی بیوی اسے لعنت ملامت کرتی کہ اسے گھر کا دھیان نہیں رہا۔ بیوی بچوں سے اسے کوئی محبت نہیں۔ کھانے پینے سے اسے خاص دلچسپی نہیں۔ اچھے کپڑے پہننے کا اسے شوق نہیں۔ تو وہ جواب دیتا۔ ساری عمر یہی کچھ کرتا رہا ہے۔ اس نے سوٹ پہن کر دیکھ لیا، ٹائی لگا کر دیکھ لی۔ لیکن تسکین نہ

ملی۔ زندگی میں کچھ اور چاہیئے۔ کچھ اور۔ میڈم۔ انقلاب۔ واقعی انقلاب، تم نہیں جانتیں تم انقلاب کی اہمیت نہیں جانتیں۔" وہ واقعی جدوجہد کر رہا تھا۔ انقلاب لانے کے لئے تھوڑے عرصے میں لوگ اس سے مانوس ہو گئے۔ ساتھیوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ اس کے خلوص اور دیانتداری کی واہ واہ ہونے لگی۔ ساتھیوں میں عزت اور وقار بڑھ گیا اور مزدور اسے چاہنے لگے۔ اپنا سمجھنے لگے۔

اب وہ مزدوروں کے جلوس میں تقریریں بھی کرنے لگا۔ شروع میں وہ کچھ ہچکچاتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ تقریر کرنے کا انداز آگیا اور ایک جلسے میں اتنی زوردار تقریر کی کہ ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ اس کی بیوی اور اس کی بچی دونوں کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے اور حیرت کی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔ اور لوگ تالیاں پیٹ رہے تھے اور منوہر خوش تھا۔ اس سے پہلے لوگوں نے اسے اتنا کبھی پسند نہ کیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ایک لیڈر بن گیا تھا۔ ایک گروہ کا لیڈر۔ اور زندگی آرام و سکون سے گذر رہی تھی۔ منوہر کے پاس گھر تھا۔ بیوی تھی۔ اور اب تو وہ مزدوروں اور کسانوں کا لیڈر بن چکا تھا۔ اچانک! ایک عجیب و غریب بات ہو گئی۔ ہندوستان کی تقسیم ہو گئی۔ گورے چلے گئے، حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آگئی اور حکومت کرنے والوں نے گولی اور بارود کا جنتا پر اچھا استعمال کیا۔ جس شخص نے سر اُٹھایا، اُسے کچلنا چاہا۔ منوہر کو اس بات کا خیال تک نہ تھا کہ اپنی دیسی حکومت اس قسم کا رویہ اختیار کرے گی۔ تھوڑے عرصے میں حکومت نے مزدوروں کے جلسوں پہ پابندی لگا دی۔ اور منوہر کے بہت سے ساتھیوں کو قید کر لیا۔ یہ سب کچھ ایک وار میں ہو گیا۔ منوہر اس تبدیلی کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کا ذہن اس جھٹکے کے لئے تیار نہ تھا یہ سب کچھ ایک وار میں ہو گیا تھا۔ وہ اب پیچھے نہ ہٹ سکتا تھا۔ وہ اب ایک گروپ کا لیڈر بن چکا تھا۔ اور اس دوران میں اپنے کمزور ساتھیوں پر پھبتیاں کس چکا تھا اور ان کی بورژوا زندگی پر لعنت ملامت کر چکا تھا۔ اب وہ پیچھے کس طرح ہٹے۔ اپنے کئے کرائے پہ

کس طرح پانی پھیر دے۔ ہر روز گرفتاریاں ہو رہی تھیں۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ بھوک بیکاری بڑھ رہی تھی۔ شہری آزادی کو ختم کیا جا رہا تھا۔ مزدور طبقہ آگے بڑھ رہا تھا۔ لڑ رہا تھا۔ اب وہ کیا کرے۔ ذہن میں ایک عجیب کش مکش تھی۔ گو اسے اس بات کا ثبوت مل چکا تھا کہ یہ آزادی محض ایک ڈھکوسلہ ہے، اس آزادی سے مزدوروں اور کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا، متوسط طبقے کی حالت دن بدن خراب ہو رہی تھی، اور لوگ جنتا کی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے۔ لیکن وہ جھنجھٹ میں پھنس گیا تھا۔ ایک بیکار سی سوچ اس کے ذہن میں گھس گئی تھی۔ اور اسی دوران میں اس کے ساتھیوں نے جیل میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ جب اسے یہ خبر ملی تو اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

ایک دن گذرا۔

دوسرا دن گذرا۔

تیسرا دن گذرا۔

اور ہڑتال اسی طرح رہی۔ ہڑتالی دن بدن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ باہر پریس میں ایک شور و غل مچا ہوا تھا۔ لیکن حکومت ٹس سے مس نہ ہوتی تھی۔ جیسے حکومت نے سوچ لیا تھا کہ اگر یہ لوگ بھوک ہڑتال کرتے کرتے مر بھی جائیں، تو بھی کوئی بات نہیں۔ اس خیال کے احساس سے منوہر کے ذہن کو ایک شدید دھچکا لگا۔ اسے حکومت سے اس رویّہ کی اُمید نہ تھی کہ اُس کے رنگ روپ کے انسان اس بہیمیت اور شقاوت کے شکار ہو جائینگے اسی ذہنی کش مکش میں سات آٹھ دن گذر گئے اور بھوک ہڑتال کرنے والے کمزور ہوتے گئے۔ وہ ان ہڑتالیوں میں سے بہتوں کو جانتا تھا۔ انھیں قریب سے دیکھا تھا۔ ان کے خلوص اور ایثار سے اسے انکار نہ تھا، اس اثناء میں ایک دو کو غش آگیا، کسی کا وزن گھٹنے لگا، کسی کی نبض کمزور ہو گئی، کوئی بستر سے اُٹھنے کے قابل نہ رہا۔ ادھر منوہر اور اس کے ساتھیوں نے ایک میٹنگ بلوائی اور اس بات کا فیصلہ کیا کہ ایک جلوس نکالا جائے

اور بھوک ہڑتالیوں کے حق میں نعرے لگائے جائیں تو پبلک کی توجہ اس نقطے پر مرکوز کی جائے لیکن فیصلہ تو کر لیا گیا بہت سے ساتھیوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ جلوس نکالنے پر گولی چلیگی حکومت سختی سے اس تحریک کو دبانے کی کوشش کرے گی۔

دوسرے دن جلوس نکالا گیا۔ منوہر سب سے آگے تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔ جلوس بہت بڑا نہ تھا لیکن جوش و خروش کافی تھا۔ منوہر آج یہ سوچ کر چلا تھا کہ وہ واپس بچ کر نہ آسکے گا۔ لیکن دل میں ایک موہوم سی امید کی کرن تھی کہ شاید پولیس گولی نہ چلائے عورتیں کافی تعداد میں موجود تھیں اس لئے اسے اور بھی اُمید ہو گئی تھی کہ ہماری سرکار اتنی بے رحم نہیں ہو سکتی کہ وہ نہتی عورتوں اور نہتے مردوں پر گولی چلا دے۔ وہ آگے بڑھ رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔

بھوک ہڑتالیوں کو رہا کر دو۔

بھوک ہڑتالیوں کے مطالبات مان لو۔

ہم بھوک ہڑتالیوں کو کبھی مرنے نہ دیں گے۔

ہم جنتا راج قائم کر کے رہیں گے۔

پولیس راج مُردہ باد۔

اور جلوس آگے بڑھ رہا تھا۔ بازاروں سے گذر رہا تھا۔ لوگ دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس میں شامل نہیں ہو رہے تھے۔

پولیس کی گولی اور لاٹھی چارج کا رعب شہریوں کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا۔ لیکن جلوس بازاروں سے ہوتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور منوہر خوش تھا کہ آج پولیس کہیں نظر نہ آرہی تھی۔ آج پولیس نہیں آئے گی۔ آج گولی نہیں چلائی جائے گی۔ اس لئے اس کے نعروں میں تیزی اور تندی آرہی تھی۔ قافلہ آگے بڑھ رہا تھا کہ یکایک ایک چوراہے پر آکر پولیس نے جلوس کا راستہ روک لیا۔ جلوس ایک جگہ تھم گیا۔ پولیس والے لاٹھیاں لئے ہوئے سامنے کھڑے ہو گئے

اور جلوس کا راستہ روک لیا۔ کسی نے چلا کر کہا۔" راستہ چھوڑ دو ہم آگے بڑھیں گے"۔

"پولیس راج مردہ باد"

عورتوں نے نعرہ لگایا" بھوک ہڑتال زندہ باد۔ مزدور راج زندہ باد"۔

پولیس نے جلوس کو گھیر لیا تھا ——— اور وہ مجمع کو منتشر ہونے کے لئے حکم دے رہی تھی۔

جلوس اپنی جگہ پر کھڑا تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔

پولیس نے مجمع پر لاٹھی برسائی، اور ایک لاٹھی منوہر کے سر پہ پڑی، منوہر غصے سے تمتما اُٹھا۔ اس نے قریب ہی کھڑے ہوئے سپاہی کی بندوق چھین لی اور پھر کندے سے وار کرنے لگا کہ دو تین سپاہیوں نے اسے گھیر لیا۔ اور تین چار لاٹھیاں رسید کیں۔ باقی پولیس کے سپاہیوں نے جلوس میں گولی چلائی۔ ایک ساتھی کو گولی لگی، اور وہ گر گیا۔ کچھ عورتیں زخمی ہوئیں، کچھ پکڑی گئیں۔ اور کچھ لوگ تتر بتر ہو گئے۔ اور باقیوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ جن میں منوہر بھی شامل تھا۔

زندگی میں پہلی بار منوہر گرفتار ہوا تھا۔ پہلی بار پولیس کی لاٹھی کھائی تھی، پہلی بار پولیس سے ٹکر لی تھی۔ پولیس نے ان سب کو لاری میں بٹھایا، اور جیل میں لے گئے، کیونکہ منوہر نے کافی دلیری سے پولیس کا مقابلہ کیا تھا اس لئے اسے کافی چوٹیں آئی تھیں۔ اُسے ایک کوٹھری میں باقیوں سے علیحدہ رکھا گیا۔

منوہر زندگی میں پہلی بار اس کال کوٹھری میں آیا، پہلی بار اس اندھیرے سے دو چار ہوا اس سے پہلے اس قسم کی زندگی نہ دیکھی تھی۔ اس منحوس اندھیرے سے نگاہ نہ ملی تھی۔ یہ عجیب غریب قسم کا اندھیرا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا۔ اوپر نہ آسمان تھا، نہ سامنے سمندر۔ اور نہ ہی ناریل کے درخت، اور نہ ہی سمندر کی ٹھنڈی ریت۔ یہاں، تو کچھ بھی نہ تھا، نہ بیوی کی میٹھی آواز۔ اور نہ اپنی بچی کی توتلی زبان والی باتیں۔ یہاں نہ پلنگ تھا اور نہ ہی نرم گدا از صوفہ

ایک کمرہ تھا اور باہر سلاخیں جھانک رہی تھیں۔ اندھیرا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا گھور رہا تھا۔

ایک دن گذرا۔

دوسرا دن گذرا۔

دوسرا دن پہلے دن سے کم مایوس کن تھا۔ منوہر کو احساس ہو چلا تھا کہ وہ جیل کی سزا کو برداشت کر سکے گا۔ آہستہ آہستہ اُسے یہ جگہ کچھ مانوس سی لگنے لگی۔ لیکن دل میں ایک اور خیال جنم لے رہا تھا۔ آہستہ آہستہ پروان چڑھ رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی گرفتار نہ ہوا تھا، لیکن آج وہ جنتا کے لئے جیل کاٹ رہا تھا۔ اس قربانی سے اس کی نگاہوں میں اپنی عزت بڑھ گئی۔ اب تو غیر بھی اس کی لیڈر شپ کا لوہا مان لیں گے۔ ذہانت، خوبصورتی اور پھر یہ قربانی۔ اور اس عمر میں، یہ تینوں چیزیں کتنی اہم تھیں۔ اور اسی بل بوتے پر اس کی لیڈر شپ کی عمارت کھڑی تھی۔ اسی عرصے میں اُسے اپنی بیوی یاد آئی۔ اپنی بچی کی یاد آئی۔ بیوی سے زیادہ بچی کی یاد آئی۔ اس کی صورت دیکھنے کے لئے وہ بیتاب سا ہو گیا۔ وہ کیا کرتی ہو گی۔ وہ کیا سوچتی ہو گی۔ اس کے دل پر کیا گذرتی ہو گی۔ بڑی خوبصورت اور ننھی سی ہے، پیاری اور گڑیا سی ہے۔ اور اس کی بیوی، وہ تو سمجھدار ہے۔ وہ تو ہر بات کو جانتی ہے کہ ان معاملات میں آدمی قید ہو جاتا ہے اور قید سے وقار بڑھتا ہے، اور وقار سے لیڈر شپ مضبوط ہوتی ہے اور لیڈر شپ سے رعب بڑھتا ہے۔ دراصل اس کی بیوی سیاست سے بالکل بے بہرہ ہے اُسے کچھ پتہ نہیں۔ اسے اپنی لپ سٹک اور خوبصورت پوشاکوں سے محبت ہے، اپنی بچی سے محبت ہے۔ یا پھر گھر کے کام کاج سے۔ بیوی کا نام ذہن میں آتے ہی کچھ نرم جذبات ذہن میں اُبل پڑے۔ آج وہ بیوی کو کچھ زیادہ چاہنے لگا تھا۔ ذہن میں بیوی کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ اور اس کی ننھی موہنی بچی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ پھیلائے، ذہن کے چور دروازوں سے اندر جھانک رہی تھی۔ سوتی ہوئی محبت جاگ رہی تھی۔ آج وہ اکیلا نہ تھا پُرانی یادیں تازہ ہو رہی تھیں۔ نرم اور کومل جذبات۔ محبت اور شفقت۔ سب کچھ اسس

اندھیرے میں صاف عیاں تھا۔ لیکن آنکھوں میں نیند عنقا تھی۔ بہرحال اس نے سونے کی کوشش کی اور کافی جدوجہد کے بعد اسے نیند آہی گئی۔

جب صبح ہوئی تو منوہر کے ساتھی اسے بلا کر لے گئے۔ آج تمام ساتھیوں کی میٹنگ تھی۔ وہ ساتھی، جنھوں نے اکٹھے مل کر جلوس نکالا تھا۔ اور پولیس کی لاٹھیاں کھائی تھیں۔ آج اس جیل میں آئے ہوئے بیس روز ہو چکے تھے اور کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کتنا عرصہ یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ کیونکہ ہماری حکومت جب چاہے کسی کو پکڑ لے، جب چاہے چھوڑ دے۔ یوں تو جمہوری حکومت کہلاتی ہے لیکن طرزِ حکومت آمرانہ ہے۔ اس لئے کسی کو کچھ پتہ نہ تھا کہ رہائی چھ مہینے کے بعد ہوگی یا چھ سال کے بعد۔

آج جب سب ساتھی اکٹھے ہوئے تو چہروں پر ایک عجیب سنجیدگی کا احساس تھا منوہر کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے سوچا کوئی غیر معمولی واقعہ ہونے والا ہے یا ہو گیا ہے۔ سب لوگ اکٹھے بیٹھ گئے۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے کو تاکا۔ دل کا حال ٹٹولنے کی کوشش کی۔

ایک ساتھی نے کھڑے ہو کر کہا "شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ہم سب کو یہاں سے باہر اذیت گاہوں میں بھیجا جا رہا ہے۔ یہ کیمپ راجستان میں بنایا گیا ہے اور حکومت ہمیں زبردستی وہاں بھیجنا چاہتی ہے۔ تاکہ ہم لوگ وہاں سڑ سڑ کر مر جائیں اور ہماری موت کا کسی کو علم نہ ہو۔" چند فقرے کہہ کر وہ ساتھی بیٹھ گیا۔

ایک اور کامریڈ اٹھا۔ اور کہنے لگا "ساتھیو! اگر ہمیں اذیت گاہوں میں بھیج دیا گیا تو ہمارا واپس زندہ آنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو جائے گا۔ ہم لوگ وہیں مر جائیں گے یا مار دیئے جائیں گے۔ اس لئے ہمیں چاہیئے کہ ہم لوگ لڑیں۔ اپنی زندگیوں کے لئے لڑیں اپنی آزادی کے لئے، اپنے آدرش کے لئے۔ اور آج پھر یہاں تہیہ کریں کہ ہماری لاش ہی جیل سے باہر جائے گی۔ ہو سکتا ہے اس لڑائی میں ہمارے بہت سے ساتھی مارے جائیں۔ لیکن حکومت کو دوبارہ اس بات کی جرأت نہ ہوگی کہ وہ کسی قیدی کو اذیت گاہوں میں

بھیج سکے۔"

اس تقریر کے بعد ایک دُبلا پتلا کامریڈ اُٹھا۔ اُس نے سب ساتھیوں پر نگاہ ڈالی۔ ایک، پُروقار نگاہ، وہ نگاہ جس میں اس کے ساتھیوں کی محبت، اتفاق اور قوت برداشت کا احساس تھا، زندگی میں اکٹھے رہنے اور مرنے کی آرزو تھی۔ وہ کہنے لگا۔" یہ لڑائی جو ہم جیل میں شروع کریں گے۔ صرف اس لیے شروع نہیں کی جارہی ہے کہ ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، یا ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اذیت گاہوں میں نہ بھیجا جائے۔ بلکہ ہم ایک اور اہم بات کے لیے لڑائی شروع کرنا چاہتے ہیں۔ ہم میں بہت سے مزدور ساتھیوں کو ہمارے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ بہت سے مزدور ساتھیوں کو بی کلاس ہو گئی ہے۔ اور کئیوں کو اے کلاس۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم سب ساتھیوں کو اے کلاس ملے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے مزدور ساتھی ہم سے الگ رہیں۔ ہم اچھا کھانا کھائیں اور انھیں بُرا کھانا ملے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ جیل کی تمام سہولتیں ہم میں ہر شخص کو پورے طریقے سے ملیں۔ چاہے وہ ساتھی مزدور ہو یا لیڈر ——
ساتھیو! میں چاہتا ہوں کہ آج ہم فیصلہ کریں کہ ہمیں زندگی سے محبت ہے یا موت سے۔ کیونکہ زندگی اور موت کے درمیان کوئی راستہ نہیں ہوتا۔" منوہر ان تقریروں کو خاموشی سے سُن رہا تھا۔ اس کا ذہن ان تقریروں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھا اور کہنے لگا۔" ساتھیو! مسئلہ کافی اہم ہے، اور میں چاہتا ہوں اس مسئلہ پر کافی غور کیا جائے اور جلد اس کے متعلق فیصلہ نہ کیا جائے۔ اگر باقی ساتھی اس بات کے لیے تیار ہوں، تو میں عرض کروں گا کہ کم سے کم آج کی رات ہم لوگوں کو سوچنے کے لیے دی جائے، یہ فیصلہ ہم کل پر چھوڑیں تو زیادہ موزوں بات ہوگی۔" یہ کہہ کر منوہر بیٹھ گیا۔

تھوڑی سی بحث کے بعد یہ طے پایا کہ کل ہی اس بات کا فیصلہ کیا جائے۔

منوہر کو اس بات کی امید نہ تھی کہ حالات یوں پلٹا کھائیں گے۔ اول تو منوہر جیل جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن جیل چلے آنے کے بعد وہ ان حالات سے دوچار ہونے کو کبھی

تیار نہ تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ لڑائی اتنی تیز اور تند ہو جائے گی۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ زندگی اور موت کے درمیان اتنا تھوڑا فاصلہ ہوتا ہے۔ وہ دن بھر سوچتا رہا اور جب رات کے سائے اور گہرے ہونے لگے اور جیل کی چار دیواری پر اندھیرے کے منحوس سائے پڑنے لگے تو وہ گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا۔ اس اندھیرے میں سب کچھ غرق ہو رہا تھا۔ موت یا زندگی وہ واقعی اس صلے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اچانک، اس صورت حالات سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ زندگی یا موت، اتنی جلدی، ابھی تو وہ جوان تھا، ابھی تو اُسے بہت کچھ کرنا تھا، اسی سوچ میں اس نے دیکھا، بلکہ محسوس کیا، آہستہ آہستہ سمندر اس اس قدر دور ہوتا جا رہا ہے، یہ نیلا آسمان، یہ دھوپ، یہ چاندنی، یہ ریت، اور اس کی بیوی اور گرم لحاف اور اس کی خوبصورت بچی، اس کی رُوح، یہ سب اس سے الگ ہوتے جا رہے تھے۔ اور یہ سوچتے سوچتے اسے نازیوں کی اذیت گاہوں کی یاد آگئی۔ جس کی روئداد اُس نے کتابوں میں پڑھی تھی۔

کس طرح وہاں کے سیاسی قیدیوں کو تکلیفیں دی جاتی تھیں، بدن میں سوئیاں گھونپ دی جاتی تھیں، برف کی سلوں پر کھڑا کیا جاتا تھا، ٹانگوں اور ہاتھوں کو مروڑ کر ایک طرف باندھ دیا جاتا تھا، بھوکا اور پیاسا رکھا جاتا تھا، ان کے بچوں اور بیویوں کو ان کے سامنے پیٹا جاتا، دانت توڑ دیئے جاتے تھے، مکّے مار مار کر ادھ موا کر دیا جاتا تھا، اور پھر اُسے وہ واقعہ یاد آگیا، جب اذیت گاہوں میں خوراک کم ہو جاتی تھی تو قیدیوں کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا جاتا تھا کہ اب تمہیں رہا کیا جاتا ہے، آزاد کیا جاتا ہے، اور جب قیدی جیل کی چار دیواری سے نکل کر چند گز کے فاصلے پر جاتا تھا تو پیچھے سے گولی داغ دی جاتی تھی، اور قیدی بس تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔ اور پھر ریگستان میں، چلچلاتی دھوپ میں، جہاں نہ پانی نہ چھاؤں، اور لاش کو چیلیں کھا جاتی تھیں، اور آہستہ آہستہ انسان کا جیتا جاگتا جسم ریت کے ذروں میں تحلیل ہو جاتا تھا۔ اُف! یہ موت کتنی ڈراؤنی اور بھیانک تھی۔

یہ عجیب موت تھی، نہ پانی، نہ نرم گدا، نہ ڈاکٹر، نہ دوائی، نہ بیوی، نہ بچی، نہ دوستوں کی محبّت بھری باتیں، دراصل وہ مرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ مرنا نہ چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ اگر اس جیل میں پولیس والوں سے ٹکر ہوئی تو پولیس والے اس پر رحم نہ کریں گے۔ اس سے پہلے کئی جیلوں میں سیاسی قیدیوں کو پولیس گولی کا نشانہ بنا چکی تھی وہ بچ نہیں سکتا، شاید اذیت گاہ میں وہ بچ جائے۔ شاید۔ لیکن ساری عمر یہیں کاٹنا ہوگی۔ آج دماغ میں عجیب وغریب باتیں آرہی تھیں، وہ کیا جواب دے، وہ کیوں لڑے وہ کس کے لئے لڑے۔ وہ سوچ رہا تھا اور اس کے ذہن میں اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ دراصل منوہر کے ذہن میں آج سے پہلے اس قسم کے سوالات کبھی نہ آئے تھے، وہ ایک ہلکی پھلکی زندگی بسر کر رہا تھا، ایک خوبصورت گھر، ایک بیوی، ایک بچّی اور معقول آمدنی اسے شہرت اور نام کی ضرورت تھی، وہ اس نے حاصل کر لئے اور ان ہی چیزوں کے سہارے اسی شہرت، اسی نمود، کچھ ذہن کی لرزش، کچھ ناکام سا آئیڈل ازم، کچھ انقلاب کا موہوم سا جذبہ؛ کچھ انسانیت کی تڑپ، یہ سب چیزیں مل کر اس سے کام کرا رہی تھیں، لیکن وہ مرنا نہ چاہتا تھا، اور یوں، اس عمر میں، نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہ ہوگا۔ اسے زندگی سے محبت تھی اپنی زندگی سے، اپنی بیوی سے، اپنی بچی، اپنے مکان سے، اپنے آسمان سے، اپنی راحتوں سے، اپنی خوشیوں سے، اپنی دلفریبیوں سے، اپنی خود غرضیوں سے، اپنی اداسیوں سے —— اور پھر ان پھولوں سے، ساحل، نیلا سمندر، شفق، قوسِ قزح سے، وہ کیسے چھوڑ دے۔ کیوں چھوڑ دے۔ وہ مر جائے گا اس عمر میں —— اور اس کے ذہن میں ایک عجیب سی بات آگئی۔ ایک لجلجی سی بات، چھپکلی کی طرح۔ کالی، سیاہ۔ سرمایہ داری کی طرح مکروہ اور بھیانک۔ یہ کہاں سے آئی۔ یہاں تو بالکل اندھیرا تھا، روشنی کی کرن نہ تھی، موت ہی موت تھی، زندگی کا نام ونشان نہ تھا، یہ نرم، کالی، سیاہ جلد جہاں سے پکڑو پھسلتی جاتی ہے، نکلتی جاتی ہے، کہیں نہیں ٹھہرتی، معانی بلیک کیٹ

کی طرح کالی اور غدار کی طرح بے حیا اور چاپلوس بھیانک ۔ لوگ کیا کہیں گے ۔ اس لفظ کے ذہن میں آتے ہی اس نے سوچا، جیسے یکایک کسی نے خنجر اس کے سینے میں پیوست کر دیا ہو، معافی ۔نہیں ۔نہیں ۔ وہ معافی نہ مانگے گا ، وہ مرے گا ، وہ مر جائے گا ، وہ ضرور مر جائے گا ، وہ واقعی مر جائے گا ۔۔ لیکن معافی نہیں مانگے گا ، پیچھے نہیں ہٹے گا ، اسی کشمکش میں رات کٹ گئی ۔

جب صبح ہوئی ۔ تو اسے کمرے کا ماحول کچھ گھٹا گھٹا سا محسوس ہوا ، کچھ عرصہ کے بعد وارڈر نے اطلاع دی ۔ ایک عورت اور ایک بچی آپ سے ملنا چاہتی ہیں اور منوہر نے دیکھا کہ اس کی بیوی اور اس کی بچی اس سے ملنے آئی تھیں ۔ موہنی نے اپنے دونوں ہاتھ سلاخوں کے اندر کر دیئے اور منوہر نے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور انھیں پیار سے چوما اور پھر بیوی کی طرف دیکھا ۔ کافی دنوں کے بعد وہ اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا ، لیلا تو آج بن ٹھن کر آئی تھی ، مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا ، اور ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھا ، اور لبوں پہ سُرخی ۔ آج منوہر کو لیلا نرمی جل پری دکھائی دے رہی تھی ، وہ اسے چھونا چاہتا تھا ، وہ اس سے پوچھنا چاہتا تھا ۔ کیا وہ اسے یاد نہیں آیا ۔ کہ اس کے مُنہ سے اچانک یہ فقرہ نکل گیا ۔

" باہر کیا ہو رہا ہے ۔

" کچھ بھی نہیں "

" کیا لوگ ہماری رہائی کے لئے جدوجہد نہیں کر رہے ہیں ؟ "

وہ کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے سکی ۔ تو کچھ نہیں ہو رہا ہے ۔ شاید کچھ نہ ہوا ۔ اس نے سوچا ۔ وہ یہیں مر جائے گا ۔ اسی جیل میں "

" آپ آج کچھ اُداس دکھائی دیتے ہیں "

" نہیں تو " منوہر نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

کچھ عرصہ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

اتنے میں وارڈر آگیا۔

منوہر نے اپنی بچی کی طرف پیار بھری نگاہوں سے دیکھا۔ شاید وہ آخری بار اپنی بچی اور بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ بیوی نے مڑکر منوہر کی طرف دیکھا۔ اس کی بیوی واقعی خوبصورت تھی۔ آج تو بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔

اور اس کی بچی۔

کتنی حسین اور بھلی دکھائی دے رہی تھی۔

اگر وہ مرگیا،

تو یہ لوگ کیا کریں گے،

بنک میں روپے تو ہیں،

لیکن کب تک چلیں گے۔

لیلا کچھ کام کرے گی۔

وہ مرگیا تو سب لوگ مرجائیں گے۔ بھوک اور فاقوں سے مرجائیں گے۔ اس کی بچی مرجائے گی۔ وہ گھر سے نکال دیئے جائیں گے۔ اس کی بیوی فاقوں سے بلک بلک کر مرجائے گی، وہ سوچ رہا تھا کہ کوئی بات اس کے ذہن میں آجائے، جس کا سہارا لے کر وہ آگے بڑھے۔ وہ مرجائے گا، وہ ماردیا جائے گا، لیکن وہ کیوں مرے۔ ہاں ہاں وہ کیوں مرے۔ مرنے کا یہ وقت نہ تھا، یہ موقع نہ تھا، ٹھیک اُس نے سوچا۔ بالکل ٹھیک اُس نے سوچا، مرنے کا یہ وقت نہ تھا، کسی اور موقع پر، کسی اور وقت، جب انقلاب زیادہ نزدیک آجائے گا، ہاں۔ ہاں۔ مل گیا سہارا۔ اس کی آنکھیں خوشی سے جگمگا اُٹھیں، بالکل اُس شرنارتھی کی طرح جسے اچانک، اپنے وطن جانے کے لئے ٹرین مل جائے۔

کچھ لمحات اسی خوشی میں گذر گئے۔

اور وہ وقت آگیا جب سب ساتھیوں نے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔

گروپ کے لیڈر نے کھڑے ہو کر کہا: "مجھے اُمید ہے کہ آپ سب نے فیصلہ کر لیا ہوگا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کیا آج ہمیں اکٹھے مرنا ہے، یا الگ الگ۔ یہ واقعی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں اس موقع کی نزاکت کو پہچانتا ہوں، لیکن جو کچھ ہمیں کرنا ہے، اسے بھی جانتا ہوں، اور آپ بھی جانتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں میں سے جو جیل میں لڑائی لڑنا نہیں چاہتے وہ ہاتھ اُٹھائیں۔"

اس سوال پر فضا میں ایک بجلی سی کوند گئی۔

گروپ کے لیڈر نے آہستہ آہستہ ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

صرف ایک ہاتھ کھڑا ہوا۔

وہ منوہر کا ہاتھ تھا۔

گروپ کی نگاہیں، منوہر کے چہرے پر گڑ گڑ گئیں، وہ نگاہیں نہ تھیں، آہنی گولیاں تھیں، جو منوہر کے دماغ سے پار ہو رہی تھیں، منوہر اپنی جگہ سے اُٹھا اور کہنے لگا: "ساتھیو! میں اس موقع پر گولی کھانا نہیں چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری شہادت کچھ رنگ نہ لائے گی۔ یہ وقت مرنے کا نہیں ہے۔ جنتا ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ پریس ہمارے خلاف ہے۔ ہم گولی سے بھی اُڑا دیئے جائیں تو باہر کچھ اثر نہ پڑے گا۔ اس لئے کسی اور موقع پر۔ کسی اور وقت۔"

ایک آواز "مرنے کا وقت کون ساہوتا ہے۔"

دوسری آواز "یہ کسی ایک کی موت کا سوال نہیں ہے۔ یہ سب کی موت اور زندگی کا سوال ہے۔"

تیسری آواز "اگر ہم یہ سوچتے رہے کہ یہ وقت مرنے کا نہیں۔ تو نہ جانے مرنے کا وقت کب آئے۔"

چوتھی آواز "میں سمجھتا ہوں کہ یہی وقت لڑنے اور مرنے کا ہے۔ اگر ہم سب سے مرنے

کے لئے کوئی تیار نہ ہو گا تو جد و جہد کس طرح شروع ہو گی۔"

منوہر جو چند الفاظ کہہ کر بیٹھ گیا تھا پھر اٹھا اور کہنے لگا۔ "میں نہایت خلوص سے دوبارہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اس موقع پر گولی کھانا نہیں چاہتا" اور یہ کہہ کر منوہر بیٹھ گیا۔

مجمع پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا، ایک وقفہ کے لئے۔ کم از کم باقی ساتھیوں کو منوہر سے اس بات کی اُمید نہ تھی کہ وہ اس قسم کی بزدلانہ حرکت کرے گا، وہ اس جنگ میں سب سے آگے تھا، وہ نہایت دلیری اور بہادری سے ان واقعات اور حادثات کا مقابلہ کر رہا تھا، اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔ شاید یہ سب کچھ اچانک نہ ہوا تھا۔

دوسرے دن منوہر جیل سے رہا کر دیا گیا، جب منوہر جیل سے باہر آیا۔ تو وہ خوش نہ تھا۔ وہ مسرت جو اس کو محسوس ہونا چاہئے تھی اس کے سینہ میں موجزن نہ تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ اُداس تھا۔ غمگین تھا۔ گو وہ موت کے منہ سے بچ کر آیا تھا لیکن یہاں آ کر اسے راحت محسوس نہ ہو رہی تھی۔ ایک عجیب قسم کی بے حسی سی ذہن میں رینگ رہی تھی، وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا، اپنی صورت کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور جلد جلد جا رہا تھا اپنے گھر کی طرف۔

اِدھر جب مزدوروں کو یہ خبر ملی تو انھوں نے فوراً ایک جلسہ کیا، اور ایک مزدور ساتھی نے اُٹھ کر کہا: "ساتھیو! منوہر کی غداری ہماری تحریک پر ایک سیاہ دھبہ ہے۔ سنا گیا ہے کہ منوہر نے اپنی زندگی بچانے کے لئے یہ عذر پیش کیا کہ یہ وقت مرنے کا نہیں ہے، گولی کھانے کا نہیں ہے، اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ کہ اس دن جلوس میں جس ساتھی کو گولی کا نشانہ بنایا گیا تھا، وہ وقت ہمارے ساتھی کے مرنے کا تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کلکتہ میں جن نہتی عورتوں پر گولی چلائی گئی وہ وقت ان جواں سال عورتوں کے مرنے کا تھا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں، جب آسام میں امن کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اور پولیس نے گولی سے سات آدمیوں

کو ہلاک کر دیا تھا جس میں ہماری بینا بھی شامل تھی۔ وہ وقت ہمارے ساتھیوں کے مرنے کا تھا۔ وہ بینا کے مرنے کا وقت تھا۔

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تلنگانہ میں جن ساتھیوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے یا اُتارا جا چکا ہے وہ وقت ان ساتھیوں کے مرنے کا ہے، مجھے فرانس کے اس شہید اعظم کے الفاظ یاد آتے ہیں، جس نے مرتے وقت چلا کر کہا تھا، میں مر رہا ہوں تاکہ فرانس زندہ رہے، منوہر اپنی بیوی بچوں کے لئے زندہ نہیں ہے بلکہ اپنے لئے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ہم سب کی مائیں ہیں، بہنیں ہیں، بھائی ہیں، لیکن ہم میں سے ہر شخص مرنے کے لئے تیار ہے۔ کیوں بھیگو۔ کیوں رسیا۔ کیوں اختر، ہم اس لئے مرنا چاہتے ہیں تاکہ ہماری مائیں زندہ رہیں، وہ ایک بہتر زندگی بسر کر سکیں، ہمارے بچوں کو دو وقت کھانا مل سکے، وہ اسکول میں پڑھ سکیں ہم ایک اچھے مکان میں رہ سکیں، ہم اس لئے مرنا چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیں ایک بھرپور زندگی بسر کر سکیں تاکہ اس دنیا میں امن اور سکون ؟"

مزدور ساتھی بول رہا تھا، اور لوگ تالیاں پیٹ رہے تھے اور منوہر اپنے گھر کے قریب آگیا تھا۔ وہی اُس کا اپنا خوبصورت گھر، ناریل کے درخت، سمندر اور اس کے بیوی بچے۔ لیکن منوہر کے دل میں ایک عجیب شرمندگی کا احساس تھا۔ وہ گھر کی طرف بڑھتا آرہا تھا۔ لیکن اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی روح کو دفنا کر آرہا ہو۔

محاذ
۱۵ فروری